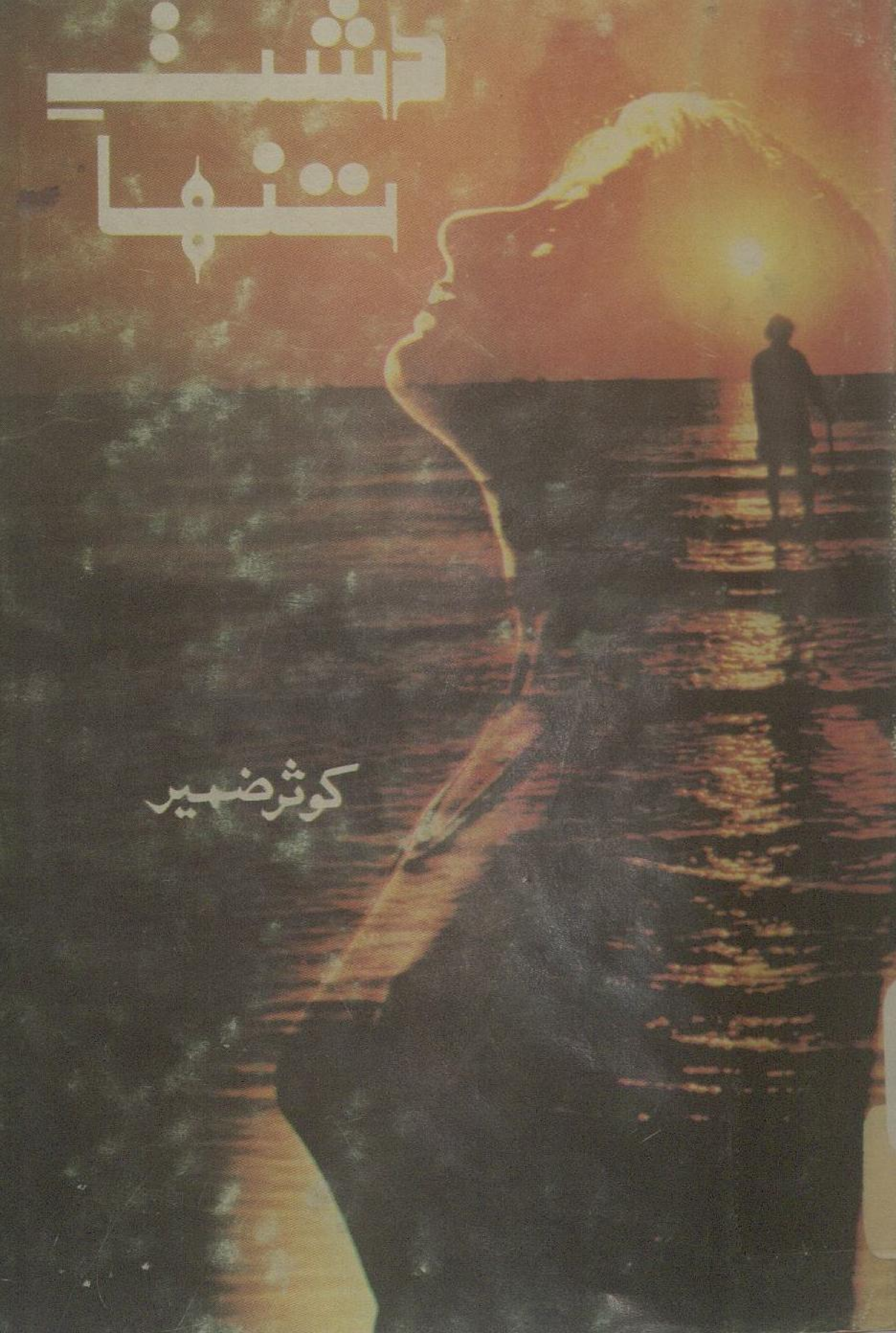

دشت تنہا
کوثر ضمیر

ایک رُومانی ناول

دشتِ تنہا

کوثر ضمیر

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

باہتمام شیخ نیاز احمد پرنٹر،
غلام علی پبلشرز نذ اہسپتال روڈ، لاہور
سے چھپواکر چوک انار کلی، لاہور سے شائع کیا۔

اشاعت اوّل :

قیمت : روپے

مقامِ اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز
اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

ایک ناول جو حقیقتوں
کے تلخ سمندر سے ابھرا۔ جس
کے کرداروں کو غموں کے سمندر
نے اپنے اندر سمو لیا۔

میرے دامن میں موجیں کوثر و تسنیم کی
پھر بھی اک پیاسا سلگتا اونگھتا ساحل ہوں میں

سیاہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

لیکن اس گذرتی ہوئی رات کے ساتھ۔ اس گھر والوں نے رت جگا منایا تھا۔ رات سب نے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔

نیند کسی کے پاس ذرا دیر کو آکر پھٹکی بھی نہ تھی۔

لیکن جسے نیند آرہی تھی۔ وہ سو چکا تھا۔ ابدی نیند۔

اور اس گذرتی رات کے ساتھ۔ اُس کی جدائی کی گھڑی بھی قریب آگئی تھی۔

موت انسان کو زندگیوں سے جدا کر دیتی ہے۔

اور یہ موت جوان سال فرید کو آئی تھی۔

فرید جس کے ابھی دنیا سے رخصت ہونے کے دن نہ تھے۔

اُس کی زندگی میں نئی نئی بہار آئی تھی۔ خوشیاں بکھری تھیں۔ لیکن خزاں کا ایک جھونکا سب کچھ اپنے ساتھ لیتا گیا۔

نہ اُسے فرید کی خوب صورت جوان بیوی پر رحم آیا نہ دو معصوم بچوں پر ترس۔ موت کا بلاوا آگیا اور فرید رخصت ہو گیا۔

موت جو نہ جوانی پر ترس کھاتی ہے۔ نہ خوب صورتی پہ۔ نہ اُسے رشتوں کا احساس ہوتا ہے۔ نہ دلوں کی محبت کا۔

موت تو محبت کی دشمن ہوتی ہے۔

فرید موت کے منہ میں جا چکا تھا۔ یہ حقیقت تھی۔

لیکن کسی دل کو یقین نہ آرہا تھا۔

وہ تو بالکل بھلا چنگا تھا۔ صحت مند تھا۔ کسی بیماری نے اُسے چھوا بھی نہ تھا۔ اُسے تو ہلکا سا زکام بھی نہ تھا۔ وہ چلتا پھرتا ہی ہمیشہ کے لئے دنیا سے چلا گیا تھا۔

وہ تو ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

اتوار تھی۔ ہفتے بھر کی محنت کے بعد اتوار اپنے ساتھ سکون کا احساس لیکر ہے اتوار کو فرید کی بھی چھٹی ہوا کرتی تھی۔

اتوار کا پورا دن مزے میں گھر پہ گذرتا۔

دفتر میں تو صرف کام ہی کام ہوتا تھا۔

لیکن گھر پہ۔ تارا ہوتی۔ نوید ہوتا۔ اس کی بیٹی چاندنی ہوتی۔ ماں ہوتی۔ بھائی ہوتا۔ وہ سب مل جل کر ایک ہی گھر میں ہنسی خوشی رہا کرتے تھے۔

اور پھر اتوار کا دن ہنسی خوشی رخصت ہو جاتا۔

اتوار کو فرید ہفتے بھر کی کوفت ختم کر لیتا تھا۔ فرمائش کر کے اماں سے کھانے پکواتا۔ اماں بیٹے کی محبت میں سرشار ہو کر دن بھر باورچی خانے

میں گھسی رہتیں۔

تارا بھی ان کا ہاتھ بٹاتی ۔ لیکن اماں ان دنوں اپنی چاند سی بہو سے کام نہ کروایا کرتی تھیں۔ ڈیڑھ ماہ پہلے وہ ایک بچی کی ماں بنی تھی۔ تارا دن بھر بچی میں لگی رہتی۔

ننھی منی چاندنی اُسے تنگ بھی بے حد کیا کرتی تھی۔

چاندنی۔ باپ کی بے حد چہیتی تھی۔ فرید کو بیٹی سے بے حد پیار تھا۔ وہ ذرا بھی روتی تو فرید دوسرا کام کرتا تارا کو پکارنے لگتا۔

دیکھو ہماری بیٹی کو مت رونے دیا کرو۔ وہ تارا کو ہدایت کرتا۔

اونہہ بچے تو روتے ہی ہیں۔ میں بھلا اس کے رونے پر کس طرح پابندی لگا سکتی ہوں۔

تارا منہ بسور کر کہتی۔

تارا کو باہر گئے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ اس دن بھی اتوار تھی۔ فرید نے باہر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ ان دنوں موسم بھی بے حد پیارا تھا۔

چلو ساحل سمندر کی سیر کو چلتے ہیں۔ فرید کو ڈوبتے سورج کا نظارہ بے حد پسند تھا۔

دونوں بچوں کو اماں کے سپرد کر کے۔ تارا بھی خوشی خوشی تیار ہونے لگی۔ فرید کی فرمائش پر اُس نے گلابی جوڑا پہنا۔ گلابی سوٹ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

فرید ٹیکسی لے آیا۔

اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ دونوں سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ اتوار کی وجہ سے بے حد رش تھا۔

ہزاروں کی تعداد میں لوگ سیر کرنے آئے تھے۔

بچے خوشی خوشی اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ بہت سے لوگ پانی میں اترے ہوئے تھے۔ کچھ تو تیرتے ہوئے دور تک نکل گئے تھے۔

تیز چلتی ہوا سے تارا کا گلابی دوپٹہ اڑا جا رہا تھا۔ لیکن یہ بھیگی بھیگی ہوا بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ تارا بے حد خوش تھی۔

فرید اور وہ دونوں چلتے ہوئے سمندر کے قریب آ گئے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی تارا کے قدموں تک بہنے لگا۔ دور مچلتی لہریں ساحل پہ آ کر بکھر کر واپس ہو رہی تھیں۔

فرید اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگا۔

لیکن تارا بے حد ڈرپوک تھی۔ اُسے چند قدم چل کر ڈر لگنے لگا۔

تارا کو بڑی بڑی خوفناک لہروں سے ہمیشہ سے خوف آتا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ لہریں مچلتی ڈولتی کسی کو نگلنے کے لئے بھاگتی چلی آ رہی ہوں۔ لیکن فرید کو سمندر میں دور تک جانا بے حد اچھا لگتا تھا۔ وہ اچھا خاصا تیراک تھا۔

کالج اور اسکول کے زمانے میں وہ دوستوں کے ساتھ اکثر سمندر میں نہانے آیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت تارا کو خوف سا لاحق تھا۔ وہ اسے پانی میں دو قدم بھی آگے بڑھنے نہ دے رہی تھی۔

نہ جانے کیوں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ بے چین سا ہوئے جا رہا تھا۔ جی چاہنے لگا کہ بس واپس چلی جائے۔

وہ فرید کا ہاتھ تھام کر اسے سمندر سے دور لے آئی۔ دونوں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اِدھر اُدھر کی باتیں۔ چاندنی اور نوید کی باتیں۔

حالانکہ دونوں بچے ابھی بے حد چھوٹے تھے۔ پھر بھی وہ دونوں ابھی سے ان کے مستقبل کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔ محبت کیا کرتے۔ ایک دوسرے کے خلاف بولتے۔ وہ دونوں ان ہی باتوں میں الجھے ہوئے تھے کہ اچانک سمندر کی طرف سے شور بلند ہوا۔ سب اس کی سمت بھاگتے نظر آئے۔ تارا کا جی سہم گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ فرید بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

شاید کوئی ڈوب رہا تھا۔ اور اچانک فرید بھی لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ تارا اُسے روک بھی نہ سکی۔ اس کی آواز بھی جیسے بند ہو گئی۔ لرزتے کانپتے ہوئے پھر پتھر پر بیٹھ کر دعائیں مانگنے لگی۔ خداوند تو اس ڈوبنے والے کو بچا لے۔

وہ جو بھی ہو گا کسی کے گھر کا چراغ ہو گا۔ کسی کی امیدوں کا مرکز ہو گا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سے آنسو اتر آئے۔

اِدھر اُدھر بکھرے لوگ سب سمندر کے کنارے جمع ہو گئے تھے۔ ایک ہجوم تھا۔ جو کسی کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے تماشے کے طور پر دیکھ رہا تھا۔

چند ایک ہمدرد اور تیراک سمندر میں آگے بڑھے۔ اور پھر ایک اور شور بلند ہوا۔ جو بچانے گئے تھے۔ ان میں سے ایک اور بھی ڈوبنے والے کے ساتھ لہروں میں گم ہو گیا تھا:

"ہائے ہائے"۔ عورتیں رونے لگیں۔ ایک عجیب سا سماں پیدا ہو گیا۔ تارا بے چین ہو کر مجمع میں شامل ہو گئی:

اس کا فرید بھی تو اس مجمع میں شامل تھا۔

لیکن اُسے وہ کہیں نظر نہ آ رہا تھا: فرید۔ فرید۔ فرید۔

وہ اسے مجمع میں تلاش کرنے لگی۔

لوگ افسوس کر رہے تھے۔ اچانک سمندر نے دو جانوں کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ سمندری گارڈ اور تیراک اپنے لباسوں میں آگئے تھے۔ لاشوں کو جلد تلاش کیا جائے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ:

ڈوبنے والے لاش بن گئے۔ تارا سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ لیکن فرید اُسے ڈھونڈے نہ ملا۔

وہ رونے لگی۔ بھاگ کر پھر اس پتھر کے قریب چلی آئی۔ جہاں فرید اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ وہاں بھی نہ تھا۔

پہلے ڈوبنے والے کے لواحقین رو رہے تھے۔ تڑپ رہے تھے۔ وہ تو دو دن کے لئے دوسرے شہر سے سیر و تفریح کی غرض سے آیا تھا کیا خبر تھی اُسے موت نے پیغام بھیجا تھا۔ یہ ساری آوازیں تارا کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

دوسرا بھی کیسا جوان تھا۔ تھا کون وہ ؟ - تارا نے یہ بھی سنا۔
دوسرے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے والا کون تھا؟ - یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا۔ کہیں وہ اس کا فرید نہ ہو۔

یہ اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔ پہلے چپکے چپکے اب زور زور سے۔
وہ آگے بڑھ کر دھندلائی آنکھوں اور لرزتے وجود سے کسی سے مخاطب تھی۔ میرا شوہر میرے ساتھ تھا وہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔
کتنے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔

"اس نے نیلی قمیض اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی کیا" کسی نے پوچھا۔
"ہاں۔ہاں۔ فرید کے کپڑوں کا رنگ بھی تو یہی تھا"
کہاں ہے وہ۔ کہاں ہے وہ۔ وہ اس اجنبی مرد سے التجا کرنے لگی۔ جس کی نظریں اب جھک چکی تھیں۔

وہ اس خوب صورت اور کم سن لڑکی کو کیا بتاتا۔ اس کا سہاگ سمندر کی پیاس کی نذر ہو گیا۔ لیکن اور سب کو پتہ لگ گیا۔
ڈوبنے والا۔ اس لڑکی کا سہاگ تھا۔

جو سفید چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں لئے سب سے اپنے فرید کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

"تمہارے ساتھ اور کون ہے"۔ ایک معمر سی عورت نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ وہی تو میرا سب کچھ تھا۔ اس کے ساتھ کے علاوہ مجھے کسی اور کی کیا ضرورت تھی۔ وہ گم سم سی ہو کر سب کو بتانے لگی۔

"روشن روشن اُجالے۔ اب میلا میلا لبادہ اوڑھ رہے تھے۔ چمکیلا سورج۔ سمندر کی اتھاہ پنہائیوں میں گم ہو رہا تھا۔"

وہی سمندر جس کی وسعت نے دو جوانیوں کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔

"تم کہاں رہتی ہو۔؟ کہاں ہے تمہارا گھر۔؟"۔ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ تھی۔ نہ جانے وہ کس کیفیت میں مبتلا ہو کر سب کی باتوں کے جواب دے رہی تھی۔

اور پھر کوئی ہمدرد اس کو اپنی بڑی سی موٹر میں ڈال کر اس کے گھر کی طرف لے چلا۔ وہ گم صم بیٹھی راستوں کو تکتی رہی۔

روشنیوں کو دیکھتی رہی۔ اس کے احساسات کو اس کے اعصابوں کو نیند آچکی تھی۔ لیکن آنکھیں جاگ رہی تھیں۔

اس کا گھر آگیا۔

اس نے خود گھر کا راستہ بتایا۔ اور پھر وہ گھر کی دہلیز میں جیسے داخل ہوئی۔ فرید کی اماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اے تارا۔ اتنی دیر کہاں لگا دی۔ بچی رو رو کر ہلکان ہو گئی اتنی دیر۔ وہ اور نہ جانے کیا کہتیں۔

لیکن تارا کی حالت دیکھ کر اُن کا منہ کھلا رہ گیا۔ بکھرے بال۔ سفید چہرہ پھٹی پھٹی آنکھیں ننگے پیر۔

اور اس کے پیچھے چند ایک اور اجنبی چہرے۔ "فرید کہاں ہے؟" اماں کے دل کو دھچکا سا لگا۔

فرید کا چھوٹا بھائی۔ نوید کو گلی میں لے کر کھڑا تھا۔ گھر کے دروازے پر موٹر اور چند ایک آدمیوں کو دیکھ کر وہ جلدی سے اس کی طرف آگیا۔

اور پھر آنے والے نے اس کو کتنی منحوس خبر سنائی۔ کہ وحید کے ہوش جاتے رہے۔

لاش کی تلاش کا کام جاری ہے۔ وہ نہ جانے کیا کیا سن رہا تھا۔ اچانک ہی قیامت ٹوٹ پڑی تھی اس گھر پر۔

فرید سہارا تھا۔ ماں کا بھائیوں کا بیوی بچوں کا۔ وحید تو ابھی پڑھ رہا تھا اسے محسوس ہوا جیسے اجالا ہوتے ہوتے بھی۔

ان کے گھر میں تاریکی پھیل چکی ہے۔

وہ سفید فق چہرہ لئے یہ بری خبر اماں کو سنانے اندر آیا۔ تو اماں برابر تارا سے یہ سوال کر رہی تھیں۔

فرید کہاں رہ گیا۔ لیکن شاید تارا بولنا اور سننا دونوں بھول گئی تھی۔

اماں کی گود سے چاندنی کو لے کر اسے سینے سے چمٹا کر وہ اپنے کمرے میں مسہری پر جا بیٹھی۔ وہ اماں کو کیسے اور کس طرح بتاتی۔

کہ وہ ان کے جیتے جاگتے فرید کو موت کے حوالے کر آئی ہے۔ ابھی یہ حقیقت صرف تارا کو معلوم تھی۔

لیکن اچانک وحید نے اندر آکر۔ اماں سے لپٹ کر یہ حقیقت بے نقاب کر دی۔

"اماں۔ اماں"

فرید بھیّا بھی چھوڑ کر چلے گئے .

وہ سمندر میں ڈوب گئے .

ہائیں کیا کہہ رہا ہے تو - اماں نے پل بھر میں اپنا سینہ کوٹ ڈالا . بال نوچ لئے . وہ رونے لگیں .

ان کی آواز سے سچ مچ در و دیوار رونے لگے . گھر پر موت کی سی اداسی آپ ہی آپ چھا گئی .

پل بھر میں محلے بھر میں یہ خبر پھیل گئی . عورتوں سے کمرے بھرنے لگے . مرد صحن میں جمع ہونے لگے . گھر ایک ماتم کدہ بن گیا .

لیکن تارا نہ روئی .

وہ جسے سب میں زیادہ آنسو بہانے چاہیئے تھے . سب سے بلند آواز میں چیخنا چاہیئے تھا -

وہ تو ساکت سی خاموش سی .

گلابی کپڑوں میں ملبوس ہر آنے والی عورت کی صورت کو تک رہی تھی . جو اسے گلے لگا کر منہ بسور بسور کر نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی -

پھر تارا کو کوفت ہونے لگی - وہ وہاں سے اٹھ کر اوپر والے کمرے کی طرف آ گئی -

یہ کونہ اسے پُر سکون سا لگا .

نہ یہاں عورتوں کا ہجوم تھا - اور نہ ان کی باتوں کا شور .

خبر تارا کی ماں کے گھر بھی پہنچی - خبر تھی بھی کیسی روح فرسا. بوڑھے ماں باپ سر سے پیر تک کانپ گئے:

بیٹی کا گھر لبا کر اُسے خوش دیکھ کر وہ اپنا بڑھاپا ہنسی خوشی گذار رہے تھے. لیکن اب اُن کو محسوس ہوا. جیسے وہ لٹ گئے ہوں:

ابا اور لوگوں کے ساتھ سمندر کی طرف چلے گئے. جہاں روشنیوں کے ذریعے سمندر میں لاشوں کو ڈھونڈا جا رہا تھا.

بڑھتے اندھیرے نے کتنے خاندانوں کی خوشیاں اپنے اندر سمولی تھیں. اور تارا کی اماں لرزتی روتی. بیٹی کی اس دہلیز پر پہنچ گئیں.

جہاں تین برس پہلے ان کی بیٹی نے دلہن بن کر قدم رکھا تھا. اور اس دلہن کا سہاگ اب لٹ چکا تھا.

اماں نے تو جانا تھا۔ تارا نے رو رو کر ماتم کر کے پل بھر میں اپنا حال برا کر لیا ہو گا.

وہ بیٹی کو گلے لگانے اسے دلاسہ دینے خود اس کی بربادی پر ماتم کرنے ہی تو آئی تھیں.

لیکن تارا۔

وہ تو بس آنکھیں کھولے۔ چاندنی کو گود میں چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کے گھٹنے پہ سر رکھے نوید بے خبر سو رہا تھا۔

تارا کو تو سکتہ ہو گیا تھا۔

وہ کب سے یوں مجسمہ بنی ہوئی تھی۔ عورتیں اسے رلانے پہ مصر تھیں۔ ہر حربہ آزمایا جا چکا تھا۔

لیکن تارا۔

شاید آنسو اس سمندر کی نذر کر آئی تھی۔ جس نے فرید کو اس کی آنکھوں سے اوجھل کیا تھا۔

وہ رلانے پر بھی نہ روئی۔

پڑوس کی بھابی نے سنگدلی سے اسے ایک دو تھپڑ بھی مار ڈالے۔ کہ تکلیف کے احساس سے شاید وہ رو پڑے۔

لیکن تارا کو پھر بھی رونا نہ آیا۔

رات گزرتی گئی۔ نیند کسی کی آنکھوں میں نہ آئی۔ رات کا سناٹا آج ان کے آنگن میں نہ اترا۔ سسکیاں آہیں۔ ہر طرف گونج رہی تھیں۔ اپنوں کے ساتھ پرائے بھی رو رہے تھے۔

اور پھر آدھی رات کے قریب۔

لوگ فرید کو لے آئے۔ وہ اپنے پیروں پر چل کر گیا تھا۔ دوسروں کے سہارے آیا۔

سمندر کو شاید اس کے وارثوں پر رحم آگیا تھا۔ جو اتنی آسانی سے لہروں نے آدھی رات کے قریب فرید کے بے جان وجود کو ساحل پر لا پٹخا۔

"فرید آگیا۔ فرید آگیا۔ ایک ہلچل سی مچ اٹھی۔ فرید آگیا۔"

تارا کے کانوں نے بھی سنا۔

اس کا ٹھہرا ٹھہرا دل پھر تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ ہاتھ پیروں میں جیسے جان آگئی:

چاندنی کب سے اس کی گود میں سو رہی تھی۔

کب سے اس طرح بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں جمنے سی لگی تھیں۔ لیکن اب فرید آگیا تھا۔ اس کے سواگت کے لئے۔ اسے آگے بڑھنا ہی تھا چاندنی کو پلنگ پر لٹا کر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔

صحن میں۔ جلتی پیلی پیلی روشنی میں۔ چارپائی پر سفید چادر سر سے پیر تک اوڑھے۔ فرید ہی تو تھا۔

وہ بجھی بجھی آنکھوں سے اسے تکنے لگی۔

اور پھر اس کے قریب آگئی۔

آپ کو نیند کس طرح آگئی جبکہ آپ کے انتظار میں میری آنکھیں پتھر بن چکی ہیں۔

وہ عجیب بہکی بہکی باتیں فرید سے کر رہی تھی۔

کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے اتنے ہجوم میں چھوڑ کر۔ اب اتنی دیر میں آئے ہیں۔ جو اس کے دل میں تھا۔

وہ فرید کو سنانا چاہ رہی تھی۔

"بیٹی۔ اس کی اماں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اب یہ نہ بولے گا۔ صبر کر تارا۔ صبر۔"

اماں کے کاندھے پر سر رکھ کر اس نے جلتی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ ڈوبنے سی لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکیاں ناچنے لگیں۔

اور پھر وہ اماں کے سنبھالنے کی کوشش میں زمین پر آ رہی۔ عورتوں میں شور مچ گیا۔

تارا بے ہوش ہو چکی تھی۔

اور جب اسے ہوش آیا۔ تو فرید رخصت کا جوڑا پہن چکا تھا۔

وہ منظر دل ہلا دینے والا تھا۔ اپنے تو غم سے دیوانے بنے ہوئے تھے۔ پرائے بھی آنسو بہا رہے تھے۔ کیسا جوان تھا۔ کتنا ہمدرد اور سب کو چاہنے والا تھا۔

ہر ایک کو فرید کی خوبیاں یاد آ رہی تھیں۔

بھائی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ ماں غم سے نڈھال فرید کا سرہانہ نہ چھوڑتی تھی۔ مسلسل اسے دل کا فسانہ سنائے جا رہی تھی۔

یوں اس طرح جیسے فرید سب کچھ سن رہا ہو۔ جاتے ہوئے فرید پیچھے بھی تو پلٹ کر دیکھ لیا ہوتا۔

ہائے فرید۔ اب ہم کیسے جئیں گے

جیسے قصور موت کا نہیں فرید کا ہو۔

لیکن تارا اب بھی خاموش تھی۔ بند بند آنکھیں ہوش میں آنے کے بعد اس نے کھولیں. تو بھی وہ خشک تھیں۔

سچ مچ تارا کی آنکھ سے اب تک ایک آنسو بھی نہ ٹپکا تھا۔

وہ بھلا کیوں نہیں رو رہی تھی۔ اصولاً تو اسے سب میں زیادہ آنسو بہانے چاہیئے تھے۔ اپنے بھرے بھرے خوب صورت ہاتھوں کی کانچ کی چوڑیاں توڑ دینی چاہیے تھیں۔

کیونکہ دنیا تو صرف اس کی اجڑی تھی. سہاگ اس کا چھنا تھا۔

وہ تو بیوہ ہو چکی تھی۔

بیوہ۔

یہ چھوٹا سا نام اپنے اندر کتنی وسعت لیئے تھا۔ کتنے دکھ۔ بربادیاں مایوسیاں الجھنیں دنیا کی ہر تلخی اس نام میں چھپی ہوئی تھی۔

لیکن نہ جانے اس وقت اس کے آنسو کیوں اسے دغا دے گئے تھے۔ اس کے ہوش حواس کہاں تھے اس کے پاس۔

وہ پھر بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دیوانوں کی طرح پرسکون سوئی چاندنی کو پھر گود میں چھپا لیا۔ وہ کسمسا کر رونے لگی۔

لیکن تارا کو اس کے رونے پر بھی ہوش نہ آیا۔ تارا۔ تارا۔ ہوش میں آؤ بیٹی۔ اس کی اماں۔ خود صدمے سے نڈھال تھیں۔

اس کے قریب آ کر اس کے سوئے احساسات کو بیدار کرنے کی سعی کرنے لگیں تارا فریدی رخصت ہو رہا ہے۔

ہمیشہ کے لئے۔ بچھڑ رہا ہے ہم سب سے۔ آ۔ بیٹی۔ رخصت تو ہو لے اس سے خطائیں تو بخشوا لے۔

کہا سنا تو معاف کروا لے۔

اماں نے زبردستی سہارا دے کر اُسے پلنگ سے اُتارا۔ وہ چاندنی کو سینے سے چمٹا کر بے جان سے قدموں سے اماں کے سہارے آگے بڑھنے لگی۔

باہر آنگن میں۔ نیم کی گھنی چھاؤں تلے۔ فرید بے سدھ لیٹا تھا۔

فرید۔ فرید۔

اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ اس کی بے جان صورت پر نظر ڈال کر لرزنے لگی کانپنے لگی۔

کتنی باہیں اسے سہارا دینے کے لئے آگے بڑھیں۔ لیکن اس کی نظریں۔ اپنے ناتواں کمزور سے ابا پر جا کر رک گئیں۔

جو فرید کی چارپائی سے کچھ دور کھڑے۔ زارو قطار رو رہے تھے۔ ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔

وہ سب سہاروں کو ٹھکرا کر ابا کے گلے جا لگی۔ ابا۔ ابا۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا۔؟ وہ انجان بن کر ابا سے سوال کرنے لگی۔ اور ابا کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ چاندنی کو نہ جانے کس نے اُن سے جدا کر دیا تھا۔

گھر میں بھری عورتوں کی نظریں اس پر تھیں۔ اور پھر سب نے دیکھا

تارا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر بکھرنے لگی تھیں

اور جب فرید کو لوگ کاندھوں پر اٹھا کر باہر لے جانے لگے تو وہ

بے صبری بن گئی.

انہیں کیوں لے جا رہے ہو.

کیوں لے جا رہے ہو. کیوں. کیوں. کیوں.

وہ بھی ہجوم کے پیچھے لپکی.

افق پر سفیدی رنگ دوڑ رہا تھا. سحر نمودار ہو چکی تھی.

لیکن یہ کیسی سحر تھی.

جو اس کی زندگی میں گھپ اندھیرا کر کے وجود میں آئی تھی۔ عورتوں

کے روکنے کے باوجود تارا گھر کی دہلیز پار کر گئی.

سڑک کے موڑ پر صبح کے اجالوں میں اس کا فرید ہمیشہ کے لئے منہ

موڑ گیا۔ اس کے پیچھے چلتا سوگواروں کا ہجوم بھی نظروں سے گم ہو گیا.

لیکن تارا وہیں کھڑی رہی.

ساکت و جامد سی.

کہ اسے بمشکل اندر لایا گیا.

لیکن اب فرید کے جانے کے بعد. تارا کے احساسات بیدار ہو

رہے تھے. اس نے اپنا سہارا کھو دیا تھا.

وہ پھر لڑکھڑانے لگی۔ کسی نے اسے سہارا دینا چاہا.

چھوڑ دو مجھے.

مت دو سہارا۔ میرا سہارا چھن گیا۔ اس نے کتنے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔

وہ آنگن میں پڑی چارپائی پر گر کر رونے لگی۔

اس کے ساتھ اور کتنی آنکھیں برسنے لگیں۔ فرید چلا گیا تھا اسے چھوڑ کر۔ اب اتنی جلدی اس کے دل کو یقین آ گیا تھا۔

اس نے فرید کا پیار اس کی چاہت کھو دی تھی۔ کس طرح گذرے گی زندگی اب اس کے بغیر۔

میں بھی مر جاؤں گی۔

وہ دیوانوں کے انداز میں پھر پلنگ پر سے اٹھ بیٹھی۔

آنسو اب بھی اس کی آنکھوں میں منجمد تھے۔ وہ اب تک کھل کر نہ رو سکی تھی۔ سیلاب تو وجود کے اندر ہی اندر قیامت ڈھا رہا تھا۔ تباہیاں پھیلا رہا تھا۔

"اماں مجھے بھی مر جانا چاہیئے"۔ وہ عجیب سے انداز سے اپنی ماں سے مخاطب تھی۔

نہیں نہیں۔ میری جان ۔ یہ نام زبان پر نہ لا۔ ایسی باتیں مت کر تارا! اماں دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھ کر پھر رونے لگیں۔ اپنے بچوں کا تو خیال کر۔ روتے روتے انہوں نے ایک احساس تارا کے دل میں جگایا۔

ممتا کا احساس۔

میرے بچے۔ اسے سچ مچ ہوش آ گیا۔

اماں کی گود میں منہ چھپا کر وہ پھر دھیرے دھیرے رونے لگی۔ اماں
دوسروں کی ' جان بچانے والے مرا نہیں کرتے۔
شہید ہوا کرتے ہیں نا۔ ہاں ہاں۔ فرید مرا کب ہے۔ وہ شہید ہوا ہے
اماں محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔
اور تارا نے یوں سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اسے نیند آرہی
ہو۔ گھر میں جمع ہوئی عورتوں کو۔ اب تارا کی اس فطرت پر حیرانی ہو رہی تھی
کتنا بڑا حادثہ ہوا تھا اس کے ساتھ۔
سہاگ لٹ جانے پر عورتیں قیامت سے ہم کنارہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن
یہ تارا کتنی پُرسکون نظر آرہی تھی۔
اس نے کب زمانے کی ریت کو اپنایا تھا۔ نہ ماتم کیا تھا۔ نہ بلند آواز
میں غم کا اظہار کیا تھا۔ صرف چند آنسو بہائے تھے۔
شاید یہ وقت کا تقاضا تھا۔ رسم تھی زمانے کی۔
ورنہ اس کی گوری کلائیوں میں اب بھی چوڑیاں چمک رہی تھیں کھنک
رہی تھیں۔ اس کے جسم پر ریشمی گلابی جوڑا تھا۔
اور اب یہ رنگ سب کی نظروں میں چبھ رہا تھا۔
اماں کی گود میں شاید منہ چھپا کر تارا کو پناہ مل گئی تھی۔ اور اسے نیند
نہ جانے کس طرح آگئی تھی۔ حیران ہونے والے حیران ہو رہے تھے۔
کمرے میں دبی دبی سرگوشیاں ابھر رہی تھیں۔ لیکن سب سے غافل
ہو کر۔

"تارا سچ مچ سو رہی تھی۔

رات بھر کی جاگی ہوئی تارا۔ کس طرح سوگئی تھی۔ سویا کون تھا رات سے۔ سب جاگ رہے تھے۔ لیکن اب بھی نیند کسی کی آنکھ میں نہ تھی۔

لیکن نہ جانے تارا کو کس طرح آگئی تھی۔ اس کا سونا عورتوں کو برا لگ رہا تھا۔

"کیسی عورت ہے یہ۔ ذرا بھی غم نہیں لگتا اسے میاں کے مرنے کا" ایک سرگوشی ابھری، پھر دوسری۔

اور پھر عورتیں یہ بھول کر کہ وہ ایک ایسے گھر میں بیٹھی ہیں۔ جہاں سے ابھی ایک جنازہ اٹھا ہے۔ اپنی باتوں میں لگ گئیں۔

وہ تو تسلی دینے آئی تھیں۔ گھر والوں کو۔ لیکن تسلی کی مستحق تو ان کے دلاسے کے بغیر سوگئی تھی۔ پھر بھلا۔

الفاظ خرچ کرنے کی ان کو کیا ضرورت تھی۔ چند ایک باتیں کر کے۔ وہ سب اپنے گھروں کو جانے کے لئے کھڑی ہوگئیں۔

نہ ان کو درود پڑھنے کے لئے روکا گیا۔ نہ قرآن مجید اور اماں بے چاری سوئی ہوئی تارا کا سر تکیے پر رکھ کر۔ تنہا ہی فرید کی روح کو ثواب پہنچانے کی خاطر قرآن مجید لے کر بیٹھ گئیں۔

اس کی ساری خوشیاں راحتیں ارمان سب کچھ فرید اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ صرف ایک حق اس سے نہ چھینا گیا تھا۔

جینے کا۔ لیکن تارا اب خود جینے کی تمنا نہ کرتی تھی۔ وہ بھی فرید

کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ خواہش بھی اس کی انہونی سی خواہش۔
بھلا موت اس طرح مانگنے سے کب آتی ہے۔ وہ تو چپ چاپ آتی ہے۔ کسی کو بتائے بغیر۔ پھر ایک زندگی کے ساتھ۔ اپنے ساتھ کیا کچھ نہیں لے جاتی ۔۔۔
خوشیاں۔ سکون۔ قرار۔
موت کتنے وجودوں کو۔ بے آسرا کر جاتی ہے۔ کتنی خوشیوں کی قاتل ہوتی ہے۔
اس موت نے تارا کو بھی لوٹ لیا تھا۔ اس کی زندگی کے ہر چمکتے رنگ کو اپنے میں لپیٹ لیا تھا۔ فقط اندھیرے ہی تو بچے تھے اس کے لئے کتنی حق تلفی کی تھی موت نے اس کے ساتھ:
تارا نے اپنی کلائیوں کی بھری بھری چوڑیاں اتار ڈالیں۔ اس نے محسوس کر لیا تھا۔ آنے جانے والی عورتوں کی نظریں۔ اب صرف اس کے ہاتھوں پر رہتی ہیں۔
اس نے سفید لباس پہن لیا۔
وہ دنیا سے کٹ گئی۔ اس نے کھلی چھت تلے جانا چھوڑ دیا۔ ایک اندھیرے سے کونے کو اس نے اپنا مسکن بنا لیا۔
اسے چار ماہ اور دس دن عدت کرنی تھی۔ ایک ایک دن کھسک کھسک کر گزر رہا تھا۔
گھر کا ماحول کیسا سوگوار تھا۔ روز قرآن مجید ختم کروائے جاتے،

اگر بتی اور لوبان کی خوشبو ہر طرف پھیلائی جاتی۔

اور تارا کو وحشت ہونے لگتی۔ فرید کا بے جان سفید کفن میں لپٹا چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگتیں۔ اماں اماں۔ ان منحوس خوشبوؤں کو نہ بکھیرا کرو۔

میرے جی کو کچھ ہونے لگتا ہے۔

وہ سب عورتوں کے بیچ میں بول پڑتی۔ اور سب چونک کر اس کو تکنے لگتیں۔ اور چپ چاپ۔ نظریں جھکا کر ہل ہل کر سیپارہ پڑھنے لگتیں فرید کی روح کو ثواب کی خاطر۔

فرید۔ روح بن گیا۔

وہ پھر سیپارہ پڑھتے پڑھتے سوچوں کے جال میں الجھ جاتی۔

اس کا سفید چہرہ عجیب سے تاثرات پیدا کرنے لگتا۔

پھر قرآن ختم ہو جاتا۔ تو عورتیں باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔ فرید کے قصے دہرائے جاتے۔

ہائے کیسا جوان تھا۔

ہنس مکھ۔ باتونی۔ رحم دل۔ دوسروں کا غم خوار۔ اچھے لوگ جلد دنیا سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

سچ سچ۔ سچ سچ۔ اس کا فرید ایسا ہی تھا نا۔ وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر سب کی صورتیں تکنے لگتی

لیکن اس پل انکے بند ہونٹ نہ کھلتے۔ فرید کا نام کبھی اس کے لبوں

پر اگر نہ ٹوٹتا۔ کیسی عورت تھی وہ۔

شوہر کی موت پر۔ دنیا کے دکھاوے کے لئے اس نے ماتم نہ کیا۔ دیواروں سے سر ٹکرایا۔ لوگوں کو دل کا حال نہ سنایا۔

بلکہ وہ تو گم سم ہو گئی۔ کیسی عورت تھی۔

مٹی کا ملبہ۔ یا بے حس مجسمہ۔

لیکن بھلا اس کے دل کی کسے خبر تھی۔ وہ دل کے حال کسی کو نہ سنانا چاہتی تھی۔ وہ بھلا اپنا راز دار کسی دوسرے کو کیوں بناتی۔

اس کا خوشیوں سے بھرا دل زخمی زخمی ہو چکا تھا۔ اس دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

لیکن اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اس دنیا سے پھر دل لگانا تھا۔ چاندنی کی خاطر نوید کے لئے۔ بچوں کو ابھی اس کی ضرورت تھی۔ ضرورت تو باپ کی بھی تھی۔ لیکن وہ تو بے وفائی کر گیا تھا۔

تارا کس طرح۔ بے وفائی کرتی۔ یہ پھول سے بچے ابھی تو کھلے تھے۔ اس گلشن میں۔ نوید دو برس کا بھی نہ تھا۔

اور چاندنی۔ صرف تین ماہ کی اوں آں کرتی بچی۔

پھر اگر وہ ان ننھی جانوں کو دنیا کے منجدھار میں چھوڑ دیتی۔ تو یہ جلد ڈوب جاتے۔ اس کے سہارے کے بغیر کس طرح سنبھل سکتے تھے وہ۔

پھر چاندنی تو اس کے فرید کا ارمان تھی۔ سب سے بڑی آرزو۔

یہ ارمان جیسے ہی پورا ہوا —— فرید کو پھر کسی ارمان کی تمنا نہ رہی۔

دنیا سے جا کر اس نے یہی تو ثابت کیا تھا۔ تارا پر۔ اکثر تارا کو بیتے دنوں کی یاد آ جاتی۔ وہ باتیں کل ہی کی تو تھیں۔ لیکن کل اور آج میں کتنا فرق تھا۔ فرید کو بیٹی کا بے حد ارمان تھا۔ جب نوید اس دنیا میں آنے والا تھا۔ تو وہ بیٹی کی تمنا کرتا۔

لیکن تارا کے ساتھ ساتھ اماں۔ فرید کی ماں اور سب گھر والوں کو بیٹے کی تمنا تھی۔ ووٹ بیٹے کے حق میں زیادہ تھے۔

اس وجہ سے پہلے اللہ میاں نے بیٹا ہی بھیجا۔ اور فرید خوشی کے ساتھ ساتھ۔ بناوٹی انداز سے تارا سے الجھ پڑا۔

تم نے میری بات کیوں نہیں مانی تارا۔

وہ شرمانے لگی۔ ہنسنے لگی۔ بھلا قدرت کے اصولوں پر کسی کا کیا زور۔ لیکن فرید کو اپنے بیٹے سے بھی بہت پیار تھا۔

لیکن ساتھ ساتھ وہ پھر تارا کو چھیڑتا۔ ہماری چاندنی کو جلد آنگن میں لے آؤ تارا۔ اس نے کب سے بیٹی کا نام۔ چاندنی رکھ سوچا تھا۔

تارا۔ کے ساتھ چاندنی کا جوڑ مناسب رہے گا نا۔

ہائے۔ اتنا ارمان ہے آپ کو بیٹی کا۔ کبھی تارا کو بھی افسوس ہونے لگتا۔ کہ نوید کے بجائے چاندنی کیوں نہیں ہوئی۔

لیکن پھر جلد اللہ میاں نے اسے ایک اور خوشی کا احساس بخش دیا۔ اس بار سب کو ہی لڑکی کی تمنا تھی۔ چاندنی کی آرزو تھی۔

اور کبھی فرید کی اس خواہش پر۔ تارا کا دل بجھنے لگتا۔ اگر اس بار

بھی چاندنی آنگن میں نہ پھیلی تو - تو - پھر فرید کا دل بجھ جائے گا - لیکن اس میں میرا کیا قصور - سچ مچ اس معاملے میں وہ بے قصور تھی نا ۔

فرید ابھی سے اپنی چاندنی کی باتیں کرکے ۔ اسے چھیڑتا ۔

قبل از وقت تارا کو یہ باتیں اچھی نہ لگتی تھیں ۔ کبھی وہ شرما جاتی ۔ کبھی خفا ہو جاتی ۔ کبھی ڈوبے ڈوبے لہجے میں کہتی

اگر اس بار ۔ اس بار بھی آپ کی چاندنی کا ارمان پورا نہ ہوا تو ۔ ؟ پھر انتظار میں مزہ ہی ہے ۔

وہ جھینپ جاتی ۔

لیکن اللہ میاں دل سے نکلی دعائیں ضرور سنتا ہے ۔ اس بار چاندنی ہی آئی ۔ اس کی آمد کی خبر پہ فرید تو خوش تھا ہی ۔

لیکن تارا بھی یوں خوش تھی ۔ جیسے وہ پہلے بچے کی ماں بنی ہو ۔ چاندنی کی ننھی منی صورت تھی بھی چاند سی ۔ فرید تو بیٹی پر فدا تھا ۔

قلیل سی مدت میں اس کے لئے کیا کچھ نہ لایا تھا ۔ رنگ برنگے کھلونے ۔ ۔ جھنجھنے ۔ اس کی لمبائی کی گڑیا ۔ چابی سے بھاگنے دوڑنے والے کھلونے ۔ رنگ برنگی پیاری پیاری فراکیں ۔

واللہ اتنی فضول خرچی مت کریں آپ ۔ تارا اس کو روکتی ۔ بیٹی ہوئی ہے نا ۔ ایک احساسِ ذمہ داری ہوتا ہے ۔ پھر بیٹی ۔ دیکھتے دیکھتے ۔ یوں اچانک ایک دن چپکے سے جوان ہو جاتی ہے ۔ اور گھر میں بڑی لگنے لگتی ہے ۔

" فرید ۔ اب فضول خرچی کرنے کے بجائے ہمیں بچت کرنی چاہیئے "

واہ۔ واہ۔ بہت خوب۔

فرید ہنسنے لگتا۔ ابھی تو ہماری بیٹی اس دنیا میں آئی ہے۔ اور تمہیں اس کو اس گھر سے نکالنے کی فکر ہو گئی۔

سن لو تارا بی۔ کان کھول کر۔ ہماری بیٹی۔ پہلے خوب پڑھے لکھے گی تمہارا طرح تھوڑی جاہل رہے گی۔ پھر یہ قابل ہو جائے گی ہر طرح سے تو پھر۔ بعد میں سوچیں گے ہم اس کی شادی کے بارے میں۔

اونہہ۔ وہ منہ بسورنے لگتی۔ فرید تو بس بیٹی کی چاہت میں گم ہو گیا تھا

میری چاندنی بھی۔ میری طرح نصیب والی ہو گی۔ وہ سوچنے لگتی۔ تارا کو بھی تو۔ سب نے فقط چاہا تھا۔

اس نے ہر طرف سے پیار کے انمول خزانے اپنی جھولی میں بھرے تھے۔ اماں ابا کی، فرید کی انوکھی پیاری سی چاہت۔

سسرال والوں کی چاہت۔ تارا کے لئے تو بس ہر طرف چاہت ہی چاہت بکھری تھی۔ اب اس کی چاندنی کے حصے میں بھی یہ چاہت آئی تھی۔

تارا ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔

اور چاندنی۔ فرید کے گھر میں پہلی لڑکی۔ فرید کی کوئی بہن نہیں۔ بس بھائی بھائی اللہ میاں نے اسے دیئے تھے۔

اس لئے لڑکی کی۔ اسے فطری خواہش تھی۔

لیکن یہ خواہش پوری ہوئی۔ تو فرید کی زندگی کے دن پورے ہو گئے۔ نوید اور چاندنی سے باپ کا پیار چھن گیا۔

خوش نصیبی تاریکی کی نذر ہو گئی۔

تارا کا نصیب تاریک ہو گیا۔ اور چاندنی۔ وہ ننھی سی جان۔ یتیم ہو گئی۔ بے آسرا ہو گئی۔

سارے رشتے باقی تھے۔ ساری چاہتیں موجود تھیں۔

تارا ذہنی مریضہ بن گئی۔ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ سکھ چین اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔

کیا ہو گا۔ یہ جیون تنہا تنہا۔ کیسے گذرے گا۔ اس کی راہیں ابھی سے بے حد کٹھن ہو گئی تھیں۔

اماں اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی تھیں۔

فرید کا گھر چھوڑتے ہوئے اس کا دل بے پناہ دکھا تھا۔

دکھ ہی دکھ تو رہ گئے تھے اب اس کے پاس۔ خوشیاں تو اس سے دور ہو چکی تھیں۔ دور بہت دور۔ کہ ان تک پہنچنے کی اب تارا کے دل کو تمنا بھی نہ تھی۔

"تارا بیمار رہنے لگی۔ اس کی گوری گوری رنگت مرجھا گئی۔ خوب صورت آنکھوں کی جگمگاتی قندیلیں۔ مسلسل جاگنے سے دھندلا گئیں۔

تارا کا رنگ روپ اجڑنے لگا۔ لیکن وہ خود سے لاپرواہ رہنے لگی۔ دن بھر بچوں میں لگی رہتی۔

اب یہی بچے اس کی دنیا تھے۔ اس کی چاہت۔ ایک بیٹیا۔ اس

کے بڑھاپے کا مضبوط سہارا۔

ایک بیٹی۔ اس کے گھر کی رونق۔ تارا کو اپنے بچوں سے چاہت دوگنی ہو گئی۔ چاندنی۔۔۔ تو اس کی گود سے چپکی رہتی۔

نوید کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ بے قرار سی ہو جاتی اس کا جی چاہتا بس نوید۔ اس کے پاس ہی بیٹھا رہے۔

لیکن وہ حد درجے کھلنڈرا شریر سا بچہ تھا۔ عمر کے ساتھ اس کی شرارتیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔

گھر کی کوئی چیز اب اس کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں تھی۔ برتن وہ توڑتا۔ سلیقے سے رکھی چیزیں بکھیر کر رکھ دیتا۔

چاندنی کے کھلونے وہ توڑتا۔

اور جب وہ چاندنی کے کھلونے توڑ دیتا۔ تو ساتھ ساتھ تارا کا دل بھی ٹوٹ جاتا۔

یہ کھلونے تو فرید کے ہاتھوں کے خریدے ہوئے تھے۔

اب کون خرید کر لانے والا تھا چاندنی کے لئے ویسی چاہت اور محبت سے کھلونے۔ جیسی چاہت سے کبھی فرید خرید کر لاتا تھا۔ تارا نے سارے کھلونے الماری میں بند کر دیئے۔

یہ چاندنی کے ابو کی یادگار تھے۔ اور وہ ان کو چاندنی کے لئے ہی محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔

تارا پہروں چاندنی کو گود میں لئے۔ فرید کے بارے میں سوچتی

رہتی۔ ٹپ ٹپ آنسو بہاتی رہتی۔ اس کے گرم گرم آنسو ننھی چاندنی کا منا سا چہرہ بھگو دیتے۔ اور ایسے میں کبھی وہ سوتے میں جاگ کر منہ بسور کر رونے لگتی۔

لیکن چاندنی کو تو ابھی اللہ میاں نے آنسو بھی نہ دیئے تھے۔ وہ تو باپ کی موت پر بھی ایک آنسو نہ بہا سکی تھی۔

وہ ننھی سی جان تھی۔ جسے نہ کوئی ابھی احساس تھا۔ نہ خوشی کا نہ غم کا۔ لیکن چاندنی بھی ضرور روئے گی۔ کبھی باپ کے لئے۔

جب میں اسے بتاؤں گی۔

تو اپنے باپ کا ارمان تھی۔ چاندنی۔

وہ فرید کی اس مقدس امانت کو سینے سے لگا لیتی۔

تارا کی پاگل سوچوں نے اسے یوں بیمار کیا۔ کہ وہ چارپائی پر پڑ گئی۔ تو ابا اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈاکٹر کو گھر پر بلا لائے۔

اسے کیا مرض تھا۔

راتوں کو جاگنے کا۔ اس کی خوابیدہ آنکھیں نیند کو ترس گئیں تھیں فرید کی موت کے بعد۔ وہ صرف چند پل کو ایک بار اماں کی گود میں منہ چھپا کر ساری عورتوں کے ہجوم میں سوئی تھی۔

پھر اس کے بعد۔ اسے کبھی سکون کی نیند نہ آئی۔

اس کی دونوں آنکھوں میں جیسے کسی نے پتھر کوٹ کر بھر دیئے تھے۔

ڈاکٹر نے اور دواؤں کے ساتھ اس کے لئے نیند کی دوا بھی تجویز کی۔

"بے قرار تارا نے اس دوا سے سکون پالیا۔ وہ سونے لگی پہروں نیند کی وادی میں گم رہتی۔

اس نے نوید کو فراموش کر ڈالا۔ چاندنی کا خیال اسے نہ رہا اماں کا تو بڑھاپا تھا۔ پھر تارا کا غم ان کا اپنا غم تھا۔

بیٹی کی بربادی کا روگ۔ اماں کے دل کا روگ تھا۔ ابا کی جھکی کمر اس صدمے سے اور جھک گئی تھی۔

"اماں سے تارا کے بچے نہ سنبھلتے۔" تارا تو دن بہ دن خود سے فراموش ہوئے جا رہی تھی۔ کتنا مزا آنے لگا تھا اسے۔ اب نیندیں پریشاں پریشاں خیالات۔ دنیا کے غم۔ سب دور پرے رہ جاتے۔ لیکن اس کا جسم۔ دن بہ دن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

وہ گھل رہی تھی۔ بالکل ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔

"تارا کیوں۔ اپنی جان کے پیچھے پڑی ہے۔ اماں رندے ہبجے میں اسے سمجھاتے سمجھاتے خود رونے لگتیں۔ تارا میرا خیال کیا کر۔ اپنی بوڑھی ماں کا باپ کا۔

اپنے بچوں کا۔ اماں اسے بچوں کا واسطہ دیتیں۔

اور بچوں کے نام پر وہ چونک جاتی۔ میرے بچے۔ میرا انمول خزانہ۔ زندگی کے ادھورے خوابوں کی تعبیر۔

مجھے سنبھل جانا چاہیئے۔ مجھے سنبھلنا پڑے گا۔
وہ خود بڑبڑانے لگتی۔
اماں نے نیند کی گولیوں کی شیشی چھپا ڈالی۔
اب ان کو یہ خطرہ لاحق تھا۔ کہ تنگ آکر تارا۔ پوری شیشی خالی نہ کر دے۔ اب تو اماں میں آنسو بہانے کی سکت نہ رہی تھی۔
بقول ان کے۔ اب تو ان کے رخصت کے دن تھے۔ لیکن کیسی نا انصافی ہو گئی یہ۔ بوڑھے رہ گئے۔ جوان چلا گیا۔
ایسا تو ہوتا ہے۔ موت بوڑھے جوان بچے کسی میں تمیز نہیں کرتی۔
تارا۔ ہوش کی دنیا میں آگئی۔
اماں کی خاطر ابا کی خاطر بچوں کے واسطے۔
وہ سنبھل گئی۔ بظاہر پُرسکون ہو گئی۔ اب وہ اماں کے ساتھ پہلے کی طرح پھر گھر کا کام کاج کرنے لگی۔
سب کچھ پہلے کی طرح ہونے لگا۔ زندگی اپنے سفر پر رواں دواں رہی۔ لیکن۔ وہ خلا پُر نہ ہوا۔
جو تارا کی زندگی میں فرید کر گیا تھا۔

فرید کو دنیا سے رخصت ہوئے. چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا.
وقت نے سب کے دلوں پر مرہم رکھ دیا تھا. صبر آچکا تھا سب کو. لیکن تارا کو کبھی محسوس ہوتا کہ وقت کا مرہم کبھی اس کے دل کا زخم نہ بھر سکے گا.

اسے اب بھی فرید کی موت کا یقین نہ آتا. کبھی خود پر نادم ہو جاتی. کیوں گئی تھی وہ اس دن سیر کو.

کاش نہ جاتی. تو یہ سانحہ تو اس کی زندگی میں پیش نہ آتا.

کبھی دل کہتا. فرید اللہ میاں کے یہاں سے زندگی کے اتنے ہی دن لے کر آیا تھا. قدرت کے کاموں میں انسان کس طرح دخل اندازی کر سکتا.

وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی.

وہ دل جو دن رات تڑپتا رہتا. کب آئے گا اس دل کو صبر؟

وہ اپنے آپ سے سوالی بن کر پوچھنے لگتی.

فرید کی موت اس کی زندگی کا پہلا اور سب سے سنگین حادثہ تھی. اس نے آنکھ کھولنے کے بعد کوئی دکھ نہ دیکھا تھا.

دکھوں نے کبھی اس کے دل میں بسیرا نہ کیا تھا۔

اس کی زندگی بڑے خوشگوار سفر پر ہنستے کھیلتے گامزن تھی۔ کبھی کسی انجانے غم میں وہ مبتلا نہ ہوئی تھی۔ بچپن میں تو وہ جانتی بھی نہ تھی۔ غم کسے کہتے ہیں۔ دنیا میں لوگوں کے دلوں میں غم بھی بستے ہیں۔ وہ تو بڑے ناز و نعمت سے خوشیوں کا جھولا جھولتی جوان ہوئی تھی اور پھر بہار کی رت کی طرح فرحت کا احساس لئے ڈھیر سی خوشیاں لئے رنگینیاں بکھیرتا فرید کا پیار بھی اس کے جیون میں داخل ہوا تھا۔

فرید نے بھی بس تارا کے ناز اٹھائے تھے۔ اسے اپنی بے پناہ چاہت دی تھی۔ دل و جان سے اس کی قدر کی تھی۔

تارا کی ہستی کو اب تک صرف سب نے چاہا تھا۔ سسرال والوں نے بھی۔ اور ماں باپ نے بھی۔ اماں اور ابا نے تو اسے اس وقت ناز نخروں میں تولنا شروع کیا تھا۔

جب اس نے دنیا میں پہلا پہلا سانس لیا تھا۔

وہ بہت سی منتوں اور مرادوں۔ شب و روز کی دعاؤں کے بعد اس دنیا میں آئی تھی۔ اس سے پہلے۔ اس گھر کا آنگن سونا تھا۔

اماں ابا کو اولاد کی شدید تمنا تھی۔ اور یہ تمنا ان دونوں کی شادی کے دس طویل سالوں بعد پوری ہوئی تھی۔

اماں کی گود میں پہلی جو کلی مہکی۔

وہ ننھی منی تارا ہی تو تھی۔

وہ سچ مچ گھر کا اجالا تھی۔ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔

اسی وجہ سے ابا نے اس کا نام ستارہ رکھا۔

پھر وہ اسے تارا کے نام سے پکارنے لگے۔

تارا اماں ابا کے لئے ایک جیتا جاگتا کھلونا تھی۔ ان کے گھر میں رونق بن کر آئی تھی اور اس وقت آئی تھی۔

جب وہ دونوں مایوس ہو گئے تھے۔ کہ وہ اولاد والے نہیں بن سکتے۔ اور اس مایوسی میں اللہ میاں نے امید کی کرن روشن کر دی۔

ان دونوں کی حالت پر قدرت کو رحم آگیا اور تارا دنیا میں آگئی۔

ماں باپ کی محبت کے انمول خزانے صرف تارا کے لئے وقف تھے۔ وہ سچ مچ ان دونوں کے دل کا ٹکڑا تھی۔ آنکھوں کا نور تھی۔

ابا نے اس کی خاطر دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیا۔ دفتر سے سیدھے گھر چلے آتے۔ اور آتے ہی اپنی تارا کی ناز برداری میں لگ جاتے۔

اس طرح رانیوں کی سی شان سے تارا بڑی ہونے لگی۔ سال بھر کی ہوئی۔ گھر میں بھاگنے دوڑنے لگی۔ چیزوں کو توڑنے پھوڑنے لگی۔

لیکن نقصان ہونے پر بھی اماں اور ابا کو کبھی غصہ نہ آیا۔

پھر تارا کئی برس کی ہو گئی۔

لیکن اس کا کوئی اور بہن یا بھائی اللہ میاں نے نہ بھیجا۔ تارا اکلوتی ہی رہی۔ اماں ابا کی تمام تر خواہشات اور امیدوں کا مرکز صرف وہی تھی۔ ابا کا ہاتھ فارغ تھا۔

پیسے کی ان کو کبھی تنگی نہ ہوئی تھی۔ بس گذر بسر آرام اور سکون سے ہو رہی تھی۔

ابا ایک سرکاری محکمے میں معمولی ملازمت پر فائز تھے۔ یہ چھوٹا سا گھر بھی اپنا تھا۔ ابا کی تنخواہ سے گذارہ مزے میں ہو رہا تھا۔

ابا اس اہل تھے۔ کہ اپنی بچی پر دل کھول کر خرچ کر سکیں۔ جو کچھ تھا ان کے پاس وہ تارا کا ہی تو تھا۔

ابا روز اس کے لئے بازار سے کچھ نہ کچھ خرید لاتے۔ اور تارا بھی اس بات کی عادی ہو گئی تھی۔

جس دن اتفاق سے ابا خالی ہاتھ آتے اس دن تارا منہ بسورنے لگتی۔ اور ابا کا دل دکھنے لگتا۔

ابا کے دل میں جو ارمان تھے۔ جتنی خواہشات تھیں۔ وہ تارا کے وجود سے ان کی تکمیل چاہتے اکثر وہ اماں سے تارا کے مستقبل کے بارے میں الجھ جاتے۔

" میں اپنی بیٹی کو بہت بڑھاؤں گا۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گی میری بیٹی۔ بی اے۔ ایم اے سے تو کم ہرگز نہیں۔" ابا خوابوں میں بہت اونچی اڑان اڑ جاتے۔

اے ہے نہیں۔ اماں بیٹی کے معاملے میں قدامت پسند تھیں۔ لڑکی ذات کو اتنا پڑھوا کر کیا کرنا بس چند جماعتیں کافی ہوتی ہیں لڑکیوں کے لئے۔

وہ منہ بناتیں۔

اپنی بات کی کاٹ ہوتے دیکھ کر ابا بھی حجت پہ اتر آتے۔ یہ تمہارا زمانہ نہیں ہے۔ کہ لڑکیوں کو الف کا نام ب نہیں پڑھایا جاتا ہے۔

"تو آپ اتنا اسے پڑھوا کر کیا اپنی طرح دفتر میں ملازمت کروائیں گے"۔ اماں الجھ کر کہتیں۔ بس اسی طرح اماں اور ابا گھنٹوں الجھے رہتے"۔

اور اماں ابا کی باتوں سے لاپروا۔ وہ مزے میں اپنے کھلونوں سے کھیلتی رہتی۔ ویسے بھی وہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ اس کی اسکول جانے کی عمر بھی ابھی کہاں آئی تھی۔ اماں ابا قبل از وقت اس کے بارے میں فیصلے کیا کرتے تھے۔

لیکن گذرتے دنوں کے ساتھ تارا بڑی ہونے لگی۔ اچھا کھانے پینے اور تربیت کی وجہ سے وہ عمر سے بڑی ہی لگتی۔

اللہ میاں نے اس کی صورت بھی بڑی پیاری بنائی تھی۔ سرخ سی رنگت کھلی کھلی آنکھیں سیب سے گال۔ وہ ہر ایک من کو بھاتی تھی۔

پھر وہ شریر بھی بے حد ہو گئی تھی۔ اب تو اس سے گھر میں ٹکا نہ جاتا۔ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ وہ دن بھر کھیلنے کودنے میں مصروف رہتی۔

کبھی آنکھ مچولی۔ کبھی گڑیا کی شادی کا کھیل رچایا جاتا۔ دن بھر وہ شرارتوں میں مصروف رہتی۔

اکثر باہر کھیلنے کودنے میں وقت ایسا گذرتا کہ شام گہری ہو جاتی۔ پھر بھی اُسے گھر جانے کا ہوش نہ آتا۔

تو ابا کو اس کی تلاش میں محلے کے گھروں میں آواز لگانی پڑتی۔ پھر کہیں بڑی مشکلوں سے جاکر تارا ملتی۔

اماں کو اس کا اب اس طرح باہر نکلنا قطعی پسند نہ تھا۔ وہ اسے اکثر ہولے سے ڈانٹ بھی دیتی تھیں۔

لیکن ابا جو اس کے حمایتی ہوتے۔ اسی وجہ سے تارا پر اماں کی ڈانٹ کا رتی بھر بھی اثر نہ ہوتا۔

ویسے بھی اب تارا کی اسکول جانے کی عمر ہو گئی تھی۔ اس سال میں داخلے شروع ہوئے تو ابا نے بھی تارا کا نام لکھوا دیا۔

لیکن تارا تو اسکول جانے کا نام سن کر سوگوار ہو گئی۔ اسے تو اب تک صرف کھیلنے کودنے کا شوق تھا۔ اودھم بازی میں اُس کا جی خوب لگا کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے نام سے اُسے خوف آتا تھا۔

ان دنوں اماں نے اسے قرآن مجید پڑھانے کے لئے۔ استانی جی بھی رکھ لی تھیں۔ تارا کو تو جیسے ہر طرف سے گرفت میں لیا جانے لگا تھا۔

تارا کو اتنی روک ٹوک بالکل پسند نہ آئی۔ وہ پڑھنے کی چوری

کرنے لگی۔ استانی جی کی صورت دیکھتے ہی وہ طرح طرح کے بہانے بنانے لگتی۔

بہانہ بازی کام نہ آتی تو کبھی چھپ جاتی۔ کرسیوں کے پیچھے یا پلنگ کے نیچے۔

یا پھر منہ بسور کر اماں کو یقین دلانے لگتی۔ اماں سر میں درد ہو رہا ہے۔

ہائے اماں پیٹ میں اتنا درد ہے کہ بس۔

اور اماں پر اس کا یہ جادو چل جاتا۔ وہ کب تارا کی ذرا سی تکلیف برداشت کر سکتی تھیں۔

وہ اسے پیار سے بستر پر لٹا کر استانی جی کو رخصت کر دیتیں۔

نہ بھئی۔ آج ہماری چاند تارا کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس نے نہیں پڑھنا۔

اور جب استانی جی رخصت ہو جاتیں۔ تو اس سے پھر بستر پہ نہ لیٹا جاتا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھلی چنگی ہو جاتی۔

یہ سب کچھ ماں باپ کی ڈھیل اور بے جا لاڈ پیار کا اثر تھا۔ اس کو ناجائز حرکتوں پر بھی نہ ٹوکا جاتا تھا۔ تارا کے منہ سے جو نکلا۔

وہ بات پوری کرنی ابا کے لئے بے حد ضروری تھی۔

پھر ابا کو بھی تارا کے لئے چیزیں خرید کر لانے میں خوشی ہوتی۔ وہ اکثر شام اس کے لئے بازار سے کچھ نہ کچھ خرید لاتے۔

یہ ان کی اس وقت سے عادت تھی۔ جب سے تارا پیدا ہوئی تھی

کبھی اس کے لئے سوٹ کا کپڑا۔ کبھی ربن۔ بندے ہار۔ یا چوڑیاں

کبھی اس کے لئے چاکلیٹ ٹافیاں ڈھیر سے بسکٹ
اور کبھی بیٹی کی فرمائش پر اس کے لیے سونے جاگنے والی پلاسٹک کی گڑیا۔ بالکل میم جیسی اور اس گڑیا کو تارا سجا بنا کر۔ مشرقی دلہن بنا ڈالتی —— ایسا کرنے میں کبھی گڑیا کی ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ کبھی گردن اور تارا کو رونا آجاتا۔

ہائے ابا۔ اس گردن ٹوٹی۔ ایک ہاتھ پیر والی گڑیا سے کون شادی کرے گا۔ وہ ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگتی۔

اور تارا کے اس انداز پر ابا کا دل کٹنے لگتا۔

دوسرے دن وہ اس کے لئے دوسری گڑیا خرید لاتے۔

یہ سچ تھا جب سے تارا پیدا ہوئی تھی۔ اس کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ابا کے اخراجات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

تنخواہ ان کی وہی لگی بندھی تھی۔ پہلے تو وہ بچت بھی کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اب بچت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور اس ماہ انہوں نے تارا کے اسکول میں نام لکھوانے کے ساتھ ساتھ داخلے کی فیس بھی تو بھری تھی۔

اور مہینے کے شروع میں ہی ابا کی جیب خالی ہو گئی تھی —
بڑھتے ہوئے اخراجات کے ساتھ اب ابا فکر مند رہنے لگے تھے۔

لیکن بھلا۔ ابھی تارا کے ننھے سے دماغ کو پیسے کی اہمیت کا کیا پتہ تھا۔ کہ پیسہ کن مشکلوں سے کمایا جاتا ہے۔

وہ تو بس دن رات ابا سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتی رہی۔

ان دنوں وہ اپنی گڑیا کا جہیز جمع کرنے میں مصروف تھی۔ ابا سے روز کچھ نہ کچھ منگواتی۔ ایک شام ابا اس کی گڑیا کے جہیز کا سامان نہ لائے۔

تو تارا ابا سے روٹھ گئی۔

اب کس طرح شادی ہوگی میری گڑیا کی۔ اس کے منہ سے یہ بات سن کر ابا اپنی پریشانی بھول کر ہنسنے لگے۔

یہ لڑکیاں بھی عجیب فطرت کی ہوا کرتی ہیں۔ ذرا سا ہوش سنبھالتے ان کو شادی بیاہ جہیز سب کی سمجھ آجاتی ہے۔

آپ ہی آپ یہ باتیں ان کو کہاں سے آجاتی ہیں۔ وہ اماں سے تارا کی ہوشیاری کی باتیں کرنے لگے۔

کتنی ذہین تھی ان کی تارا۔

پھر ابا دوسرے دن۔ اس کی مطلوبہ چیزوں سے بڑھ کر اس کے لئے سامان خرید لائے۔ چھوٹے چھوٹے برتن۔ پلاسٹک کی پیالیاں۔ گڑیا کا پلنگ۔ صوفہ۔ نہ جانے کیا کیا۔ کہ تارا خوش ہوگئی

مارے محبت کے ابا کے گلے لپٹ گئی۔ اور اس کی اس ادا پر ابا کا اتنے پیسے خرچ کرنے کا دکھ جاتا رہا۔

چھٹیوں کے بعد اسکول کھلے تو تارا کا بھی اسکول جانے کا دن آگیا
ابا تو خوش تھے. اب ان کی بیٹی اسکول میں پڑھا کرے گی۔
لیکن اسکول کا نام سن کر ہی تارا کا جی گھبرانے سا لگا تھا. لیکن اب وہ کوئی بہانہ بھی تو نہ کر سکتی تھی۔
گھر میں استانی سے پڑھتے ہیں وہ اماں سے بہانے کر کے بچ جاتی. لیکن تارا کو یہ احساس اب بخوبی ہو گیا تھا. کہ اس معاملے میں ابا اسے ہرگز نہ بخشیں گے۔
اسے روز دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔
روز ابا دفتر جاتے تو وہ بے خبر سو رہی ہوتی۔ ابا سوتی ہوئی تارا کو پیار کر کے چلے جاتے۔
لیکن آج تو اسے اسکول جانا تھا. اس وجہ سے اماں نے بمشکل اسے منہ اندھیرے بستر سے کھڑا کر دیا۔
اسکول جانے کے نام سے وہ سہمی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں نیند کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بھر آئے۔
اماں اسے پیار سے بہلانے لگیں. طرح طرح کے دلاسے دینے لگیں.

پھر اماں نے اس کا اپنے ہاتھوں سے منہ بھی دھلایا۔
اتنی بڑی ہو گئی تھی وہ۔ لیکن پھر بھی دودھ پیتی۔ بچی بنی ہوئی تھی
پھر اماں نے اسے اجلے اجلے نئے نئے کپڑے پہنائے۔
ابا اس کے لئے نئی جوتیاں تک خرید لائے تھے۔
تارا تو بس سر سے پیر تک چھم چھم چمکنے لگی۔
آج اماں نے اس کے لئے ناشتہ بھی بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا
وہ اپنے ہاتھ سے نرالے بنا بنا کر اس کے منہ میں دینے لگیں۔ لیکن
تارا کو آج کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔
لاکھ نخرے کرتی رہی۔ انڈا نہیں کھاؤں گی۔ دودھ نہیں پیوں گی۔
لیکن اماں اور ابا اسے زبردستی کھلانے کے موڈ میں تھے۔ اور تارا کو تو
اب تک زبردست نیند آرہی تھی۔
سچ مچ اونگھ رہی تھی وہ تو۔
ابا اسے اپنی سائیکل پر بٹھا کر اسکول کی طرف چل پڑے۔
ابا کی سائیکل پر بیٹھ کر سیر کو جانا تارا کو بے حد اچھا لگتا تھا۔ لیکن
آج اسے یہ لگ رہا تھا۔
کہ ابا اسے کسی قید خانے میں لے جا رہے ہوں۔ اس کا منہ بن
گیا۔ سچ مچ آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔
پھر اسکول آ گیا۔ اسکول کے باہر بے پناہ رش تھا۔ بچیاں بڑی
لڑکیاں ہر عمر کی لڑکی نظر آرہی تھی۔

"تم بھی یہاں اچھی سی سہیلیاں بنا لینا۔" ابا نے اسے سائیکل سے اتار کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اسے اسکول کے گیٹ کے اندر کرنے آئے۔

چھٹی کے وقت تمہیں لینے آؤں گا۔

تارا۔ اجنبی ماحول اور لوگوں میں حیران سی ہو کر اِدھر اُدھر تکنے لگی۔

پھر اسکول لگنے کا گھنٹہ بجا۔ اسے بھی کلاس کی ٹیچر نے کلاس میں لا بٹھایا۔ پوری کلاس ننھی منی اس جتنی بچیوں سے بھری پڑی تھی۔

لیکن پھر بھی تارا کا کلاس میں جی نہ لگ رہا تھا۔ اسے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یہ روشن روشن اجالوں۔ بڑی بڑی کھڑکی اور دروازوں والی کلاس ایک جیل خانہ لگ رہی تھی۔

بالکل بچوں کی جیل جیسی۔

پھر وہ اپنی جگہ پہ بیٹھے بیٹھے منہ بسورنے لگی۔ اچانک اسے اماں یاد آنے لگیں گھر یاد آنے لگا۔ سہیلیاں یاد آنے لگیں۔

تارا کب اماں سے اس طرح دور ہوئی تھی۔ اسے گھر میں رہنا اچھا لگتا۔ لیکن چند گھنٹے اسکول بھیج کر ابا نے اس پر ظلم تو کیا تھا۔

ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اور استانی کی نظر اس پہ پڑ گئی۔

ارے ننھی کیا ہوا تمہیں۔؟ کیوں رو رہی ہو۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ

کرتارا کے پاس چلی آئیں۔

اماں کے پاس جاؤں گی۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یوں بھی اسکول کا پہلا دن تھا۔ شروع شروع بچے اسی طرح ہی روتے تھے۔ استانی تارا کو نصیحت کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد چھٹی ہو جائے گی۔ پھر گھر چلی جانا۔ تم تو کتنی پیاری بچی ہو۔ اور پیارے بچے رویا نہیں کرتے۔

لیکن تارا کسی بہلاوے میں نہ آئی۔ اب تو اس نے زور شور سے رونا شروع کر دیا تھا۔ دیکھو اس کلاس میں تم سے چھوٹی بھی بچیاں ہیں۔ وہ تو نہیں رو رہی ہیں۔ استانی نے سچ ہی کہا تھا۔

تارا تو سات برس کی ہو گئی تھی۔ اور پہلی جماعت میں داخل ہوئی تھی۔ اتنی عمر اس نے گھر میں کھیلتے گذار دی تھی۔

لیکن اب بھی اس کا دل پڑھنے کی طرف مائل نہ تھا۔

اور پھر آج کا دن بھی تارا کو بے حد برا لگ رہا تھا۔

کھیل کود میں تو اسے دن گذر جانے کا پتہ نہ لگتا۔ لیکن اسکول میں اس سے گھنٹے بھی نہ گذارے جا رہے تھے۔

پل پل گن کر وہ چھٹی کا انتظار کرنے لگی۔

آخر تارا کے صبر آزما انتظار کے بعد۔ جب پرشور آواز کے ساتھ اسکول کی چھٹی کا گھنٹہ بج اٹھا۔ تو تارا کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اس طرح اس نے سکون کا لمبا سا سانس لیا۔ جیسے ایک بڑی قید سے اُسے رہائی مل رہی ہو۔

باہر اسکول کے گیٹ پر جلتی تیز دھوپ میں ابا سائیکل لئے اس کے منتظر تھے۔ کیا پڑھا آج میری بیٹی نے۔ ؟۔ ابا نے اسے پیار کرتے سوال کیا۔

لیکن تارا کا موڈ تو بڑی طرح خراب تھا۔

منہ بنا کر بولی کچھ بھی نہیں۔

ابا کو روٹھی روٹھی بیٹی کا یہ انداز نہ بھایا۔

وہ چپ ہو گئے۔ انہوں نے تارا کی صورت سے اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ وہ بہت ناخوش ہے۔

گھر پر اماں بے قراری سے تارا کی منتظر تھیں۔

کب سے دروازے پر کھڑی راہ تک رہی تھیں تارا کی۔ تارا نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو یوں گلے لپٹایا۔ جیسے صدی ہو چکی ہو ان کو تارا سے بچھڑے ہوئے۔ تارا رونے لگی۔ اماں کل میں اسکول نہیں جاؤں گی وہ سچ مچ مچلنے لگی۔

ابا کو زندگی میں پہلی بار تارا پر بے تحاشا غصہ آیا۔

جھڑک کر بولے۔ کیسے۔ اور کیوں نہیں جاؤ گی۔ تارا سہم گئی۔ اماں کی گود میں منہ چھپا کر آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

ابا اتنی دور سے دھوپ میں مسافت طے کر کے اسے اسکول

لینے گئے تھے۔ پھر اسے گھر پہنچا کر انہوں نے پھر واپس کام پر جانا تھا۔

تارا کی پڑھائی کی خاطر وہ ہر تکلیف اٹھانے پر تیار تھے۔ انہوں نے اپنے کتنے پیسوں کا بھی۔ تارا کی پڑھائی کی وجہ سے خون کیا تھا۔ اس کے لئے کتابیں کاپیاں۔ پنسلیں۔ بستہ۔ جوتے۔ کیا کچھ نہ لائے تھے وہ اور تارا پڑھنے کی چوری کر کے اب ان کو یہ صلہ دے رہی تھی

تارا کو جھڑک کر ابا اپنی سائیکل اٹھا کر دفتر کے لئے پھر چل پڑے۔ اور تارا اماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اماں نے اس کے لئے دوپہر کا کھانا بھی آج بہت اچھا پکایا تھا۔ اس کی پسند کی چیزیں۔ پیار سے تارا کو بہلانے لگیں۔ تمہارے ابا کو ارمان ہے تمہیں پڑھانے کا۔ کچھ تو پڑھ لے تارا۔

آج پہلا دن تھا نا۔ اس وجہ سے تیرا دل نہ لگا۔

رفتہ رفتہ تو بہل جائے گی۔

شام کو ابا آئے تو تارا کے لئے۔ چھوٹا سا ٹفن بوکس رنگ برنگی تصویروں والی کتابیں۔ رنگ برنگی پنسلیں۔ نہ جانے کیا کیا اٹھا لائے۔

تارا کو ان دنوں۔ صحیح معنوں میں الف۔ کا۔ نام ب بھی پڑھنا نہ آتا تھا۔

ہاں بس کتابوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر وہ خوش ہو جاتی تھی۔ میری تارا خوب پڑھے گی۔ پڑھ لکھ کر جب یہ قابل ہو جائے گی۔ تو پھر ہم اس کا بیاہ کسی شہزادے سے کر دیں گے۔ ابا تارا کو پڑھائی

میں مائل کرنے کے لئے طرح طرح کا لالچ دینے لگے۔

لیکن تارا کو تو بس ابا کی وہ بات یاد رہ گئی۔ شہزادے سے بیاہ دیں گے۔ اس شہزادے سے۔ جو پریوں کے دیس میں رہتا ہے۔ ہر ایک کا ہمدرد ہوتا ہے۔ دیوؤں اور جنوں سے لڑتا ہے وہ سوچ میں پڑ گئی۔

اس شہزادے کی کہانی اس کی فرمائش پر اکثر رات کو ابا اُسے سنانے لگے۔ اور وہ یہ کہانی سنتے سنتے سوجایا کرتی تھی۔

لیکن شہزادے سے بیاہنے کے لئے۔ ابا نے شرط بھی کیسی کڑی رکھی تھی۔ خوب پڑھنے لکھنے والی۔

"اونہہ۔ اس کا جی اچانک شہزادے سے بیزار ہو گیا۔ نہ بابا ہم نے نہیں کرنا کسی شہزادے سے بیاہ۔

اس زمانے میں اس کے ناپختہ ذہن کی وہ سوچ بھی عجیب سی تھی۔ تارا۔ روزانہ اسکول جاتے ہوئے رونے لگی۔ تڑپنے لگی۔ مچلنے لگی۔ ابا کا کوئی لالچ اسے رام نہ کر سکا۔

تارا کا دل اسکول میں لگائے نہ لگا۔

وہ حد درجہ پڑھائی کی چور تھی۔ دوسرے اماں اس کی حمائتی تھیں۔ ان کے نزدیک ابا زبردستی کر کے تارا پر ظلم کر رہے تھے۔

تارا اسکول جاتے ہوئے رو رو کر ہلکان ہو جاتی۔ اماں کا پلو سختی سے تھام لیتی اماں کی ممتا بے قرار ہو جاتی۔

اے خاک پڑے۔ ایسی پڑھائی پر۔

بچی کی جان سے زیادہ پڑھائی ہوگئی۔ وہ تارا کو گود میں چھپا لیتیں۔

ایسی محبت۔ اس کے حق میں بری ہوتی۔

جاہل رہے گی عمر بھر۔ ابا بیٹی کی جہالت کے احساس سے تڑپ جاتے۔ رہنے دیں۔ اسے جاہل۔ یہ جاہل ہی بھلی۔

ابا اماں ہیں چل جاتی۔

اماں وہی الفاظ دہراتیں۔ کیا اس سے ملازمت کروانی ہے۔

پھر بھی ابا کا دل تارا کو پڑھانے کو مچلتا۔ اتنا نے خدشے ان کے دل میں آنے لگتے۔ پڑھائی تو ایک انمول خزانہ ہوتی ہے۔ اور خزانہ چاہے کس قسم کا بھی ہو۔

سمیٹ لینا مفید ہوتا ہے۔

لیکن کیا کرتے۔ تارا خود ہی جاہل رہنا چاہتی تھی۔

اور جاہل رہنا شاید اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ ابا قسمت کے لکھے کو کس طرح مٹا سکتے تھے۔ اور پھر دوسری طرف تارا کی اماں کب بیٹی کو پڑھانے کے حق میں تھیں۔

دو دن اسکول جا کر مرجھانے لگی۔ میری نازک کلی۔ بیمار پڑ گئی تو کیا کرو گے تم۔

وہ تارا کا بھیگا بھیگا چہرہ چوم چوم کر کہتی تھیں۔

اور پھر۔ ابا کے سپنے خاک میں مل گئے۔

تارا نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ وہ پھر ہم جولیوں کے ساتھ مل کر گڑیوں سے کھیلنے لگی۔ ہنڈیا پکانے لگی۔ گڑیوں کے کپڑے سینے لگی۔ گرہستی کے اُسے سارے کام کرنے خوب آتے تھے۔ بغیر کسی کے سکھائے ——

ابا نے صبر کر لیا۔

ماں جاہل۔ باپ ان پڑھ۔ تو بیٹی کس طرح جاہل نہ رہتی۔ یہ ان کے دماغ کی سوچ تھی۔

اور تارا۔ گڑیوں کا بیاہ رچاتے رچاتے۔ خود بھی بیاہنے کے قابل ہونے لگی۔

گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ تارا جوان ہوگئی۔

بے حد خوب صورت۔ بے حد حسین۔ کچھ شوخ سی کچھ چنچل سی۔ بس ہر دم اس کے لبوں پر ہنسی رہتی۔

اس کی یہ بے وقت کی ہی ہی۔ اماں کو نہ بھاتی۔ وہ اکثر تارا کو ٹوک دیا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کے یہ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ تارا۔

اماں اور ابا تو اب بڑھاپے کی سرحد کو پہنچ چکے تھے۔

ابا ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ تنخواہ کے بجائے ان کو اب پنشن ملا کرتی تھی۔ لیکن ابا نے اتنا کچھ جمع ضرور کر رکھا تھا۔ کہ اپنی لاڈلی تارا کو شان سے بیاہ سکیں۔ خوب جہیز دے سکیں۔

لیکن اپنی عمر کے اس دور سے لاپروا تارا اب بھی لاابالی فطرت کی تھی۔ اماں نے اس کا گلی میں نکلنا اب بند کر دیا تھا۔

اس کی ہمجولیاں بھی اب بڑی ہو گئی تھیں۔ سب پر ان کے گھر والوں کی طرف سے پابندی لگ گئی تھی۔

لیکن تارا کو کب سہیلیوں کے بغیر قرار تھا۔ آنگن کی پتھریلی دیوار کے نیچے کرسی رکھ کر وہ دیوار سے جھانک کر چمن۔ سے باتیں کیا کرتی

چمن اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ لیکن پھر اچانک چمن کے ابا کو اپنے آبائی وطن کی یاد آئی۔

اور وہ گھر چھوڑ گئے ـــ چمن کی منگنی انہوں نے اپنوں میں کی ہوئی تھی۔ اس کو وہاں جاکر بیاہنا تھا۔

چمن کا منگیتر بہت پڑھا لکھا تھا۔ اس وجہ سے چمن نے بھی چند جماعتیں پڑھ لی تھیں۔

چمن کے جانے کے بعد۔ تارا بے حد اداس ہو گئی۔

اس گھر میں نئے آنے والے اُسے ایک دم اچھے نہ لگے۔ اب تارا کھیلنا کودنا بھول کر اماں کے ساتھ گھر کے کام دھندوں میں لگ گئی۔

گھر میں جھاڑو دیتی۔ کھانا پکاتی روٹی پکاتی۔ کپڑے سیتی۔ وہ کام جو ایک گھریلو لڑکی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

وہ تو سب کے سب تارا کو آتے تھے۔

تارا جس دن کھانا پکاتی۔ اس دن بقول ابا کے۔ وہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھا لیتے ہیں۔ یہ باتیں وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے کیا کرتے اور تارا خوش ہو جاتی۔

اب اس نے طرح طرح کی فرمائشیں کر کے ابا کو تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ اب تو وہ ابا کی خدمت کیا کرتی ـــ بغیر کہے ان کے پیر دباتی سر دباتی۔ ابا کو اب اکثر کھانسی رہنے لگی تھی۔

ان کے لئے جوشاندہ بناتی۔ وقت پر دوائی دیتی۔

اور ابا اکثر اس سے یہی کہتے۔ میری عادت اتنی خراب نہ کر بیٹی۔ اب تو تیرے پرائے گھر جانے کے دن آگئے ہیں

پھر کون کرے گا میری خدمت۔

اور ابا کی اس بات پر۔ تارا کو رونا آنے لگتا۔

نہیں جانا ہیں نے پرائے ورائے گھر۔ اس کا دل اس سوچ سے زخمی ہونے لگتا کہ وہ کبھی۔ اماں اور ابا کا گھر چھوڑ کر دوسرے گھر چلی جائے گی۔

لیکن تارا کو دوسرے گھر کی دیکھنے کی اب اماں کو سب میں بڑی آرزو تھی۔ تارا اب گذرتے وقت کے ساتھ ان کو اپنے آنگن میں بری لگتی تھی۔

تارا نے جوانی کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا تو۔ اماں کے دروازے ہولے ہولے بجنے لگے۔ کتنے گھرانے۔ تارا سے اپنا گھر روشن کرنا چاہتے تھے۔ آباد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اماں کو کوئی رشتہ ڈھنگ کا نہ لگتا۔

ان کو تو بیٹی کے لئے بڑا گھرانہ چاہیئے تھا۔

ننگے بھوکے گھر میں وہ بیٹی کو دینا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ تارا کو ایسے گھر کی روشنی بنانا چاہتی تھیں۔

جہاں ان کی تارا سچ مچ رانی بن کر رہے۔

جس طرح اس گھر میں رہتی تھی۔

ماں باپ نے تو اسے شہزادیوں کا سا رتبہ دے رکھا تھا۔

وہ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتی تھی۔ اس کے کپڑے درزی کے یہاں سلا کرتے

تھے۔ پہلے تو اماں اسے چولہے کے پاس بھی نہ آتے دیتی تھیں۔
میری چندا کا ہاتھ جل جائے گا۔
نہ گڑیا تم آگ کے پاس مت بیٹھو۔ گرمی کے دن ہیں طبیعت خراب ہو جائے گی لیکن گڑیاؤں کی ہنڈیاں پکاتے پکاتے اور ان کے کپڑے سیتے سیتے۔ تارا کو سب کچھ آگیا تھا۔
اب اُسے دوسرے گھر جانا تھا۔
اس وجہ سے ابا نے اماں کو ٹوک دیا تھا۔ ان کے نزدیک اگر تارا میں کام کی عادت نہ پڑی۔ تو یہ اس کے مفاد میں ہی بُرا تھا۔
تارا کیلئے کتنے ہی رشتے آئے۔ لیکن اس کی قسمت تو فرید سے بندھی تھی۔ کسی اور جگہ بات کس طرح بنتی۔
فرید کی ماں۔ کبھی اماں کے محلے میں رہا کرتی تھیں۔ اس وقت جب تارا پیدا بھی نہ ہوئی تھی۔ اور اماں کو اولاد کی شدید تمنا تھی۔
فرید کی اماں کے اس وقت دو بیٹے تھے۔ فرید اور شہید۔ بچپن میں اماں نے فرید کو بیٹا بنا لیا تھا۔
وہ دن بھر ان کے پاس رہتا۔ وہ اسے نہلاتیں دھلاتیں۔ کپڑے بدلواتیں۔ اپنے پاس سلا بھی لیتیں۔
لیکن پھر فرید کے ابا کا دوسری جگہ تبادلہ ہو گیا۔ وہ چلے گئے۔ فرید سے بچھڑ کر اماں کتنے دنوں اداس رہیں۔
لیکن پھر اللہ میاں نے فوراً ان کی جھولی اولاد سے بھر دی۔ تو وہ

فرید کو بھول گئیں ۔

لیکن ایک عرصے بعد۔ اماں کی ایک ملنے والی کے یہاں تقریب میں اماں اور فرید کی اماں کا ٹکراؤ ہوا۔ تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئیں۔ خوب گلے ملیں۔ گلے شکوے ہوئے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھا گیا۔ اتنے دنوں سے دونوں ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر تھیں۔

فرید کی اماں تو تارا کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

اس وقت آتشی جوڑے میں تارا لگ بھی غضب کی رہی تھی۔ فرید کی اماں کو وہ بے حد بھا گئی۔

پھر ان دنوں ان کو اپنے فرید کے لئے دلہن کی تلاش بھی تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں۔ تارا کو منتخب کر لیا۔

فرید کی ماں دوسرے دن ہی سوالی بن کر اماں کی دہلیز پر پہنچ گئیں۔ ان کا سواگت اماں نے بڑی خوشی سے کیا۔

تارا بھی ان کی خاطر مدارات کے انتظام میں لگ گئی۔ ہلکے آسمانی کپڑوں میں نکھری نکھری تارا۔ ان کو کل سے زیادہ بھائی۔ ان کو تو سچ مچ تارا کا ہر انداز بھا رہا تھا۔ دل کرتا تھا۔ اس کی موہنی صورت آنکھوں میں چھپا لیں۔

تارا کو تو میری بیٹی بنا دو۔ انہوں نے مدعا ظاہر کیا۔ میری کوئی بیٹی نہیں اس کے دم سے میرے گھر میں اجالا ہو جائے گا۔

فرید کی ماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ چار بیٹے تھے۔ پھر ایک عرصہ ہو گیا

تھا ان کو بیوہ ہوئے۔ اولاد کو بڑی مشکلوں سے انہوں نے پروان چڑھایا تھا۔

اب فرید پڑھ لکھ کر اچھی ملازمت پر فائز تھا۔ گھر کا خرچہ وہی اٹھائے ہوئے تھا۔ اور بھائی تو ابھی پڑھ ہی رہے تھے۔

ان کی دکھ بھری کہانی سن کر اماں بھی فرید کی اماں کے ساتھ آنسو بہانے لگیں۔ پھر اماں نے فرید کو کبھی بیٹا بنایا تھا۔

اس کو اپنی بھرپور چاہت دی تھی۔

یہ چاہت اب بھی اماں کے دل میں موجود تھی۔ پھر وہ کس طرح اسے ٹھکراتیں ——

فرید اماں سے ملنے آیا۔

بے حد وجیہہ خوب صورت شرمیلا شرمیلا یہ نوجوان اماں کو بے حد بھایا۔ وہ تو اس پر صدقے واری ہو گئیں۔

"تارا کو فرید کے سامنے آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور اسے پتہ بھی نہ تھا۔ وہ کیوں آیا ہے۔ وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی اس کے لئے چائے تیار کرتی رہی۔ پکوان تلتی رہی۔

اور پھر اماں نے فرید کو قبول کر لیا۔

تارا فرید سے منسوب ہو گئی۔

تارا کی شادی کی تیاری میں کتنے دن لگ گئے۔ اب اماں ہر دم مصروف رہتی تھیں روز ابا یا پڑوسن کے ساتھ بازار جایا کرتیں۔

ابا بھی روز کچھ نہ کچھ سامان خرید لاتے۔

گھر سامان سے بھرنے لگا۔ جوڑے زیور تیار ہونے لگے۔

اور تارا اداس ہونے لگی۔ اماں ابا کی جدائی میں آنسو بہانے لگی۔ اسے کون سے دوسرے شہر جانا تھا۔

فرید کا گھر اس کے گھر سے زیادہ دور بھی تو نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اسے اپنا گھر چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔ بے پناہ دکھ۔

اس احساس سے اسکا دل زخمی ہو رہا تھا۔

اماں اسے اداس دیکھتیں۔ تو ان کی آنکھیں چھلک پڑتیں۔ بیٹی کے دم سے ان کا گھر آباد تھا۔ زندگی میں کتنی ہلچل تھی۔

یہ چلی جائے گی۔ یہ گھر سچ مچ کاٹنے کو نہ دوڑے گا کیا؟ - وہ ابا سے کہتیں۔ وہ خود بجھے بجھے سے تھے۔

پھر بھی اماں کے دل کو بہلانے کے لئے طرح طرح کی باتیں کرنے لگتے۔ کون کہتا ہے۔ کہ ہم اکیلے رہ جائیں گے۔

بھئی ہمارے گھر میں تو اور رونق ہو جائے گی۔ بیٹی آیا کرے گی۔ داماد آیا کرے گا۔ پھر ہم اپنے نواسے نواسیوں کو گود میں کھلایا کریں گے۔

وہ ابھی سے مستقبل کے سہانے سپنوں کو اپنی بوڑھی آنکھوں میں بسائے ہوئے تھے۔

اور پھر وہ دن آ گیا۔

تارا پرائی ہو گئی۔

اپنے گھر کے آنگن کو چھوڑ کر دوسرے آنگن میں جا بسی۔

یہ آنگن اس آنگن سے مختلف تھا۔

وہاں صرف ماں باپ تھے۔ ان کا پیار تھا۔ چاہت تھی۔ بے فکری تھی۔ جو من میں آتا کرتی تھی۔ وہ وہاں پیدا ہوئی تھی۔ اس آنگن میں جوان ہوئی تھی۔ لیکن اس آنگن میں۔

وہ دوسرا روپ لے کر آئی تھی۔

اس گھر کی بہو بن کر۔ دلہن بن کر۔ بیوی بن کر۔ بھابی بن کر۔ وہاں صرف وہ بیٹی تھی۔

یہاں۔ اتنے ڈھیر سے نام ہو گئے تھے اس کے۔

لیکن اس آنگن میں بھی۔ اس کے لئے چاہت ہی چاہت تھی۔

ایک ماں کے بجائے اب اس کی دو مائیں ہو گئی تھیں۔ کوئی بھائی اللہ میاں نے نہیں دیا۔ تو کیا ہوا۔ اب اسے اکٹھے تین بھائی مل گئے تھے۔

اور پھر فرید۔

محبت کرنے والا چاہنے والا شوہر۔

تارا خود پہ ناز کرنے لگی۔ غرور ہو گیا اُسے اپنے آپ پر۔

فرید کی اماں نے اسے گڑیوں کی طرح کتنے دنوں بس پلنگ پہ بٹھائے رکھا۔ یوں اس طرح پاؤں بھی اتارتی۔

تو وہ روکتی تھیں۔

لیکن پھر یہ سب تارا کو بُرا لگنے لگا۔ وہ تو گھر سنبھالنے آئی تھی۔ خدمت کرنے آئی تھی۔ کروانے تو نہیں۔

وہ کام کرنے لگی۔ فرید کی اماں روکنے لگیں۔ نہیں اماں۔ اب میں آگئی ہوں نا بیٹی بن کر۔ پھر آپ کو کام کرنے نہیں دوں گی۔

جس گھر میں بیٹیاں بڑی ہو جاتی ہیں۔ وہاں مائیں کام کرتی بھلی نہیں لگتی ہیں اور پھر اس لمحے اسے اپنی ماں بھی یاد آنے لگتیں۔

حالانکہ وہ فرید کے ساتھ روز اماں سے ملنے جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کا جی نہ بھرتا۔ وہ دن بھر اکثر اماں کے لئے اداس رہتی۔ لیکن پھر گذرتے وقت کے ساتھ وہ عادی ہو گئی اس زندگی کی۔ گھر کا سارا کام اس نے سنبھال لیا۔ ہنسی خوشی سارا دن کام کرنے میں مصروف رہتی۔

سب اس سے بے حد خوش تھے۔ فرید۔ اماں۔ چھوٹے بھائی۔ وحید اور رشید لیکن۔

تارا کو فرید کا بھائی شہید عجیب سی فطرت کا لگتا۔ اس نے ایک دفعہ بھی تارا سے بات نہ کی تھی۔

"وہ حد درجہ سنجیدہ اور خاموش فطرت کا لڑکا تھا۔ گھر پہ رہتا تو صرف پڑھنے میں مصروف رہتا۔

ہر دم اس کے ہاتھ میں کتاب نظر آتی۔ وہ میڈیکل میں پڑھتا تھا۔ مستقبل کا ڈاکٹر تھا۔

یہی وجہ تھی۔ اماں بھی اس کا خاص خیال کرتی تھیں۔ اپنے دوسرے مکان کا آنے والا کرایہ۔ وہ صرف شہید کی تعلیم پر خرچ کر ڈالتی تھیں۔

ان کو امید تھی۔ شہید ڈاکٹر بن کر ہزاروں لاکھوں کمانے لگے گا۔

شہید کو نہ جانے تارا سے کیوں بیر تھا۔

اس کی ہنستی مسکراتی صورت دیکھ کر اس کا منہ بن جاتا۔

ایک دو بار اس نے تارا کو ہنسنے پر ٹوک بھی دیا تھا۔

اور پھر ایک دن۔ وہ گھر چھوڑ کر ہوسٹل بھی چلا گیا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد وطن چھوڑ گیا۔ کیوں کیا تھا اس کے دل میں۔

یہ کسی کو بھی نہ معلوم تھا۔

اس کی اماں کے ارمانوں کا خوابوں کا خون ہو گیا۔ کیسا نافرمان نکلا تھا شہید جس کی خاطر۔ انہوں نے اپنی ساری پونجی لٹا دی تھی۔ اب آخر میں مکان تک بیچ ڈالا تھا۔ اس امید پر۔

کہ ان کا ڈاکٹر بیٹا۔ ایسے دس مکان خرید لے گا۔

لیکن اماں کے دل کو جدائی کا زخم بخش کر وہ کہیں اور گم ہو گیا تھا۔

اس کی جدائی میں اماں سچ مچ گھلنے لگیں۔ چارپائی سے لگ گئیں۔

شہید کے جانے سے کچھ دنوں گھر کا ماحول بدلا بدلا رہا۔

پھر حالات معمول پر آ گئے۔

نوید کے بعد چاندنی بھی تارا کی گود میں اتر آئی۔

گھر کا سویا سویا ماحول جاگنے لگا۔

اماں بھی بچوں میں بہل گئیں۔

لیکن یہ بہلاوا چند روز کا تھا۔

ایک انقلاب آیا۔ طوفان آیا۔ اور اس گھر کا سب کچھ اپنے ساتھ لیتا گیا کہ کسی کو کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔

فرید کی ماں۔

شہید کی جدائی کے بعد فرید کی عمر بھر کی جدائی نہ سہار سکیں۔ پلنگ پر گر پڑیں تارا چلتی پھرتی لاش بن گئی۔

فرید کے گھر کی ساری ذمہ داری۔ اس کے ناتواں کاندھوں پر آ پڑی۔ اس نے کب ایسے دکھ دیکھے تھے۔

اس نے کب کوئی دکھ سہا تھا۔

یہ پہلا پہلا دکھ۔ جو اس پر ٹوٹا تھا۔ کتنا بڑا تھا۔ دکھ کے ایک وسیع دریا کے مانند جس کے کناروں کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

کچھ اس طرح تارا کے دکھ ختم ہوتے دکھائی نہ دیتے تھے۔

تارا نے اپنی ذات کو فراموش کر ڈالا۔

اب اسے جینا تھا۔ بچوں کے لئے۔ ماں باپ کے لئے۔ فرید کے

بھائیوں کے لئے۔ جو اس کے بھائی بھی تو تھے۔ تارا ہنسنا بھول گئی - بولنا بھول گئی۔

بے حس مجسمہ بن گئی۔ اس نے مرنے کے بعد فرید سے بے وفائی نہ کی۔ اس کا گھر نہ چھوڑا۔ ماں کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا۔

شہید نے ایک عرصے پہلے لندن سے خط لکھا تھا۔ وہ خوش تھا۔ اور اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ اماں جیسے شہید کے خط کے انتظار میں جی رہی تھیں۔

پھر ایسی آنکھیں بند کیں۔ کہ کسی کے اٹھائے نہ اٹھیں۔

اماں مر گئیں۔ اب اس گھر میں تارا کا رہ گیا گیا تھا۔

فرید کے بھائی اب اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔ وہ خود اپنا سہارا بن سکتے تھے۔ اس گھر کو اب تارا کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اماں ابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پھر گھر میں ہمیشہ کے لئے لے آئے۔ جہاں سے وہ دلہن بن کر نکلی تھی۔ وہ گھر جو اس کے لئے پرایا ہو گیا تھا۔

اب پھر اس کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔ لیکن والیسی تارا کی نہیں۔ تارا کی بے حس چلتی پھرتی لاش کی ہوئی تھی۔

جس کے دل میں نہ کوئی ارمان تھا۔ نہ حس۔ نہ امنگ۔

سب کچھ تو اس کا لٹ گیا تھا۔ اس کا۔

کیا بچا تھا اس کے پاس۔

غم کے گھپ اندھیرے۔ جن میں ڈوب کر اس نے زلیست کے دن پورے کرنے تھے۔

دن گذرے راتیں گذریں۔ گذرتے دن ماہ بن گئے۔ ماہ سال ۔ زمانے کی گردش جاری رہی۔

اور گذرتے دنوں کے ساتھ۔ تارا فرید کے بغیر زندگی گذارنے کی عادی ہو گئی۔ اُسے صبر آ گیا۔ وہ پھر دن کے دھندوں میں الجھ گئی۔ لیکن وہ خوش رہنا بھول چکی تھی۔ فرید اس کی ساری خوشیاں اپنے ساتھ کفن میں لپیٹ کر لے گیا تھا۔

دل اب سکون کو ترس گیا تھا۔ راتیں بے خواب ہو چکی تھیں۔ فرید کے ساتھ گذر اچھی طرح ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد۔ تارا فکر معاش میں مبتلا ہو گئی۔ دو بچوں کو پالنے اور پروان چڑھانے کے لئے ڈھیر سے پیسوں کی ضرورت تھی۔

اور تارا جانتی تھی۔ یہ بار اس کے ناتواں ابا بھی نہ اٹھا سکیں گے۔ ابا ان دنوں بیمار تھے۔ کھانسی مستقل طور پر ان کی جان سے چمٹ گئی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے کھانستے رہتے۔ کبھی کھانسی اتنی شدید ہو جاتی کہ ابا کا سانس حلق میں اٹک اٹک جاتا۔ ایسے میں اماں کے ہاتھ پیر پھول جاتے۔ اور تارا کے ہوش و حواس جاتے رہتے۔ ابا تم۔ تم غموں میں اضافہ نہ کر جانا۔

ہمارا ساتھ نہ چھوڑ جانا۔ تم منہ موڑ لو گے تو پھر۔ ہم کس طرح جییں گے۔ وہ محبت سے ابا کے پیروں پر سر رکھ دیتی۔ دل ہی دل میں ان سے نہ جانے کیا کیا کہنے لگتی۔ ابا کے پیر اس کے آنسوؤں سے بھیگنے لگتے تو ابا کو احساس ہوتا کہ ان کی پگلی سی جذباتی سی بیٹی کیا کر رہی ہے۔ وہ خود بیقرار ہو جاتے۔ میری بیٹی تو کیوں رو رہی ہے۔ ابا کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔

"بیٹی تیرے آنسو۔ باپ کے دل کے دکھ بڑھاتے ہیں" ابا غمزدہ ہو جاتے۔ لیٹے لیٹے کبھی کبھی آنکھیں بند کر لیتے۔ ان کے آنسو تارا نہ دیکھ لے"

اور تارا کب ابا کو دکھ دینا چاہتی تھی۔ وہ اپنے سفید دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگتی۔

اماں ابا کا دل کا بہلاوا اب نوید اور چاندنی تھے۔ نوید بڑھتی عمر کے ساتھ حد درجے شوخ ہوتا جا رہا تھا۔

چاندنی بھی اب بولنے لگی تھی۔ بھاگنے دوڑنے لگی تھی۔ شرارتیں کرنے لگی۔ اور ان دو معصوم بچوں کی شرارتوں نے شوخیوں نے رفتہ رفتہ۔ گھر کی خاموشی کو چاٹ لیا۔ ان بچوں کے دل میں ابھی کوئی ایسی حس پیدا نہ ہوئی تھی۔ کہ وہ ماں اور نانا۔ نانی کے دکھوں کو سمجھ سکیں۔

تارا۔ اماں اور ابا کے لئے یہ دو قدرت کے کھلونے دل کے بہلاوا تھے۔ اس گھر کی رونق تھے خوشیاں تھے۔ ابا کی طبیعت جب بہتر ہوتی۔ تو چاندنی کو گود میں اٹھا کر اور نوید کی انگلی تھام کر دونوں کو باہر لے جاتے۔ کبھی قریب کے پارک میں۔

کبھی چڑیا گھر۔ یا پھر بازار جا کر کبھی غبارے خرید دیتے۔ تو کبھی کوئی اور کھلونا۔ ابا کو وہ دن بھی قریب ہی لگتے تھے۔ جب وہ اس طرح تارا کے لئے بھی کھلونے خرید کر لاتے تھے۔

انسانوں کی زندگی میں کتنے جلدی بڑے بڑے انقلاب رونما ہو جاتے تھے۔ آج وہی تارا دو بچوں کی ماں تھی۔

بے حد ذمہ دار ماں۔ جو ابھی سے اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے پریشان نظر آتی تھی نوید اب گھر سے نکل کر محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا تھا۔

لیکن تارا کو نوید کا اس طرح کھیلنا ناپسند تھا۔ حالانکہ یہ عمر اس کے کھیلنے کودنے کی تھی۔ وہ ابھی پانچ سال کا بچہ تھا۔ بے حد چھوٹا۔ بے حد ناسمجھ۔

لیکن تارا محسوس کرتی۔ گلیوں میں کھیل کر نوید خراب ہو جائے گا۔ بھٹک جائے گا۔

اسے تو اپنے بچے کو بہت قابل بنانا تھا۔ اس کی اٹھان وہ بہت اچھی طرح کرنا چاہتی تھی۔ اسے بالکل مختلف قسم کا انسان بنانا چاہتی تھی۔

اسے خدشہ تھا۔

باہر نکل کر نوید کوئی بری عادت نہ سیکھ جائے۔ اب وہ شام کو گھر کا باہر گلی میں کھلنے والا دروازہ سختی سے بند کر دیتی۔ تاکہ نوید اس کی نظر بچا کر باہر نہ جا سکے۔ نوید تو حد درجے کھلنڈرا تھا۔ امی کی روک

ٹوک پر وہ منہ لبور لبور کر رونے لگتا۔ لیکن تارا کو نوید پہ رحم نہ آتا۔ اب اس نے نوید کو اسکول میں داخل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ویسے بھی اب نوید کی عمر اسکول جانے کی آ گئی تھی۔ اور ساتھ ساتھ تارا کے اعصاب پر ایک فکر بھی سوار ہو گیا تھا۔

بڑھتی مہنگائی کے ساتھ ساتھ اسکولوں کی فیسیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اور تارا کے پاس اتنے روپے کہاں تھے جو اسکول کی فیس اور اخراجات پورے کرتی۔

ویسے اب گھر وہی چلایا کرتی تھی۔ اب گھر کا خرچہ ابا اماں کو دینے کے بجائے تارا کو دیا کرتے تھے۔ تاکہ تارا اپنی ہر ضرورت بلا جھجک پوری کر سکے۔

تارا حد درجہ کنجوسی کرتی۔ لیکن پھر بھی مہینے کے آخر میں اس کے پاس کچھ نہ بچتا۔

ان دنوں تارا۔ حد درجے پریشان تھی۔ فرید کوئی دولت مند نہ تھا۔ جو ورثہ چھوڑ جاتا۔ فریدجو کماتا تھا وہ گھر میں ختم ہو جاتا۔ پھر فرید نے ابھی مستقبل میں کہاں جھانکا تھا۔ موت نے اُسے آگے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔

تارا سوچتی اس کے سپنے کس طرح پورے ہوں گے۔ بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا۔ افسر بنانے کا۔ بیٹی کو کالج میں پڑھوانے کا۔ یونیورسٹی میں پڑھوانے کا۔ پہلی سیڑھی تو اسکول میں داخلہ تھا۔ وہ بھی اُسے مشکل

لگ رہا تھا۔ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے تارا کے خیالات بہک جاتے وہ گم ہو جاتی۔ تارا کبھی تمہاری اماں نے تمہارے ابا نے بھی تو تمہارے لئے یہ سپنے دیکھے تھے۔ لیکن تم نے تو ان کے ارمانوں میں آگ لگا دی تھی۔ اگر اس طرح تمہارے ارمان خاک میں مل گئے۔ خواب بکھر گئے۔ تو۔ تو۔ پھر کیا ہو گا۔ نہیں۔ نہیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ یوں اس طرح جیسے سچ مچ اس کی اولاد نے نافرمانی کی ہو اس کے ساتھ۔ میں ایسی بد نصیب نہیں ہو سکتی۔ میری قسمت مجھے ہر قدم پر دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میرے بچے میرے خوابوں کی تعبیر بنیں گے۔ وہ آنگن میں کھیلتی چاندنی پر نظریں جما دیتی۔ چاندنی کو بھی۔ گڑیاؤں سے کھیلنے کا شوق تھا۔

جیسا ہر لڑکی کو بچپن میں ہوتا ہے۔ کبھی تارا بھی تو صرف ان گڑیوں میں گھری رہتی تھی۔ اور یہ گڑیائیں —

یہ گڑیائیں —

اس کی راہ کی رکاوٹیں بن گئی تھیں۔ کاش۔ کاش میں تعلیم حاصل کر لیتی تو۔ پھر زندگی کی راہیں اتنی تاریک نہ ہوتیں۔ تعلیم کے سہارے میں بہت کچھ کر سکتی تھی۔ یوں خالی ہاتھ تو نہ بیٹھتی۔

ضعیفی کے دور میں۔ اماں ابا کے دل کا بوجھ نہ بنتی۔

وہ رونے لگتی۔ رونے سے دل پہ چھایا گرد و غبار چھٹ جاتا۔

تارا کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اولاد کی خاطر اور پھر اس نے۔ دوسروں کے کپڑے

سینے کا فیصلہ کر لیا۔

اسے کافی اچھی سلائی آتی تھی۔ اماں اور ابا کے کرتے وہی سیتی تھی۔ نوید اور چاندنی کے کپڑے سیتے سیتے اس کا ہاتھ اور صاف ہو گیا تھا۔

پھر اس کے پاس جہیز کی بالکل نئی بجلی سے چلنے والی مشین بھی تھی۔ کتنی جلدی تارا نے مصروفیت کا منصوبہ بنا لیا۔ لیکن جب اس نے اماں کے سامنے زبان کھولی۔ تو اماں سچ مچ تڑپ گئیں۔

نہیں تارا تو دوسروں کے کپڑے سلائی کرے گی۔ تو۔تو۔ جسے ہم نے رانیوں کی طرح پالا۔ ہر دکھ درد سے بچانا چاہا۔

لیکن تیری قسمت کے اندھیروں کو ختم کرنے کا کام ہمارا نہ تھا۔ یہ تو تجھے قدرت نے بخشے ہیں۔ لیکن۔ تارا میں تجھے یہ مشقت نہ کرنے دوں گی۔ اماں زاروقطار رونے لگیں۔

اور تارا ان کو دکھ سے دیکھنے لگی۔ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اماں۔ تقدیر تو سچ مچ کی رانیوں کی بھی پل بھر میں بگڑ جاتی ہے۔ اماں مجھے معلوم ہے۔ آپ نے مجھے بڑی تکلیفیں اٹھا کر پالا۔"

لیکن ہر عورت جب ماں بنتی ہے۔ تو اسے اولاد کے لئے تکلیفوں اور دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اماں مجھے بھی اپنے بچوں کے لئے یہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔

ہم ابھی مرے نہیں تارا۔ زندہ ہیں۔ ابا نے بھی کمزور آواز میں

اسے مخاطب کیا۔

لیکن میرے ابا۔ میں۔ میں مصروف رہنا چاہتی ہوں۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے۔ میں سچ مچ مر جاؤں گی۔

مرجاؤ ۔ گی ۔ اماں کا دل ہل گیا۔ کتنی بڑی بات کہہ دی تھی تارا نے۔ جو تمہاری مرضی آئے کرو۔

اماں نے اسے اجازت دے کر ابا کو بھی چپ رہنے کا اشارہ کردیا اور پھر تارا۔ مشین میں دن رات سیتے سیتے۔ خود بھی ایک مشین بن گئی۔

شروع شروع تو اس کے پاس برائے نام کام آیا۔ لیکن پھر محلے والوں کی مدد سے اسے سلائی ملنے لگی۔ ساتھ ساتھ اُجرت بھی۔

کچھ پیسے ہاتھ آئے تو اُسے پیسے کی اور ہوس ہو گئی۔ اب تارا دن رات مشین میں جتی نظر آتی۔ نہ اسے چاندنی پر زیادہ توجہ دینے کا وقت ملتا۔ اور نہ نوید کی تربیت پر۔

نوید۔ اب زیادہ تر گھر سے باہر رہتا۔

گلی کے باہر بڑا سا میدان تھا۔ تارا کا بچپن بھی اس میدان میں اُسے چھوڑ بھاگا تھا۔

اب نوید بھی اس میدان میں کھیل کر دن بہ دن بُری عادتوں کا شکار ہو رہا تھا۔

چاندنی کو تو اماں سنبھالے رہتیں ۔
ویسے بھی لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں سیدھی سادی ہوتی ہیں۔
نوید کے مقابلے میں چاندنی حد درجے بھولی اور سیدھی سادی تھی ۔
ایک شام سورج چھپے دیر ہو گئی۔ تاریکی کے دھند لکے چھانے لگے اور نوید گھر نہ آیا۔ تو مشین چلاتی۔ تارا کو ہوش سا آ گیا ۔
مشین روک کر اس نے باہر نظر ڈالی۔ صحن تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ اور اندھیرا دور کرنے کے لئے۔ اماں نے ننھا مدھم سی روشنی کا بلب بھی جلا دیا تھا۔
" ایک جگہ جم کر بیٹھے بیٹھے تارا کی ٹانگیں سچ مچ اکڑ جاتی تھیں۔ بمشکل اٹھ کر وہ صحن میں آئی۔ نوید اب تک نہیں آیا۔؟ اس نے اماں سے سوال کیا۔ نہیں۔ دیکھ تارا تو نے اس پر سے بالکل ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ بچہ ہے وہ ابھی۔ اس طرح باہر رہ کر بگڑ جائے گا۔
اماں نے سچ بول کر اسے سمجھا دیا۔
نہیں اماں نہیں۔ ایسی بدفال منہ سے نہ نکالو۔
وہ تو میرا بڑھاپا ہے۔ مستقبل ہے۔ خوشیاں ہے۔ وہ تو میرا خزانہ ہے۔ تارا کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ ابا کو رات سے بخار تھا۔ وہ سو رہے تھے۔ تارا خود چادر لپیٹ کر نوید۔ کو تلاش کرنے گلی میں آ گئی۔
گلی کے نکڑ پر اُسے نوید مل گیا۔ اپنی عمر سے دوگنی عمر کے گندے میلے کچیلے لباس والے لڑکوں کے ساتھ۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے وہ فٹ پاتھ

پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ نوید کے ہاتھ میں پتے نہیں تھے۔ وہ اشتیاق سے یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔

تارا کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ اس کا نوید۔ اس ننھی سی عمر میں برائی کے قریب چلا آیا تھا۔

نوید۔ اس نے اس کا بازو پکڑ کر۔ اسے اچانک وہاں سے اٹھا لیا۔

جی امی۔ نوید سہم گیا۔

گھر چلو۔ تارا کے لہجے میں کرختگی تھی۔ غم اور غصہ تھا۔ نوید کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس کی امی نے تو کبھی اس انداز میں اس سے بات نہ کی تھی۔

تارا اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اسے گھر کے دروازے پر لے گئی۔ اندر لے جا کر اس نے نوید پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اس کا پھول سا چہرہ تھپڑوں کی ضرب سے انگارہ ہو گیا۔

نوید بلند آواز میں رونے لگا۔ کیا ہوا تارا۔؟ کیا پاگل ہو گئی ہے تو۔ اماں تارا کو روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔

چاندنی نے بھلا کب اس طرح بھیا کو مار کھاتے دیکھا تھا۔

وہ بھی سہم کر رونے لگی۔ ابا بخار کی کیفیت میں پلنگ سے اٹھ آئے۔

بس کر تارا۔ اماں نے نوید کو اپنی گود میں چھپا لیا۔ اور وہ بھی اماں کو اپنی محفوظ پناہ گاہ سمجھ کر ان سے روتے روتے لپٹ گیا۔

اور تارا کانپنے لگی۔ بیٹی کیا ہوا۔ آخر۔؟۔

ابا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

ابا۔ وہ کانپتے ہوئے۔ ابا کے بیمار وجود سے چمٹ گئی۔ ابا نوید بھٹک جائے گا ابا۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ سختی کی ضرورت ہے۔ وہ روتے ہوئے ابا سے نوید کی شکایت کرنے لگی۔

بچہ ہے۔ بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیل تماشا دیکھنے بیٹھ گیا ہوگا۔

سمجھا دو گی تو سمجھ جائے گا۔ ابا اُسے خود سمجھانے لگے۔ نوید کو مار کر اب خود اس کا دل زخمی زخمی ہوئے جا رہا تھا۔ اتنا افسوس آ رہا تھا اُسے۔ اس نے تو کبھی اس کے پھول سے رخساروں پر غصے میں ہلکی سی چپت بھی نہ لگائی تھی۔

آج بیدردی سے اسے روئی کی طرح دُھنا۔

دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے۔ وہ کمرے میں آکر بے تحاشا آنسو بہانے لگی۔ پھر نوید ڈرا سہما سہما اندر کمرے میں آیا تو۔

وہ اسے بے تحاشا پیار کرنے لگی۔ میں نے اپنے بیٹے کو مارا۔ اپنی جان کو مارا۔ وہ اس کے گال چومنے لگی۔

ننھے منے ہاتھوں کو اپنے گرم گرم آنسوؤں سے تر کرنے لگی۔ لیکن ڈھیٹ نوید اپنی امی سے روٹھا رہا۔

اور اس طرح روٹھے روٹھے سو گیا۔

نہ کھانا کھایا۔ نہ دودھ پیا۔

اور تارا بھی لاکھ اماں کے اصرار پر ایک نوالہ نہ کھا سکی۔ نوید بھوکا

سو گیا تھا وہ کس طرح خود پیٹ کی آگ بجھاتی۔

چاندنی کو اپنے قریب لٹا کر وہ اسے لوری دے دے کر سلانے لگی۔ معصوم سی چاندنی پل بھر میں خوابوں کی وادی میں جا بھٹکی۔

اور پھر تار تار الجھے الجھے خیالات۔ بہکی بہکی سوچیں لئے۔ سونے کی کوشش میں گھنٹوں جاگتی رہی۔

تارا نے نوید پر بالکل پہرے بٹھا دیئے۔ دوسرے ہی دن وہ اُسے اسکول میں داخل کروا آئی۔

نوید اسکول جانے کے نام سے۔ ہونٹ نکال کر منہ لبسور نے لگا:
خبردار جو پڑھنے کے چور بنے تم۔ اسکول تو تم کو ہر حال میں جانا پڑے گا۔ تارا نے سختی سے کہا۔

شام بھی اسے گھر سے نکلنے نہ دیا۔

نوید کے دوستوں نے چپکے چپکے دروازے پر دستک بھی دی تو تارا نے ان کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اور نوید کا ننھا سا دل۔ ماں کی اس بے جا پابندی پر۔ اس کی طرف سے باغی ہونے لگا۔ اس کی عمر کھیلنے کودنے اور شرارتیں کرنے کی تھی۔

اس طرح ایک کمرے میں بیٹھنے کی عادت تو نہ تھی۔ لیکن تارا اس پر سختی کر کے۔ اسے نیک شریف اور قابل بنانا چاہتی تھی۔

اماں سے اس نے صبح ہی گلی کی کتابوں کی دکان سے رنگ برنگی تصویروں والا قاعدہ منگوا لیا تھا۔ اب نوید کے آگے وہی قاعدہ رکھا ہوا تھا۔

اور تارا خود مشین لیئے بیٹھی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھی چاندنی۔ کپڑوں کی رنگ برنگی دھجیوں سے کھیل رہی تھی۔

چل پڑھ نا۔ نوید کو خاموش دیکھ کر تارا نے اسے ٹوک دیا۔

الف سے انار۔ ب سے بکری۔ وہ زور زور سے پڑھنے لگا۔ لیکن اندر ہی اندر وہ کھول رہا تھا۔ آخر جھنجھلا گیا۔ بس پڑھ لیا۔ قاعدہ پرے کر کے وہ اٹھ بیٹھا۔

ارے۔ کیسے پڑھ لیا۔ تجھے یہ پورے دو صفحے آج یاد کرنے ہیں۔ تارا نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اس کی پیٹھ پہ ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

وہ رونے لگا۔

پڑھنے کا چور۔ اگر تو نے پڑھنے سے جی چرایا تو۔ مار مار کر تیری ہڈیاں توڑ دوں گی۔ تارا تو حد درجے سخت طبیعت کی ہو گئی تھی۔ پہلی دفعہ جب اس نے نوید پر ہاتھ اٹھایا تھا تو اسے کتنا دکھ ہوا تھا۔ اس دکھ کے احساس سے وہ رات بھر تڑپی تھی۔ سوئے ہوئے نوید کو اٹھا اٹھ کر پیار کیا تھا۔

لیکن اب تارا کا ہاتھ نوید پہ کھل چکا تھا۔ وہ صبح سے اسے دو چار تھپڑ لگا چکی تھی۔ آج دن بھر اس نے نوید کے کپڑے سیئے تھے۔

باہر کے کام کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔

کل نوید کو اسکول جو جانا تھا۔ لیکن نوید برابر بیزار ہوئے جا رہا تھا۔ اور اس کے اس انداز پر تارا برابر ماضی کی طرف پلٹ رہی تھی۔

لیکن نہیں۔ وہ پڑھائی کے معاملے میں کبھی نرمی نہ برتنے گی۔ اس

کا یہ اٹل فیصلہ تھا۔

دوسرے دن اس نے بڑے پیار سے نوید کو تیار کیا۔ پھر خود اُسے اسکول پہنچا آئی۔ گھر سے اسکول کوئی خاص دور نہ تھا۔

اس وجہ سے تارا اسے دوپہر لینے بھی پہنچ گئی۔

نوید اپنی امی سے روٹھا ہوا تھا۔ وہ بات کرتی بھی تو جواب نہ دیتا۔ تارا کو پھر اس پر افسوس سا آنے لگا تھا۔

گھر آکر اس نے خوب نوید کو پیار کیا۔ آج کھانا بھی تارا نے اس کی پسند کا تیار کیا تھا۔ پھر دوپہر اسے سلا کر وہ خود سلائی میں لگ گئی۔ آج کل وہ ایک منٹ بھی آرام نہ کرتی تھی۔ کام کی زیادتی کا اس کی صحت پر کافی اثر پڑ رہا تھا۔

وہ دن بہ دن لاغر اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

نوید شروع شروع کے دنوں اسکول جاتے ہوئے رویا چلا۔ لیکن تارا کے تھپیڑوں نے اسے راہ راست پر ڈال دیا۔

اب وہ خاموشی سے اسکول جانے لگا۔ گھر آکر سبق بھی یاد کرنے لگا۔ اور شام اب وہ امی کی اجازت پر باہر کھیلنے بھی جانے لگا۔ لیکن یہ سچ تھا۔ پڑھائی سے زیادہ اس کا دھیان کھیل کود میں ہی تھا۔

اسی طرح دن گذرنے لگے۔ گرمی کی رت بدلی

سردیاں آگئیں۔

اور بڑھتی ہوئی سردی کے ساتھ ساتھ۔ ابا کی کھانسی بڑھتی گئی۔ کھانسی

کے ساتھ ان کا سانس بھی تیز چلنے لگا۔

کبھی تو اتنا تیز ہو جاتا۔ کہ اس کی گونج دوسرے کمرے تک جایا کرتی۔ ڈاکٹر نے ابا کو دمہ تجویز کیا۔

پھر علاج ہونے لگا۔ تارا سب کچھ بھول کر اب صرف ابا کے لئے فکر مند تھی۔ ابا کے مرض کی دوائیں بھی حد درجے قیمتی تھیں۔ لیکن اس وقت قیمت کی کسے پرواہ تھی۔ پروا تو صرف ابا کی جان کی تھی۔

تارا نے جمع کئے ہوئے سارے روپے ڈاکٹروں کی نذر کر دیئے۔ لیکن ابا کو افاقہ نہ ہوا۔ جیسے جیسے دن گذر رہے تھے۔

ابا لاغر ہو رہے تھے۔ اب اکثر ان کا سانس تک حلق میں پھنس جاتا تھا۔ بچوں کی ذمہ داری۔ ابا کی تیمار داری۔ اماں کی فکر۔ پھر باہر سے آیا ہوا سلائی کا کام تارا سچ مچ گھن چکر بن گئی تھی۔

فکر کی بات یہ ہوئی۔ اس کی چاندنی کو بھی بخار آگیا۔ رات بھر تارا اُسے گود میں لئے بیٹھی رہی۔

صبح ہوتے ہی اس نے اسے اماں کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں بھیج دیا۔

رات سے ابا کی طبیعت بھی سنبھلی ہوئی تھی۔ ان کو کھانسی بھی نہ ہوئی تھی۔ ابا کی اس کیفیت سے اس کے دل کو کچھ قرار آگیا تھا۔

ابا کو تھوڑا بہت ناشتہ کرواکے۔ تارا گھر سمیٹنے میں لگ گئی۔ چاندنی اور نوید پورے گھر کی چیزوں کو اکثر الٹ پلٹ کر دیتے تھے۔

ابا سکون سے اپنی چارپائی پر لیٹے تھے۔ کہ ان کی پر شور کھانسی کی

آواز پر تارا کو کپڑے دھوتے دھوتے اٹھنا پڑا۔

ابا کھانس کھانس کر بے حال ہو رہے تھے۔ ایسا شدید دورہ ان پہ اکثر پڑتا تھا۔ تارا جلدی جلدی گلاس میں دوا انڈیلنے لگی۔

"ابا اچانک کھانستے کھانستے خاموش ہو چکے تھے۔ نہ ان کی سانس اب تیز چل رہی تھی۔ شاید ابا کی طبیعت اب سنبھل گئی ہے۔ تارا نے یہ سوچتے ہوئے۔ جھک کر ابا کو مخاطب کیا۔ دوا پی لیں ابا۔

لیکن ابا نے آج ہمیشہ کی طرح آنکھیں نہ کھولیں۔ آنکھیں کھولے دم سادھے لیٹے رہے۔

ابا۔ وہ ان کا سر سہلانے لگی۔

ابا اس سردی کے موسم میں پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہائے ابا کیا گرمی لگ رہی ہے۔ وہ اپنے دوپٹے سے ابا کی پیشانی کا پسینہ جذب کرنے لگی۔

اسے کیا پتہ تھا۔ یہ پسینہ تو موت کا پسینہ تھا۔ موت اس گھر میں داخل ہو کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رخصت بھی چکی تھی۔ اور تارا کو پتہ بھی نہ چلا تھا۔

وہ تو ابدی نیند سوئے ابا کو برابر جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی ان کا اکڑا ہوا ہاتھ ہلاتی۔

کبھی بھاری بھاری سر۔ کہ اماں آگئیں — وہ زرد چہرے اور کانپتے لہجے سے ابا کی کیفیت ان کو بتانے لگی۔ اتنی دیر سے یوں ہی

ساکت لیٹے ہیں۔ ذرا سی جنبش بھی تو نہیں کرتے ابا۔

اماں ابا پر جھک گئیں۔ ان کو جھنجوڑنے لگیں۔ پکارنے لگیں۔ لیکن ابا ٹس سے مس نہ ہوئے پھر اماں رونے لگیں زور زور سے۔

تم بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ تم بھی چلے گئے۔

ہائے۔ جاتے جاتے کچھ تو کہا ہوتا۔ اپنی خطائیں تو بخشوا لیتی۔ اماں بے جان ابا سے یوں مخاطب تھیں۔

جیسے وہ سب کچھ سن رہے ہوں۔

ابا بھی چلے گئے۔ چلے گئے۔ تارا کی آنکھیں پھر خشک ہو گئیں۔ ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ وہ ساکت مورتی کی طرح جس جگہ جمی ہوئی تھی جمی رہی۔

اماں کے رونے کی آواز اتنی بلند تھی۔ کہ دوسرے گھروں میں بھی پہنچ گئی۔ عورتیں ان کے گھر میں آنی شروع ہو گئیں۔

محلے کے مرد جمع ہونے لگے۔ لیکن تارا مجسمہ بنی رہی۔ اماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ دونوں بچے الگ سہمے ہوئے تھے۔

ان دونوں کو اٹھا کر تارا دوسرے کمرے میں آگئی۔

سامنے طاق میں قرآن مجید رکھا تھا۔ وہ وضو کر کے۔ یٰسین پڑھنے لگی — ابا کی روح کے ثواب کی خاطر۔ لیکن اس کا اپنا دل ڈول رہا تھا ڈوب رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے آ رہے تھے چہرہ غم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ لیکن آنسو آج پھر اسے دغا دے گئے تھے۔ بے وفائی کر گئے تھے اس کے ساتھ۔ دنیا کے دکھاوے کے لئے بھی وہ بمشکل آنکھوں میں آنسو

نہ لا سکتی تھی۔

اس کا دل رو رہا تھا۔

دل کے آنسو کب ہوتے ہیں — وہ تو خون کے آنسو رو رہا تھا۔

اور پھر بھلا کیوں نہ روتا۔

دنیا اجڑ جاتی ہے تو۔ تو۔ آنسو بہایا ہی کرتے ہیں۔ تڑپا ہی کرتے ہیں؛

پھر گھر میں منحوس خوشبوئیں پھیل گئیں۔

اگربتی کی۔ لوبان کی۔ کافور کی۔

فرید۔ فرید۔ فرید۔ آج پھر اتنے دنوں بعد فرید کا سفید کفن میں چہرہ لپٹا اس کے سامنے آ گیا۔ لیکن آج وہ چہرہ ابا کا چہرہ بن گیا تھا۔

آخری سفر کے لئے لوگ ان کو تیار کر رہے تھے۔ کمرے میں اگربتی کا دھواں گھٹ رہا تھا۔ اور اسے چکر آنے لگے۔ وہ چکرا کر سچ مچ بے ہوش ہو گئی۔

"تارا۔ تمہارے ابا رخصت ہو رہے ہیں۔ آخری بار مل لو نا ان سے"

پڑوس کی خالہ اسے سہارا دے کر اٹھانے لگیں۔

یہ الفاظ پھر اس کے سامنے دہرائے جا رہے تھے۔

پھر اس گھر سے ایک جنازہ اور نکلا۔ آج بھی تارا بے قرار ہو کر دہلیز سے آگے بڑھ گئی۔ پھر ایک سہاگ اور موڑ مڑ گیا۔

اماں کو بھی بیوگی کا داغ لگ گیا۔

اماں اور وہ دو غم زدہ ہستیاں ایک دوسرے کا غم بانٹنے کی ناکام

سعی کرنے لگیں۔

پھر رفتہ رفتہ ابا کے بغیر بھی رہنے کی اس گھر کو عادت پڑ گئی۔

چاندنی لاڈ کا جھولا جھولتی۔ بڑی ہونے لگی۔

اور اب وہ بھی اسکول جانے لگی۔

نوید بھی اب اسکول کا عادی ہو گیا۔ سویرے تارا کو تنگ کئے بغیر اب وہ اسکول کے لئے تیار ہو جاتا۔

چاندنی کو تارا اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی۔

پھر ڈھیروں پیار کر کے دونوں کو رخصت کرتی۔ وہ دونوں ساتھ جایا کرتے تھے۔ دونوں کے اسکول قریب تھے۔

ابا کے بعد اماں تو یوں بجھیں۔ جس طرح بغیر تیل کے چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے۔ اماں تو بالکل ڈھ گئیں۔ اب نہ ان کا بچوں کی باتوں میں دل لگتا، نہ گھر کے کسی کام میں۔ دن رات وہ عبادت میں مصروف رہتیں۔ اور تارا گھر کے دھندوں میں الجھی رہتی۔

فرید کے بعد ابا کا صدمہ خود اسے اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ لیکن اسے اب اپنے سہارے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ وہ تو خود اماں اور بچوں کا سہارا تھی۔

لیکن دن رات کے دکھوں۔ مصیبتوں نے اس کو الجھا کر حد درجے بد مزاج اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ بچوں کو معمولی شرارتوں پر وہ بُری طرح پیٹ دیتی۔

چاندنی کو بھی مار کر اُسے دکھ نہ ہوتا۔ ماں کی بے توجہگی کا شکار ہو گئے

تھے وہ دونوں بچے۔ نوید لڑکا تھا۔

اس کا اثر نہ لیتا۔ پٹ کر دو چار آنسو بہا کر باہر کھیلنے نکل جاتا۔ لیکن چاندنی

ننھے منے سے دل کی بڑی حساس سی بچی تھی۔

اسے اپنی امی کا یہ رویہ بالکل ناپسند تھا۔

اسے چاہت کی ضرورت تھی۔ لاڈ کی۔ وہ توجہ کی مستحق تھی۔

لیکن تارا تو ایسے دھندوں میں الجھی ہوئی تھی۔ کہ اسے چاندنی کو

دن بھر دیکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی چاندنی نے تو آنکھ نانی کی گود میں

کھولی تھی۔

لیکن۔ دن بدن ضدی ہوتی گئی۔ وہ چاہتی گھر والے اس پر توجہ دیں۔

اس کی بات مانیں۔ لیکن جب اس کی کوئی نہ سنتا تو۔

وہ ضد میں آکر رونا شروع کر دیتی۔

اور تارا غصے میں کھول جاتی۔

ابا کے بعد اس گھر کو چلانے کی ذمہ داری اس پر آپڑی تھی۔

ابا کے مرجانے کے بعد پنشن کا سہارا بھی جاتا رہا تھا۔ اب سارے

اخراجات صرف تارا کی مشین نے پورے کرنے تھے وہ دن رات مشین

چلاتی۔ اس کی کمر میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ کبھی وہ تھک جاتی۔ اس

کا آرام کرنے کو دل چاہنے لگتا۔ وہ تو اب راتوں کو بھی کام کرتی تھی۔

لیکن اسے پھر خیال آجاتا۔ آرام کروں گی، و پھر یہ زندگی کی ناؤ کیسے

چلے گی۔

اور کون تھا اس کا سہارا۔

ہر ایک کو وہ وقت پر کام تیار کر کے دیتی۔ اب اس کے پاس بے پناہ کام آنے لگا تھا۔ لڑکیوں کے پورے جہیز کے کپڑے۔ چادریں۔ کرتے۔ شلواریں۔ قمیضیں۔

پھر عید تہوار کے دنوں تو اس کا پورا کمرہ کپڑوں سے بھر جاتا۔ وہ عید پر اپنے بچوں کے کپڑے تک سینے کا وقت نہ نکال سکتی۔ دوسروں کے کپڑے سینے میں مصروف رہتی۔

تارا کی توجہ اب نوید اور چاندنی پر سے ہٹ چکی تھی۔ نوید کو اب من مانی کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اسکول سے آکر وہ باہر نکل جاتا۔ شام تک کھلنڈرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا کودتا رہتا۔ نوید کی عادتیں بھی اب بگڑنے لگی تھیں۔ عابد اس کا گہرا دوست تھا۔ جس کی فطرت میں چھوٹی سی عمر میں بد معاشی اور آوارگی بھری ہوئی تھی۔ اس کے پاس اکثر پیسے ہوتے۔ نوید کو تو کبھی اس کی امی نے ایک آنہ بھی نہ دیا تھا۔ اسکول میں بھی سب بچے پیسے لاتے تھے۔ کھانے کی چھٹی کے وقت چیزیں خرید خرید کر کھاتے۔ اور نوید ترستا رہتا لیکن جب سے اس کی عابد سے دوستی ہوئی تھی۔ اس کی بھی موج تھی۔ عابد اسے بھی مزے مزے کی چیزیں کھلایا کرتا تھا۔ ایک دوپہر نوید گھر سے نکلا تو عابد اسے ذرا فاصلے پر مل گیا۔ آؤ یار آج فلم دیکھی جائے۔ عابد نے پیش کش کی۔ نوید نے فلم کا صرف نام سنا تھا۔ دیکھی کبھی

نہ تھی۔ فوراً عابد کی بات مان گیا۔ پھر اسے فلم دیکھ کر بے حد مزہ آیا۔ گھر آیا تو اعصاب پر ہنستی ناچتی تصویریں چھائی تھیں۔ گہری شام کو ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوا تو۔ تارا نے اس کا نوٹس بھی نہ لیا۔ وہ کسی عورت کو اندر بیٹھی سلائی کے کپڑوں کا حساب بتا رہی تھی۔ چاندنی برتن دھونے میں مصروف تھی۔ چھوٹی سی عمر میں وہ گھر کا کام کرنے لگی تھی۔ نوید اسکول کی کتابیں لے کر بظاہر پڑھنے بیٹھ گیا۔ لیکن اس کا پڑھنے میں کب دل لگ رہا تھا۔ وہ تو گم تھا۔ ہنستی ناچتی گاتی تصویروں میں۔ تارا کمرے سے نکلی تو نوید کو پڑھتے دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اسے بے اختیار نوید پر پیار آ گیا۔ اس طرح محنت کرے گا نا۔ میرا چاند تو ایک دن بہت بڑا آدمی بن جائے گا۔

فوجی۔ ڈاکٹر۔ پائلٹ۔ کیا بنے گا۔؟ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

اور نوید۔ اپنی امی کو کچھ جواب نہ دے سکا۔

ان کو یہ نہ بتا سکا۔ کہ وہ تو اس وقت کسی اور رنگین دنیا کی سیر کر رہا تھا۔ وہ پڑھ تھوڑی رہا تھا۔

لیکن تارا کو اس کے دل کا حال تھوڑی معلوم تھا۔

وہ بچوں کے لئے کھانا نکال لائی۔

آج اس نے کھچڑی پکائی تھی۔ جو چاندنی کو بے حد پسند تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر دونوں کو کھلانے لگی۔

نوید پر تو امی کی اس محبت کا اثر نہ ہوا۔

ہاں چاندنی پر بہت ہوا۔ آج اتنے دن بعد امی اتنی چاہت سے کھانا کھلا رہی تھیں۔ کھانا کھا کر بھی۔ وہ امی کی گود میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔

ارے چاندنی ہٹو۔ اب تم جا کر سو رہو۔ میں نے بہت سا کام کرنا ہے۔ پیار سے تھپکیاں دے دے کر سلانے کے بجائے۔ تارا نے اس کو پرے کرتے ہوئے سونے کی ہدایت کی۔

چاندنی کی آنکھوں میں آنسو مچل آئے۔

وہ منہ بسورنے لگی۔ امی آج آپ کہانی سنا کر سلایئے نا۔ کیسی انوکھی سی فرمائش کر ڈالی تھی اس نے تارا سے۔

میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے۔ تارا نے اسے جھڑک دیا۔ ذرا سا پیار کیا تو سر ہی چڑھ گئیں۔

وہ پھر مشین کے پاس جا بیٹھی۔

اس کی ساری سہیلیوں کی امیاں کتنی اچھی تھیں۔ اور اس کی امی کتنی بری۔ اس سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ چاندنی کو امی پر بے پناہ غصہ آگیا۔

فرخندہ اس کی سہیلی تھی۔ اس کی امی کس قدر چاہتی تھیں اسے۔ ہمیشہ ڈھیر سی چیزیں دلوا کر دیتیں۔

پھر روز صبح اس کی امی اور ابو کار میں فرخندہ کو اسکول پہنچانے بھی آتے ــــــ

لیکن چاندنی کو تو اب امی نے تیار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود ہی کپڑے

بدل لیتی۔ چھوٹے چھوٹے بالوں میں کنگھی کر لیتی۔

وہ ابھی سے صفائی ستھرائی پسند تھی۔ تارا کی بے توجہگی کے باوجود وہ کبھی گندی نہیں رہتی تھی۔

فطرت کے مطابق عمر کے ساتھ ساتھ۔ چاندنی کو بننے سنورنے کا شوق ہو چلا تھا۔

لیکن وہ اپنے یہ ارمان کس طرح پورے کرتی۔

تارا نہ اس کو پیسے دیتی۔ اور نہ کبھی اس کی کوئی فرمائش پوری کرتی۔

ننھی سی عمر میں چاندنی۔ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر رہ گئی۔

اسے دن بہ دن اب اپنی امی بری لگنے لگی تھیں۔

اور کچھ اس طرح کے جذبات نوید کے دل میں بھی پرورش پانے لگے تھے۔

اور اپنے بچوں کے احساسات سے بے خبر تارا۔ صرف ان ہی کے خاطر۔ دن رات محنت کی چکی میں پس رہی تھی۔

عابد اچھا لڑکا نہ تھا۔ ماں باپ کی بے توجہگی کی وجہ سے اس کے قدم نوعمری میں بہک گئے تھے۔ اس کی خراب لڑکوں سے دوستی تھی۔ یہ سارے لڑکے حد درجے بہک چکے تھے۔

عابد اور نوید ایک کلاس میں تھے اس وجہ سے دونوں میں دوستی کچھ زیادہ ہی تھی۔

لیکن اسکول میں بھی عابد اپنی حرکتوں کی وجہ سے بدنام تھا۔ کبھی دل لگا کر نہ پڑھتا۔ اور نہ ہی ہوم ورک کر کے لاتا۔ امتحانوں میں بھی اس کا نتیجہ خراب رہتا ــــــــ

پھر عابد چور بھی تھا۔ اکثر کلاس کے لڑکوں کی چیزیں چرا لیتا۔ اس کی اس حرکت پر ایک دن ماسٹر صاحب نے اُسے اسکول سے نکلوا دیا۔

عابد روتا ہوا اسکول گیٹ سے نکل گیا۔ عابد نوید کا جگری دوست تھا اس کے اسکول سے نکال دینے پہ نوید بے حد اداس تھا۔

عابد کو تسلی دینے کی خاطر نوید بھی ماسٹر جی کی نظر بچا کر عابد کے پیچھے ہو لیا۔ اور اپنی باتوں سے اس کا غم دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

عابد روتا ہوا۔ اشفاق کے پاس چل دیا۔ نوید بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

اشفاق رشتے ونشتے کے لحاظ سے تو عابد کا کچھ نہ لگتا تھا. لیکن عابد اور اس کے ساتھی اسے چچا کہا کرتے تھے.

نوید نے بھی عابد کے منہ سے اس کا نام اور بہت تعریف سنی تھی. سارے لڑکے جو اشفاق کو جانتے تھے. اس کے گرویدہ تھے.

اشفاق ان کی مدد جو کیا کرتا تھا. اشفاق ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا. اپنے وقت کا بادشاہ بے حد دولت جمع تھی اس کے پاس. اس کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا. وہ ناجائز دھندا کرتا تھا. اسمگلر تھا وہ. پھر ساری بری عادتیں اس میں موجود تھیں. وہ ریس کھیلتا جوا کھیلتا حرام کی کمائی کھا کر وہ گناہ اور ثواب کی تمیز کرنی بھول چکا تھا. پھر نو عمر لڑکوں کو پھانسنا وہ خوب جانتا تھا. وہ اس کے روپلے اور میٹھی باتوں اور جھوٹی محبت کے جال میں پھنس جاتے. اشفاق زیادہ تر غریب لڑکوں کو ہاتھ میں لیتا. جن کا کوئی والی وارث نہ ہوتا وہ بہک جاتے. اور اشفاق ان سے بھی برا کام کرواتے لگتا. عابد کا بھی اشفاق کے یہاں آنا جانا تھا. اب بھی وہ گھر جانے کے بجائے روتا ہوا آنسو بہاتا ہوا اشفاق کی طرف چل پڑا.

عابد آنسو بہا رہا تھا تو نوید کا دل بھی رو رہا تھا. اشفاق کا گھر بہت دور تھا. دونوں بس میں بیٹھ گئے. پھر بس سے اتر کر ان کو خوب پیدل چلنا پڑا. پھر اشفاق کا گھر آیا. شہر سے باہر سمندر کے کنارے. وہ ایک عالی شان محل تھا. نوید تو یہ محل دیکھ کر ہی مرعوب سا ہو گیا. اور اندر

کی دنیا تو بے حد حسین تھی۔ پوری زمینیں سرخ سرخ قالینوں سے ڈھکی ہوئی تھیں ہر چیز چمک رہی تھی۔ کمروں میں بھی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور اشفاق ایک عالی شان کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ عابد کو دیکھ کر خوش ہوا۔۔۔ گئے میرے ننھے یار۔ ہم تمہیں یاد کر رہے تھے۔ بڑی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تمہاری۔ اس نے عابد کو قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

عابد اور رونے لگا۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان ماسٹر صاحب کی شکایت کرنے لگا۔ اشفاق نے عابد کی کہانی سن کر اُسے دلاسہ دیا۔ ماسٹر جی کو بھی اپنی زبان سے دو چار گالیاں دے ڈالیں۔ جیسے سارا قصور تو ماسٹر جی کا ہو۔ اور عابد بے قصور ہو۔ نوید کو اشفاق کی سرخ سرخ آنکھوں سے خوف آ رہا تھا۔ اشفاق کی صورت تھی بھی کچھ ڈراؤنی سی۔ وہ سہما سہما کھڑا تھا۔ چچا یہ میرا دوست ہے۔ عابد نے نوید کا تعارف اس سے کروایا۔ آہا۔ بھئی یہ تو بڑا سوتا ہے۔ اشفاق نے نوید کو قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے ملازم سے اس نے دونوں لڑکوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لانے کو کہا۔ دوسرے پل ملازم نے کمرے میں پڑی بڑی سی میز طرح طرح کی چیزوں سے بھر دی۔

ٹھنڈے ٹھنڈے فریج سے نکلے پھل۔ کیک۔ پیسٹری۔ رنگ برنگی مٹھائیاں۔ بسکٹ۔ نہ جانے کیا کیا۔ کہ یہ سب دیکھ دیکھ کر نوید کے منہ میں سچ مچ پانی آنے لگا۔ یہ نعمتیں کب نوید کے حصے میں آئی تھیں کبھی۔ اسے تو گھر میں دونوں وقت دال روٹی یا پھر کبھی سبزی کی بھاجی مل

جاتی ــــــ

"کھاؤ بھئی تم دونوں۔ شرماؤ مت"۔ اشفاق نے دونوں کو کھانے پر ابھارا۔ نوید جھجک رہا تھا۔ اشفاق نے اس کی یہ جھجک محسوس کر لی۔ پلیٹ میں سے ایک کیلا اٹھا کر اپنے ہاتھ سے چھیل کر اس نے نوید کے ہاتھ میں دے دیا۔

پھر نوید کھانے لگا۔

خوب ڈٹ کر پیٹ بھر کر اس نے ساری چیزیں ہضم کر لیں۔ پھر نوکر گلاسوں میں۔ ٹھنڈا ٹھنڈا سرخ سرخ شربت بھی لے آیا۔

بس وہ پی کر تو مزہ آگیا"

کھا پی کر عابد پر پھر گھر والوں کا خوف لاحق ہوا۔ وہ ریں ریں کر کے رونے لگا۔ امی ماریں گی۔ ابو ماریں گے۔

گھر سے نکال دیں گے۔ وہ روتے ہوئے مسلسل بولنے لگا۔

تو پھر تو اِدھر آجائیو۔ اشفاق نے اپنے گھر کے دروازے اسس پر وا کر دیئے۔

نوید کا دل تو بُری طرح اشفاق پر آگیا۔

کیسا ہمدرد تھا وہ۔ بالکل بادشاہوں کی طرح تھا۔ جو اپنی رعایا کے لئے اپنے خزانوں کا منہ کھول دیتے ہیں۔

نوید نے کہانی کی کتابوں میں ایسے بادشاہوں کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ گھر بھی کیسا شاندار تھا۔ اشفاق کا۔

بہت بڑا۔ سجا سجایا۔ اتنے عمدہ عمدہ قالینوں سے زمین ڈھکی ہوئی تھی۔ کہ نوید تو باہر ہی جوتے اتار کر ننگے پیر اندر آیا تھا۔ اس ڈر سے کہ اس کے مٹی بھرے جوتوں سے قالین گندہ نہ ہو جائے۔

اشفاق کے پاس اس کے چند ملنے والے آگئے۔

جاؤ بیٹا تم اب جاؤ۔ اس نے آپ ہی دونوں کو رخصت کرنا چاہا۔ ہاں عابد بیٹے جاتے وقت ذرا تم یہ بنڈل۔ خان چاچا تک پہنچا دینا۔ وہ سامنے رکھی الماری سے ایک بنڈل نکال لایا۔ جانتے ہو نا تم اس کا گھر۔

ہاں۔ عابد۔ اقرار میں گردن ہلانے لگا۔ شاباش بس بیٹے احتیاط سے لے کر جانا۔ اس طرح اپنے بیگ میں رکھ کر۔ اس نے وہ بنڈل عابد کے بیگ میں اپنے ہاتھوں سے ڈال دیا۔

لو یہ کرائے کے پیسے بھی لیتے جاؤ۔

اشفاق نے اپنی جیب سے ہرا ہرا نوٹ نکال کر عابد۔ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ہائے اتنے سارے پیسے۔ نوید کے دل نے سرگوشی کی۔ اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

"جاتے جاتے اشفاق نے جھک کر نوید کے گال پہ پیار کر لیا۔ تو بہ اتنا صاف ستھرا اجلا آدمی دیکھنے میں نظر آتا تھا۔

لیکن اس کے پاس سے کتنی گندی سی بدبو آ رہی تھی۔ کہ نوید کا جی متلانے لگا۔ خان چاچا کا گھر بہت دور تھا۔

وہ دونوں رکشہ میں گئے۔ عابد نے جب اشفاق کی امانت خان چاچا کو پہنچا دی. تو اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔

نوید روز دو بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا۔

پہلے پہل وہ چاندنی کو ساتھ لیتا ہوا گھر جاتا تھا۔ لیکن اس کے دوستوں کی نگاہیں چاندنی پر اٹھتی تھیں۔

چھوٹے سے نوید کو یہ بُرا لگتا تھا۔ کہ لڑکے اس کی بہن پر نظر ڈالیں۔

وہ روز گھر میں آکر تارا سے یہی کہتا۔ میں اُسے ساتھ نہیں لایا کروں گا۔ یہ راستے میں ہنستی ہے۔ زور زور سے بولتی ہے۔ اسے تو چلنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ وہ یہ سارے جھوٹے الزام معصوم سی چاندنی پر دھرتا۔

اسے ہے۔ چاندنی چڑ جاتی۔ اس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔ جیسے جیسے دونوں کی عمریں بڑھتی جا رہی تھیں۔

وہ دونوں آپس میں بے حد لڑنے لگے تھے۔ اماں اور تارا ان کی لڑائیوں سے عاجز آگئی تھیں۔

اسکول جاتے ہوئے لڑتے۔

آتے ہوئے لڑتے۔

آخر تنگ آکر چاندنی نے محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اسکول جانا اور آنا شروع کر دیا۔

تو نوید کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ پہلے چاندنی کی وجہ سے وہ چھٹی کے بعد۔

دو گھڑی بھی دوستوں کے پاس نہ ٹھہر سکتا تھا۔ اب آرام سے گھر آتا۔ اکثر چاندنی کو گھر پہنچے ایک گھنٹہ ہو جاتا۔ تب نوید گھر میں داخل ہوتا۔

آخر تو سیدھا گھر کیوں نہیں آتا۔

روز اسے تارا سے جھاڑ پڑتی۔

لیکن آج تو تین بج گئے تھے اور وہ عابد کے ساتھ گھر سے بہت دور کھڑا تھا۔ ویسے اب اسے امی کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔

وہ دونوں پیدل گھر کی طرف جا رہے تھے۔ کہ سامنے بڑا سا سینما ہال آگیا۔ نوید کے قدم بھی رک گئے اور عابد کے بھی۔

باہر کتنے بڑے بڑے رنگین پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ عورتوں کی تصویریں کے۔ کوئی رو رہی تھی۔ یہ موٹے موٹے آنسو صاف نظر آ رہے تھے۔ کوئی دلہن بنی تھی۔ کوئی ناچ رہی تھی۔

ایک بچے کی تصویر بھی تھی۔

شو ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے کافی رش تھا۔ آدمی ایک دوسرے کو دھکیل کر اندر جا رہے تھے۔

آ یار فلم دیکھیں۔ عابد کے پاس کافی روپے بھی تھے۔ فلم۔ مارے اشتیاق کے نوید۔ گھر جانا اور امی کا خوف بھول گیا۔

عابد بھیڑ بھاڑ میں گھس کر۔ کسی طرح دو ٹکٹ لے آیا۔

پھر دونوں اندھیرے ہال میں جا بیٹھے۔ آج کی پوری فلم نوید کی سمجھ میں آگئی۔ یہ ایک مظلوم بچے کی کہانی تھی۔

جس کی سوتیلی ماں اس پر ظلم کرتی ہے۔ مارتی ہے۔ ڈانٹتی ہے۔ اور نہ جانے کیوں۔ نوید کو اپنی اتنی اچھی سی امی بھی۔ فلم والی امی کی طرح لگی۔

جو بات بات پر مظلوم بچے کو پیٹ دیتی ہے۔

فلم ختم ہوئی دونوں باہر آئے تو۔ ہر سو تاریکی پھیلی تھی۔ گھروں میں دکانوں میں۔ ہر جگہ بتیاں جل رہی تھیں۔ نوید کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

لیکن جاتے کس طرح۔ پھوٹی کوڑی اب دونوں میں سے ایک کی جیب میں نہ تھی۔ فلم کے ٹکٹ اور پھر انٹرول میں۔ ٹھنڈا شربت اور چیپس میں سارے پیسے ختم ہو چکے تھے۔

گھر اب پیدل ہی چلنا پڑے گا۔

عابد نے تھکے لہجے میں کہا۔

اب اس کے اعصاب پر گھر والوں کا خوف سوار تھا۔ دونوں پیدل ہی چل پڑے۔

آٹھ بج چکے تھے۔ لیکن نوید اب تک گھر نہیں آیا تھا۔ تارا اس کا دوپہر سے انتظار کر رہی تھی۔ دوپہر سے سہ پہر ہوئی۔ پھر شام۔ اور اب تو رات بھی گہری ہو چلی تھی۔

ویسے بھی سردیوں کی آمد تھی۔

رات جلدی اتر آتی۔ اور آٹھ بجے تک گلی میں سناٹا چھا جاتا۔

جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ تارا کا دل مضطرب ہوا چلا جا رہا تھا۔

اس عذاب میں مبتلا ہوئے اُسے کتنے گھنٹے ہو گئے تھے۔

چاندنی بھی۔ اب پریشان ہو رہی تھی۔ امی کے ساتھ گلی میں کھلنے والے دروازے پر وہ بھیا کی منتظر کھڑی تھی۔

اگر نوید کو کچھ ہو گیا تو۔ تو۔ پھر۔ کیا ہو گا۔ تارا کا دل ڈوبنے لگتا شام کو وہ اس کے اسکول جا کر بھی پتہ کر آئی تھی۔

اسکول کب کا بند ہو چکا تھا۔ اور نوید کہاں چلا گیا تھا۔ اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔

اس بھرے شہر میں۔ وہ کہاں جا کر نوید کو تلاش کرتی۔

کوئی اس کا سہارا بھی تو نہ تھا۔

اماں الگ لاغر اور بیمار تھیں۔ اب تو ان سے پلنگ سے بھی نہیں اٹھا جاتا تھا۔

ایک وہ تھی۔

اور پھر سات آٹھ برس کی چاندنی۔

تارا نے مجبور ہو کر برابر والوں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ماشاء اللہ اس گھر میں مرد ہی تھے۔ اور پھر برسوں سے ایک جگہ رہتے ہوئے وہ سب محلے والے ایک دوسرے کے ہمدرد بھی تھے۔

کون ہے۔ پڑوس کے احمد صاحب نے دروازہ کھول کر اندھیرے میں تارا کو گھورا۔

میں ہوں چاچا۔ تارا ہمیشہ سے ان کو چاچا کہا کرتی تھی۔ کیا ہے بیٹی۔ انہوں نے اسے اندر بلاتے ہوئے کہا۔ آنگن میں پھیلی پیلی پیلی مدھم سی روشنی میں۔ احمد صاحب نے تارا کا چہرہ پڑھ لیا۔

وہ صورت سے حد درجہ پریشان لگ رہی تھی۔

چاچا۔ وہ رونے لگی۔ ہچکیوں کے ساتھ۔

آخر ہوا کیا؟ کچھ تو بتاؤ بیٹی۔

میرا نوید۔ صبح اسکول گیا تھا۔ پھر واپس نہیں پلٹا۔

ہائیں۔ وہ بھی کچھ گھبرا گئے۔ وہ تارا کے بے حد ہمدرد تھے۔ اس کے دکھ پر ان کا جی کڑھتا تھا۔ نوید۔ بیوہ تارا کا سہارا تھا۔

ان کا دل خود بجھ گیا۔ پھر تارا کو تسلی دینے لگے۔ میں تلاش کرتا ہوں اس کو۔ کسی دوست کے گھر چلا گیا ہو گا۔ انہوں نے تارا کو دلاسہ دیا۔

اگر وہ نہ ملا تو۔؟۔ وہ ڈوبے ڈوبے لہجے میں ان سے سوال کرنے لگی۔ کیسے نہیں ملے گا۔ میں پولیس اسٹیشن میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دوں گا۔ اخباروں میں تصویر چھپوا دوں گا۔

لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ نوید ابھی آ جائے گا۔ انہوں نے وثوق کے ساتھ کہا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی رات میں وہ اپنا مفلر ٹوپی پر لپیٹ کر باہر نکل گئے۔

لیکن وہ ابھی زیادہ دور نہ گئے تھے۔ کہ ان کو گلی میں داخل ہوتا ہوا نوید نظر آ گیا۔

کہاں تھے تم۔؟۔ انہوں نے نوید کو جا گھیرا۔

وہ۔ وہ۔ چاچا۔ نوید کے منہ سے بات نہ نکلی۔

وہ کانپنے لگا۔ جھوٹ بولنا ابھی اس نے نہ سیکھا تھا۔ سچ بولنا بھی اس وقت مناسب نہ تھا۔ وہ چپ رہا۔

گھر تک آتے آتے۔ برابر احمد صاحب اس سے یہی گردان کرتے رہے۔ کہاں گئے تھے تم۔ بغیر بتائے۔ لیکن۔ نوید کے لب بھنچے رہے۔

عجیب ڈھیٹ لڑکا تھا۔ احمد صاحب کو غصہ آ گیا۔ اگر ان کا اپنا بیٹا ہوتا۔ اور ایسی حرکت کرتا۔ تو وہ سچ مچ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔

لیکن نوید تو پرایا بچہ تھا. اور یتیم تھا. اس وجہ سے اس کو ڈانٹتے ہوئے ان کا دل دکھتا محسوس ہوتا۔

تارا سر جھکائے دہلیز پر ہی بیٹھی تھی۔ احمد صاحب کے ساتھ نوید کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

لو سنبھالو اپنے بیٹے کو۔ ساتھ ساتھ نصیحت بھی کر دینا. کہ اتنی رات گئے باہر رہنا۔ شریف بچوں کا شیوہ نہیں۔

انہوں نے جاتے جاتے طنز بھی کر ڈالا۔

نوید کے انتظار کی کوفت۔ بے قراری۔ غم۔ اب غصے کی کھولن بن گئے۔

"کمینے کہاں غائب تھا"

تارا نے ایک دو تھپڑ اس کے منہ پر برسانے ہوئے کہا۔

وہ جواب دینے کے بجائے۔ منہ کھول کر رونے لگا. بتا. بول کہاں تھا. تارا اُسے بے دردی سے پیٹنے لگی۔

وہ رونے لگا:

اور چاندنی کا ننھا سا دل تڑپنے لگا. امی نہ مارو بھیا کو. وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے امی کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

اماں بھی اپنے کانپتے ڈولتے وجود کے ساتھ چارپائی سے اتر آئیں۔

میرا جی دکھتا ہے. نہ مار تارا. اس بھول سے بچے کو اس بیدردی سے.

دل تو تارا کا بھی دکھ سے پھٹا جا رہا تھا۔

وہ چارپائی پر اوندھے منہ پڑ کر زور زور سے رونے لگی. چاندنی بھی

امی کے اس طرح رونے پر سہم کر رونے لگی۔ نوید تو پہلے سے ہی رو رہا تھا۔
"پاگل ہوئی ہے تارا۔ آخر بچہ ہے نا نوید۔ کھیل کود میں لگ گیا ہوگا۔" اماں اسے پیار سے بہلانے لگیں۔

سچ بتا نوید۔ وہ پھر چارپائی سے اٹھ بیٹھی۔ تو کون سے کھیل میں مگن تھا اتنی دیر۔

اور نوید سچ بولنے لگا۔

جھوٹ اس سے نہ بولا گیا۔ ہائے۔ تو نے فلمیں دیکھنی شروع کر دیں تارا نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر نوید کو دونوں ہاتھوں سے اور پیٹ ڈالا۔

تو اتنی سی عمر میں۔ بدمعاش ہو گیا ہے۔ آوارہ ہو گیا ہے۔ وہ نوید کو بری بری باتیں کہنے لگی۔ ہوش میں آ تارا۔ بچوں کو پیار سے سمجھایا جاتا ہے۔ یا مار پیٹ کر ڈھیٹ بنایا جاتا ہے۔

"دیکھ نوید۔ اگر اب تو نے فلم دیکھی تو۔ میں سچ مچ۔ گرم گرم لوہے کی سلاخ سے تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی۔"

اس نے سنگدلی سے کہا۔ نوید اور ڈر گیا سہم گیا۔ پھر تارا سے لپٹ کر رونے لگا۔ وعدے کرنے لگا۔ کہ اب وہ کبھی دیر سے گھر نہیں آئے گا۔ کبھی برا کام نہیں کرے گا۔

دیکھ نوید۔ تیرا باپ مر چکا ہے۔ آج وہ اسے حقیقت بتانے لگی۔ تو نے بری حرکتیں کیں تو میں بھی مر جاؤں گی۔

نہیں نہیں۔ نوید نے اپنا سر اس کے سینے میں چھپا لیا۔ میری امی۔ تم

نہ مرنا۔ میں کبھی آپ کو نہیں ستاؤں گا۔

نوید کا ننھا سا دل اور دماغ۔ موت کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا۔ اسے پتہ تھا۔ جو مر جاتے ہیں۔ وہ کبھی واپس نہیں آتے۔

اگر امی مر گییں تو پھر۔ کیا ہو گا۔ اس کا دل تو اپنی امی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

نوید کو پیٹ کر تارا کا غصّہ اتر چکا تھا۔ اب اسے اپنے پر پشیمانی ہو رہی تھی۔ لیکن پھر بھی ڈھیٹ بن کر اس نے نوید کو پیار نہ کیا۔

اسے پتہ تھا۔ مار کر پھر پیار کر لینے سے بچے پر کسی نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔ اسے کھانا کھلانے کیلئے اس نے پلیٹ میں۔ دال اور روٹی اس کے آگے لا رکھی۔

اور نوید کو اشفاق کے گھر کھائی دنیا کی نعمتوں کا خیال آگیا۔ دال دیکھ کر اس کی کھانے کو طبیعت نہ چاہی۔ لیکن تارا کے خوف سے وہ بغیر بھوک کے جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔

کھانا کھا کر بستر پر لیٹتے ہی وہ سو گیا۔ ایک تو پیدل چلنے کی وجہ سے اسے پہلے تھکن ہو رہی تھی۔ پھر تارا نے بیدردی سے مار کر اس کے پورے جسم میں درد کر ڈالا تھا۔

وہ سو گیا۔ تو تارا روتی آنکھوں سے سوئے نوید کو پیار کرتی رہی۔

"میرے بیٹے۔ میرا ہر خواب۔ پل پل کی سوچ —— سب تمہارے لئے ہیں۔

"ان خوابوں کو نہ بکھیرنا۔ میرے درد میں اضافہ نہ کرنا۔ تمہیں ان زخموں کو مندمل کرنا ہے نوید۔

اپنی ماں کے دل کے زخموں کو۔ جو اسے قدرت نے بخشے ہیں۔ فرید کو چھین کر۔ بے آسرا کر کے اس گرداب میں پھنسا کر۔

"تمہیں مجھے اس گرداب سے نکالنا ہے۔"

وہ دکھے دل سے عمیق سوچوں کی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب گئی۔

تارا کی مار۔ ڈانٹ سختی۔ کچھ کام نہ آئی۔

دن رات پٹ پٹ کر نوید ڈھیٹ ہو گیا۔ اب وہ تارا کو آپ جان کر دق کرنے لگا۔ ستانے لگا۔ رلانے لگا۔ اس کے پاس پہلے کیا آنسوؤں کی کمی تھی۔ جواب نوید ان میں اضافہ کر رہا تھا۔

تارا کو اب اپنا مستقبل بھی ڈولتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔ نوید کا اٹھان اچھا نہیں ہو رہا تھا۔ اسکول سے اس کی شکایت آتی۔

گھر آ کر وہ کتابیں الماری میں رکھ کر جلدی جلدی کھانا کھا کر باہر کی خبر جو لیتا تو رات کو آتا۔ اکثر تارا کو خود اس کی تلاش میں نکلنا پڑتا۔

گھر پر رہتا تو بس چاندنی کو تنگ کرنا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔

چاندنی تو بے حد بھولی بھالی پیاری سی بچی تھی۔ اس نے کبھی اپنی امی کو تنگ نہ کیا تھا۔ اسے اپنی امی سے بے حد پیار تھا۔

وہ چھوٹی سی عمر میں ماں کے دکھوں کو سمجھ چکی تھی۔ تارا کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کا ہاتھ بٹاتی ننھے منے ہاتھوں سے برتن دھوتی۔ کپڑے دھوتی۔ جھاڑو دیتی۔

نانی اماں کی خدمت کرتی. اب تو وہ مستقل بیمار رہنے لگی تھیں. تارا کے پاس کہاں وقت بچتا تھا. کہ وہ اماں کی دیکھ بھال کرتی. خدمت کرتی۔ یہ سب چاندنی نے سنبھال لیا تھا. اللہ میاں نے تو چاندنی کو عمر سے پہلے شعور بخش دیا تھا۔

چاندنی دس سال کی ہوگئی تھی۔

اور اس طرح دس سال۔ تارا کو محنت کی چکی میں پستے پستے ہو گئے تھے۔ یہ دس سال تارا کو دس صدیاں لگتے۔

لیکن ابھی اس نے نہ جانے کتنے عرصے اور اس طرح محنت کرنی تھی۔ اس کو ان سالوں کا اس عرصے کا کچھ اندازہ نہ تھا۔

یہ دس سال اماں کو بڑھاپے کی آخری سرحد پر پہنچا گئے تھے۔

اب تو ان سے چلا پھرا بھی مشکل سے جاتا تھا. وہ تو خود اب بیٹی پر بوجھ بن گئی تھیں. اس کے دکھ کیا بانٹتیں۔

اسکول میں اچھے اچھے امیر گھروں کی لڑکیاں چاندنی کی سہیلیاں تھیں۔ جو بڑی بڑی باتیں کرتی تھیں. ان کے گھر عالی شان تھے۔ ان کے ابا کے پاس دو دو موٹریں تھیں۔ ایک بار اپنی سہیلی فرخندہ کی سالگرہ پر۔ چاندنی بھی اس کے گھر گئی تھی۔ وہاں جا کر چاندنی کا دل رو دیا تھا۔

اُسے احساس ہونے لگا تھا محرومی کا۔ کمتری کا۔

اپنے لباس کا۔

سب نے وہاں اتنے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

لیکن چاندنی کے کپڑے سب ہی خراب تھے۔ اس نے فرخندہ کو کوئی تحفہ بھی نہ دیا تھا۔

اُسے کیا پتہ تھا کہ سالگرہوں میں تحفے دیئے جاتے ہیں۔

وہ کبھی کسی سالگرہ میں نہیں گئی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا جانے کا۔ اُسے تو اپنی سالگرہ کا دن بھی نہ معلوم تھا۔

اس کی سالگرہ کا دن سال میں کبھی آتا ضرور تھا۔ لیکن کب۔ یہ بھی تارا کے اُلجھے ہوئے تھکے ہوئے ذہن کو کبھی یاد نہ رہتا۔

چاندنی کا بچپن کتنا بُرا گذر رہا تھا

لیکن رات کے بعد کبھی سحر تو آتی ہے نا۔

تارا کو یقین تھا۔ کبھی سحر ضرور آئے گی۔ اس کے بچوں کی زندگی میں چاندنی اتنی بدنصیب نہیں ہو سکتی کہ اس کی ساری زندگی بے کسی میں کٹ جائے اچھے دنوں کے انتظار میں تو تارا اب جی رہی تھی۔ یہی لگن اس میں پھر محنت کی ہمت پیدا کر دیتی۔

نوید اب عابد کے ساتھ۔ اشفاق کے یہاں جانے لگا تھا۔

نوید نے اشفاق کو اپنی کہانی بڑے دکھ کے پیرائے میں سنائی تھی۔ میرا باپ نہیں ہے۔ میری ماں۔ مجھے بالکل پیار نہیں کرتی۔

ہم بہت غریب ہیں۔ دو وقت کا کھانا بھی ہمیں مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی کہانی سن کر اشفاق کو وہ اپنے کام کے لئے موزوں معلوم ہوا۔ کیونکہ اسے نوید چالاک بھی لگتا تھا۔ اور ہوشیار بھی۔ وہ اُسے

اچھی طرح ٹرین کر کے اپنے گروہ میں شامل کر سکتا تھا۔ اشفاق کو نئے لوگوں کی ضرورت تھی۔

اس کے پرانے ساتھی اب اس کے وفادار نہ رہے تھے۔ چند ایک سامان لے جاتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ پولیس کو ان پر شبہ ہو گیا تھا۔

اس وجہ سے اشفاق نے اب نوعمر لڑکوں کا سہارا لیا تھا۔ اس نے ان سے باہر کے ملکوں میں سامان پہنچانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

عابد کو تو ماں باپ کی پروا ہی نہ تھی۔ لیکن نوید کو تارا کا خوف لاحق تھا۔

جواب ہاتھوں سے نہیں۔ بلکہ ایک چھڑی سے اُسے مارا کرتی تھی۔ جو اس نے پڑوس کے احمد چچا سے صرف نوید کی خبر گیری کے لئے منگوائی تھی ——

تارا صرف مار پٹائی سے ہی تو نوید کی اصلاح کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس طرح وہ اور بگڑ رہا تھا۔

اشفاق سے اُسے اب پیسے بھی ملنے لگے تھے۔ جو وہ گھر کے باہر خرچ کر آتا۔ پکچروں کا اب اُسے چسکہ پڑ گیا تھا۔

فلمی گانے اسے بہت سے حفظ ہو گئے۔ گھر میں سیٹی کی دھن بجا کر وہ یہ فلمی گانے گاتا تو۔ تارا کا خون کھول جاتا۔

ارے کمینے۔ تیری غیرت کہاں ڈوب مری۔

اونہہ اس کا منہ بن جاتا۔ تارا تو لبس ہر بات پر روک ٹوک کرتی۔

نوید کو اپنی مظلوم ماں سے بھی نفرت ہو چلی تھی۔

اب نوید کو نت نئے فیشن کے کپڑے پہننے کا شوق ہو گیا۔ رنگ برنگی پتلونیں۔ سرخ نیلے پیلے پھولوں والی پتلونیں۔

لیکن اس کو پتہ تھا یہ کپڑے اس کی ماں اُسے سلوا کر کبھی نہیں دے سکتی۔ وہ اپنی ماں کی مجبوریوں کو کب سمجھتا تھا۔ جو صرف اولاد کے خاطر خود بھی مشین کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

ایک شام کو نوید گھر آیا۔ تو اس کی جیب میں نیا نیا دس کا نوٹ تھا۔ وہ سیدھا اشفاق کے گھر سے آ رہا تھا۔ اشفاق نے اُسے بیس روپے دیئے تھے۔ دس روپے تو اشفاق کا سامان اسٹیشن پہنچانے میں ختم ہو گئے۔ اس میں ہی اتنی دیر ہو گئی۔ کہ اسے اور پیسے خرچ کرنے کا موقع نہ ملا۔ کیونکہ رات ہو رہی تھی۔ اور عابد بھی آج اس کے ساتھ نہ تھا۔ عابد کو اشفاق نے کراچی سامان دے کر بھیجا تھا۔

اشفاق کا گھر بہت بڑا تھا۔ نوید اس میں آسانی سے سما سکتا تھا۔ دل تو اب نوید کا بھی یہ کرنے لگا تھا۔ کہ وہ جھونپڑا چھوڑ کر محل میں آ بسے۔ نوید کا گھر اشفاق کی محل نما کوٹھی کے سامنے جھونپڑے کی حیثیت رکھتا تھا۔

لیکن گھر چھوڑنا۔ نوید کے لئے مناسب نہ تھا۔

اب وہ اکثر اسکول جانے کے بجائے اشفاق کی طرف چلا جاتا، تارا کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ وہ مصیبت کی ماری کس کس پر نظر رکھتی۔

رات کو نوید نے وہ دس روپے کا نوٹ جو اس کی جیب میں تھا۔ تکیئے کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔ کہ صبح اسکول جاتے ہوئے نکال لوں گا۔ پھر اسکول وہ مزے سے یہ سارے پیسے خرچ کر سکتا تھا۔ کوکا کولا پی کر۔ آئس کریم کھا کر۔ اور دوستوں کو کھلا کر۔

لیکن اتفاق سے صبح اُس کی دیر سے آنکھ کھولی۔ اسکول کا وقت قریب تھا۔ جلدی سے چائے اور روٹی کھا کر وہ اسکول کے لئے نکل گیا۔

تارا بچھونے جھاڑنے میں لگ گئی۔ چاندنی سویرے اسکول چلی جاتی تھی۔ اس وجہ سے تارا ہمیشہ پہلے گھر صاف کرتی۔ کھانا چولہے پر چڑھاتی۔ اس کے بعد سلائی کا کام کرنے بیٹھ جاتی۔

تارا نے چادر کی سلوٹیں نکالنے کو نوید کا تکیہ پلٹا۔ تو سامنے ہی سبز سبز دس کا نوٹ موجود تھا۔ تارا کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ یہ روپے اس کے ہرگز نہ تھے۔ اُس کے پاس تو صرف تین روپے تھے۔ جس کا اُسے خود جا کر ابھی سودا لانا تھا۔ آج اُسے سلائی کا کچھ معاوضہ ملنے کی امید تھی۔

یہ روپے یقیناً نوید کے ہی تھے۔ کہاں سے لایا نوید یہ رقم؟۔

تارا لرزنے لگی۔ کانپنے لگی۔ آج پھر وہ اس کیفیت سے دوچار ہوئی تھی۔ جیسی فرید کی موت پر ہوئی تھی۔ ابا کی موت پر ہوئی تھی۔ پتھر کی مورت کی طرح کھڑی رہی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ۔

تارا۔ تارا۔ تارا۔

بیٹی ذرا ایک پیالی چائے مجھے بھی دے دینا۔ اماں اسے کب سے بلا رہی تھیں۔ لیکن تارا کب ہوش کی دنیا میں تھی۔

آخر اماں بمشکل خود چارپائی سے اُٹھ کر قریب آگئیں۔ کیا ہوا تارا!

وہ گم صم دس کا نوٹ مٹھی میں دبائے کھڑی تھی۔

"تارا کو جیسے ہوش آگیا۔ اماں۔ وہیں نوید کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ اماں اماں۔ تارا نے بے اختیار اماں کی گود میں منہ چھپا لیا۔ غم کے بادلوں میں گھر کر وہ برسات ہمیشہ اماں کی گود میں منہ چھپا کر ہی برساتی تھی۔

اس گود میں اب بھی اُسے سکون ملتا تھا۔ کیا ہوا بیٹی۔ آج تارا نے ایک طویل عرصے کے بعد اس طرح اماں سے محبت کا اظہار کیا تھا۔

ورنہ اُسے تو اماں سے بات کرنے کی کبھی دن میں فرصت نہ ملا کرتی تھی۔

اماں میں لٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔ وہ رونے لگی۔ لرزنے لگی۔

اماں کی سمجھ میں یہ مسئلہ نہ آرہا تھا۔ کہ یہ اچانک تارا پر جذباتی پن کا دورہ کیوں پڑ گیا۔

"آخر یہ رونے کی وجہ۔ ؟۔ کچھ تو بول۔"

اماں۔ نوید چور ہو گیا ہے۔ وہ کہیں باہر سے چوری کر کے یہ روپے لایا ہے۔ ہائے اماں مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ وہ اماں سے سوالی بن کر پوچھنے لگی۔

اماں خود فق سی ہو گئیں۔ ان کے دل کو خود صدمہ پہنچا تھا۔ تو پھر تارا کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔

"یا خداوند۔ یہ قسمت کی گردش کب تھمے گی"۔

قسمت۔ کن گناہوں کی سزا دے رہی تھی ان دونوں کو۔ بیٹی کا دکھ اماں کے دل کا دکھ بھی تو تھا۔

ان کی تارا نے تو انجانے میں بھی کوئی گناہ نہ کیا تھا۔

وہ تو بہت معصوم سی فطرت کی تھی۔ پھر۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ۔

اس کی ہر اُمید ٹوٹ رہی تھی۔

نوید اس کا سب کچھ تھا۔

لیکن آج یہ غلط حرکت کر کے نوید نے تارا کے ٹوٹے ہوئے دل کے اور ان گنت ٹکڑے کر دیئے۔

تارا سب کچھ بھول کر۔ کھانا پینا۔ صفائی ستھرائی۔ سلائی۔ پلنگ پر گر کے رونے لگی۔

روتے روتے۔ دوپہر ہو گئی۔ نوید سیدھا اسکول سے گھر آیا۔ اسکول جا کر اُسے دس روپوں کا خیال آیا تھا۔ جو وہ تکیئے کے نیچے بھول آیا تھا وہ سخت بوکھلا گیا تھا۔ اگر امی نے دیکھ لئے تو۔ پھر وہ کیا جواب دے گا۔

کلاس میں بیٹھ کر وہ سارا وقت یہی کچھ۔ سوچتا رہا۔ پھر اس نے ایک اسکیم بنالی۔ جھوٹی۔ اسکیم۔

جھوٹ بولنا تو اب اسے بے حد آگیا تھا۔

وہ گھر آیا۔ تو تارا اس کی منتظر تھی۔

آج وہ نوید کو بہت بڑی سزا دینے کو تیار تھی۔ ایسی سزا جو نوید کے لئے عبرت رکھتی ہو۔ تارا کے تھپیڑوں اور چھڑیوں کی ضرب کا اس پر کب اثر ہوتا تھا تارا نے سوچ لیا۔

نوید کے وہ ہاتھ آگ سے داغ دے گی۔ جس سے اس نے چوری کی تھی۔ اُسے یہ یقین نہ تھا۔ نوید نے روپے چوری کیئے ہیں۔

نوید گھر آیا تو ماں کی صورت دیکھ کر سہم گیا۔ کچھ دکھی سا بھی ہو گیا۔

نوید سچ بتا۔ یہ روپے تیرے پاس کہاں سے آئے۔؟

تارا سے ایک منٹ بھی صبر نہ ہوا۔ آگے بڑھ کر نوید کو جھنجوڑ ڈالا۔ اور اس اچانک حملے سے نوید گھبرا گیا۔

تھر تھر کانپنے لگا۔ جو منصوبے ماں کو بہلاوا دینے کو بنائے تھے۔ وہ خوف کی وجہ سے دماغ سے نکل گئے۔ وہ گنگ سا ہو گیا۔

تو چور بھی ہو گیا ہے۔ کمینے۔ اس سے اچھا ہے کہ تو مر جائے۔ ذلیل۔ تارا نے اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ وہ رو رو کر کے رونے لگا۔

میں نے چوری نہیں کی۔ مجھے یہ کسی نے دیئے تھے۔ نوید نے سچ بولا۔

ایسا کون سا تیرا ہمدرد پیدا ہو گیا۔ جو تجھے مفت میں روپے دینے لگا۔ تارا نے اُسے دھکیل کر کمرے میں بند کر دیا۔

بتا تو نے کس کے چوری کیئے روپے۔ وہ اُسے مارنے لگی۔ نوید زور و شور سے رونے لگا۔ اس کی چیخیں باہر اماں اور چاندنی کے کانوں میں بھی جانے لگیں۔

اماں اور چاندنی باہر سے دروازہ پیٹنے لگیں. چاندنی بھی رونے لگی۔
لیکن ڈھیٹ نوید نے اشفاق کا نام لیا ہی نہیں۔

اس نے اشفاق سے حلف لیا تھا. وہ کبھی کسی کو اس کا نام نہ بتائے گا۔ اور یہ ثبوت اس حلف پر قائم رہنے کا اس نے ماں کو دیا تھا۔

ماں کی نظروں میں وہ چور بن چکا تھا. تارا۔ باورچی خانے سے انگیٹھی میں جلتے کوئلے اٹھا لائی۔ اس وقت اس کی کیفیت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی ۔ امی. امی. چاندنی ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

اماں نے نوید کو اپنے دامن میں چھپا لیا. ورنہ وہ سچ مچ نوید کے جسم کو آج جھلسانے کا تہیہ کر چکی تھی ۔

نوید کو مار کر تارا خود بھی منہ لپیٹ کر بستر پر گئی. نہ آج گھر میں کھانا پکا اور نہ ہی کسی نے کھانا کھایا. اماں نے پڑوسی کے نوکر سے بازار سے روٹی منگوا کر بمشکل بچوں کو کھلائی۔

لیکن تارا سے تو ایک نوالہ نہ کھایا گیا۔

کھانا کھا کر۔ نوید روئی روئی آنکھوں اور سوجے منہ کے ساتھ پھر باہر نکل گیا۔ آج اس کا بغاوت کا موڈ تھا۔ اب وہ اتنا نا سمجھ نہ رہا تھا. کہ مار کھا کر بھی۔ احتجاج نہ کرتا۔

اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی. وہ دکھتے جسم کے ساتھ پیدل ہی اشفاق کے گھر کی طرف چل پڑا۔

رات نوید گھر نہ آیا۔ اور تارا رات بھر تڑپتی رہی۔ جاگتی رہی۔ اس کا انتظار کرتی رہی۔ طرح طرح کے وہم اُسے ستاتے رہے۔ اماں الگ بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہاتی رہیں۔ نہ جانے وہ بیٹی کے اور کتنے دکھ دیکھنے کے لئے زندہ تھیں۔

وہی بیٹی جس کو اماں نے پھولوں کی طرح پالا تھا۔ شہزادیوں کی طرح پالا تھا۔ جو رنگ روپ میں حوروں کی مانند تھی۔

لیکن کیسی سیاہ قسمت والی تھی۔ اُسے تو صرف اس کی قسمت نے ڈسا تھا۔ اور قسمت کے لکھے کو دولت والے اپنے روپے پیسوں دولت کے انبار سے بھی نہیں مٹا سکتے۔ اور تارا تو غریب تھی۔

نوید رات گذر جانے کے بعد آیا رات اس نے اشفاق کے یہاں بسر کی تھی۔

لیکن تارا نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا۔ کہ وہ اتنے عرصہ کہاں رہا۔ وہ اب بیٹے کی ڈھیٹ فطرت سے واقف جو ہو چکی تھی۔

ہاں اس کی صورت دیکھ کر اُسے قرار آگیا۔ کہ نوید ہر آفت سے محفوظ تھا۔

نوید وقت پر کتابیں اٹھا کر اسکول چلا گیا۔ وہ ماں سے خود بھی ناراض تھا۔ ایک لفظ نہ بولا۔ تارا سے۔

اور تارا پھر اپنی بربادی پر کھل کر رونے لگی۔ اس نے سپنا دیکھا تھا۔ اس کا بیٹا بڑا آدمی بنے گا۔ ڈاکٹر۔ یا پائلٹ۔

یا پھر انجینئر۔ لیکن نوید میں کچھ نہ بننے کے آثار تھے۔ نوید تو بھٹک گیا تھا۔ اس عمر میں آوارہ ہو گیا تھا۔

جن بچوں کے سر پر باپوں کا سایہ نہیں ہوتا۔ کیا وہ ایسے ہوتے ہیں؟ وہ اماں سے پوچھنے لگی۔

"اکیلی عورت کب اولاد کو پروان چڑھا سکتی ہے۔ صحیح تربیت نہیں کر سکتی وہ۔ اماں نے یہ کہہ کر اس کا دل توڑ دیا۔

اور اماں تارا کے لئے ایک نیا خیال دل میں بسا کر گہری سوچوں میں گم ہو گئیں۔

رشیدہ اماں کی ملنے والی تھیں۔ پچھلے دنوں اُن سے ملنے آئیں تو ایک انوکھی بات ان کے کان میں ڈال گئیں۔ اماں کا ایک مرض بڑھاپا تھا۔ دوسرا تارا کی فکر تھا۔

"تم تارا کا دوسرا نکاح کیوں نہیں کر دیتیں" رشیدہ نے مشورہ دیا۔

"کیا" اماں چونکیں۔

"ہاں" تارا اور اس کے بچوں کا مستقبل اس طرح ہی سنور سکتا ہے۔ بھلا تارا کی مشین کب تک اس کا ساتھ دے سکتی ہے۔

رشیدہ نے صحیح کہا تھا۔

انسان ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ تو پھر انسانوں کے ہاتھوں کی بنائی مشین کب تک ساتھ دے گی۔ پھر کیا تارا بھی ایک نہ ایک دن ہمت ہار دے گی۔

اور اماں کو محسوس ہو رہا تھا۔ تارا نے ابھی سے ہمت ہار دی ہے۔ لیکن۔ دو بچوں کی ماں سے کون گھر آباد کرے گا۔ اماں کو یہ فکر ہوئی ہے میری نظر میں ایک گھرانہ۔ رشیدہ بڑی ہمدرد تھیں۔ نور صاحب ادھیڑ عمر کے ہیں۔ بے اولاد رہے ہیں عمر بھر۔ پھر بھی دوسری شادی نہ کی۔ اب بیوی مر چکی ہے۔ تو پھر سہارے کے لئے دوسرا گھر بسانا چاہتے ہیں۔

لاکھوں والے ہیں وہ۔ سچ مچ تارا اور اس کے بچوں کو دل میں بٹھا کر رکھیں گے۔ رشیدہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ تم تارا سے بات کرنا۔ میں پھر آؤں گی۔ وہ جاتے جاتے بولیں۔ اور پھر اماں سنہرے سنہرے سپنے دیکھنے لگیں۔

———

دل کہنے لگا۔ تارا کی بگڑی قسمت سنور سکتی ہے۔

لیکن تارا سے یہ سب کچھ کہتے ڈرتی تھیں۔ ایک بار موقع پاکر کچھ کہنا بھی چاہا۔ لیکن تارا بھڑک گئی۔ اور یہ دوسرا موقع آج ملا تھا۔

تارا بے حد آزردہ تھی۔ اور اماں سے خود پوچھ رہی تھی۔ کیا جن بچوں کے سر پہ باپ کا سایہ نہیں ہوتا۔

وہ اس کے نوید کی طرح بھٹک جاتے ہیں۔

اماں اچانک بولیں۔ نوید کو باپ مل سکتا ہے تارا۔

کس طرح اماں۔ وہ حیران سی ہو گئی۔

تم دوسرا نکاح کر لو۔ اماں آج کل یہ کیسی باتیں کرنے لگی تھیں اس سے

نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ تارا نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیئے۔

"بچوں کی خاطر تجھے یہ قربانی دینی پڑے گی۔ تارا"۔ اماں نے پھر سمجھایا۔

نہیں اماں۔

یہ گناہ میں نہیں کر سکتی۔

یہ گناہ کب ہے تارا۔ اماں اُسے مسئلے مسائل سمجھانے لگیں۔

لیکن تارا اس وقت ناسمجھ بنی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"میں فرید سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔ اماں وہ آپ لوگوں کے لیئے مر گیا میرے لیئے وہ اب بھی زندہ ہے۔

میں کب تنہا رہتی ہوں۔ وہ تو میرے ساتھ رہتا ہے"۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔

اماں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن تارا ضد میں آ گئی۔ میرا نکاح تو اب موت کے ساتھ ہو گا۔ جان دے دوں گی۔ اماں۔ لیکن پھر سہاگ کا جوڑا نہیں پہنوں گی۔

اب تو دن آ رہے ہیں:

میری چاندنی کے بیاہ کے۔ نوید کے بیاہ کے۔

وہ پھر اوندھے منہ لیٹ کر۔ آنسوؤں سے اپنا تکیہ بھگونے لگی۔

اور اماں بیچاری گنگ ہو گئیں۔ اور بولنے کو ان کے پاس رہا بھی کیا تھا۔

شہید آج کتنے بے حساب سالوں کے بعد۔ پھر اس سرزمین پر آیا تھا

لیکن۔ یہاں آکر وہ اداسی میں ڈوب گیا۔

یہاں سے گیا تھا تو۔ کتنی چاہت سے رخصت کیا تھا اس کو۔

اس کے سارے اپنے موجود تھے۔

ماں کی چاہت، بھائیوں کی محبت۔ دعاؤں کے ساتھ وہ رخصت ہوا تھا۔ لیکن اس کا استقبال کرنے کو کوئی بھی موجود نہ تھا۔

اس کے اپنے تو بکھر چکے تھے۔ بچھڑ چکے تھے۔

ماں اور بڑا بھائی۔ موت کی وادی میں بھٹک گئے تھے۔ چھوٹے بھائی بھی اپنی اپنی دنیا میں گم تھے۔ اور شہید میاں آتے ہی غم و یاس کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔

اسے بیتے دنوں کی یاد آگئی۔

ماضی کے دھندلکے۔ دھندلکے۔ سائے۔ روشن خاکوں میں ابھر کر نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔

وہ باتیں۔ وہ یادیں۔ جن کو اس کا ذہن فراموش کر چکا تھا۔ پھر

پلٹ آئیں۔ تم۔ ہمیں نہیں بھولے۔

تم ہمیں نہیں بھولے"۔

جیسے کی صدا اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

سچ مچ وہ کسی کو نہ بھولا تھا۔

کسی کو بھی تو نہیں۔

اسے ساری باتیں رفتہ رفتہ یاد آنے لگیں۔

شہید صرف نام کا ہی شہید نہ تھا۔

بلکہ۔ اس نے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں۔ راحتیں۔ سکون سب کچھ راہِ محبت میں صحیح معنوں میں شہید کر ڈالی تھیں۔

شہید نے محبت کی تھی۔

پرخلوص محبت۔

انوکھی محبت۔

ہیر رانجھا۔ سوہنی مہینوال۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد سی محبت۔ لیکن وہ خود رانجھا تھا۔ فرہاد تھا۔ مجنوں تھا۔

اور اس کی محبوبہ۔

وہ تو بے وفا تھی۔

منزل پر پہنچ کر اُسے دغا دے گئی تھی۔

لیکن اظہار محبت تو بے حد اچھی طرح ہوا تھا۔

شہید ان دنوں انٹر سائنس کا طالب علم تھا۔

ان دنوں کالج میں فرسٹ ائر میں نئے داخلے ہو رہے تھے :
اور نئی آنے والی لڑکیوں میں عالیہ بھی تھی ۔
سب میں ۔ نمایاں حیثیت کی ۔
حالانکہ وہ حسین صورت نہ تھی ۔ بلکہ وہ تو معمولی نقش و نگار کی سانولی سانوی صورت والی لڑکی تھی ۔
لیکن اُسے پہننے اوڑھنے ۔ بننے سنورنے کا ڈھنگ آتا تھا ۔
وہ بے حد اسمارٹ تھی ۔
اپنے لباس اور نفاست کی وجہ سے ۔ سب میں منفرد نظر آیا کرتی تھی ۔
اور پھر اس کی امارت بھی سب کو مرعوب کرتی ۔ عالیہ کا باپ کروڑ پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور تھا ۔
اس کی نت نئے ماڈلوں کی ان گنت کاریں ۔ اس کی امارت کا منہ بولتا ثبوت جو تھیں ۔
عالیہ کو خود بھی ڈرائیونگ آتی تھی ۔
اکثر وہ سفید لمبی سی بیوک خود چلا کر لاتی ۔
اور پھر جب تک عالیہ کالج میں رہتی اس کی کار گراونڈ میں گھنے درختوں کے سائے تلے کھڑی رہتی ۔ یا پھر کبھی ڈرائیور لاتا ۔ جس کا لباس بھی سفید برف سا اجلا اجلا ہوتا ۔
وہ مخلوط تعلیمی ادارہ تھا ۔ لڑکیاں لڑکے آپس میں فری بھی تھے ۔
چند شرمیلی شرمیلی لڑکیاں پہلے پہل کالج کی سرزمین پر ۔ قدم رکھ کر

گھبراتیں ـــــ

پہلے اگر کوئی لڑکا کبھی ان کو مخاطب کر بھی لیتا تو ان کو سچ مچ پسینہ آنے لگتا۔ شوخ اور شریر فطرت لڑکے۔ شروع شروع میں ایسی لڑکیوں کو خوب چھیڑتے۔

دور دور سے ان پر ریمارکس پاس کرتے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہی لڑکیاں اس ماحول میں رنگ جاتیں۔

اپنے کلاس فیلوز سے بے تکلفی ہو جاتی۔ چند ایک کے افیئر بھی مشہور ہو جاتے۔

لیکن یہ جو عالیہ آتی تھی نا۔

یہ تو تھی دوسری شے۔ پہلے گرلز کامن روم کے قریب آکر اس کی کار رکتی۔ ڈرائیور اپنی سیٹ سے اتر کر اس کے لئے دروازہ کھولتا۔

وہ گردن اکڑا کر باہر نکلتی۔ پھر کامن روم میں چلی جاتی۔

لڑکوں سے بات کرنا دوسری بات تھی۔ اس نے تو اب تک لڑکیوں کو بھی منہ نہ لگایا تھا۔

سارے لڑکے اس کی پرسنیلیٹی سے مرعوب تھے۔

سر سے پیر تک عالیہ روز چمک کر آتی۔ سفید برف سا اجلا لباس۔ چمکتے جوتے۔ سیٹ ہوئے چھوٹے چھوٹے بال۔

آنکھوں پر دھوپ کا بڑے سے فریم کا چشمہ۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک۔ پاس سے گذرتی تو دلفریب خوشبوؤں کے جھونکے چھوڑ جاتی۔

نہ جانے کون سا پرفیوم استعمال کرتی وہ۔

ایک بار فائنل ائر کے جاوید نے سیڑھیوں پر اسے فطرت کے مطابق کوئی شوخ سا جملہ کس دیا تھا اور اس پل عالیہ کے چہرے کا ہر زاویہ بگڑ سا گیا تھا۔

پھر وہ کھٹ پٹ کرتی۔ واپس سیڑھیاں اتر گئی۔ تھوڑی دیر بعد جاوید کی پرنسپل روم میں پیلیشی ہوئی۔ اس کی شکایت لگانے والی عالیہ تھی۔

جاوید کو عالیہ کے اس اقدام پر۔ سب کی نظروں میں نیچا ہونا پڑا۔ لڑکیوں کو اس طرح چھیڑنے پر۔ تمہیں ڈس کا لجیٹ کیا جا سکتا ہے۔ پرنسپل نے اسے خوب لتاڑا۔ بے عزت کیا۔

عالیہ کی اس حرکت پر۔ جاوید کے ساتھ ساتھ۔ سب کا دل عالیہ سے بُرا ہو گیا۔ سچ مچ لڑکوں نے اپنے دلوں میں اس کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا۔

کوئی اُسے منہ نہ لگاتا۔

کوئی لفٹ نہ دیتا۔ اور پھر ان دنوں کالج میں الیکشن ہونے لگے۔ یونین کے صدر کے لئے سب نے شہید کا نام بھی الیکشن لڑنے والوں میں چنا۔

بس۔ بس۔ نہ بابا۔ نہ۔ شہید نے اپنے کانوں کو چھوا۔ میں مفلس آدمی۔ پھوٹی کوڑی خرچ نہیں کر سکتا۔

پھر تو جیتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہم جو ہیں۔ ہم۔ تم پر مٹیں گے۔ خون بہا دیں گے۔ لیکن تمہیں جتا کر رہیں گے۔ اس کے ساتھی شہید کو یقین دلانے لگے۔ جیت تمہاری ہوگی، جیت ہماری ہوگی۔ دوست شہید کو الیکشن لڑنے پر بری طرح اُبھارنے کی کوشش میں تھے۔ کالج کا ماحول ان دنوں سخت انقلابی قسم کا ہو رہا تھا۔ گروپ بندی ہوگئی تھی۔ الگ الگ پارٹیاں بن گئی تھیں۔

عہدے کی خاطر۔ دوست دشمن بنے ہوئے تھے۔ رئیس زادے دھڑا دھڑ پیسہ لٹا رہے تھے۔ سب کو

لیکن شہید کوئی رئیس زادہ نہ تھا۔ وہ تو غریب گھرانے کا تھا۔ اس کی تعلیم کا خرچ بھی بمشکل پورا ہو رہا تھا۔

کیونکہ وہ بغیر باپ کے تھا۔ اور جن بچوں کے باپ اپنے بچوں کی نوعمری میں دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ تو وہ بچے ـــ دولت کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن شہید ذہانت۔ قابلیت اور وجاہت کے لحاظ سے کالج میں نمایاں تھا۔ میٹرک میں اس نے ٹاپ کیا تھا۔ اور وظیفہ پایا تھا۔

صرف قابلیت کی بنا پر۔ اُسے شہر کے اس اونچے درجے کے کالج میں داخلہ ملا تھا۔ جہاں صرف بڑوں بڑوں کی پہنچ تھی۔

شہید۔ اپنے گھر میں پھیلے مفلسی کے اندھیرے دور کرنے کا خواہاں تھا۔ وہ مستقبل کا ڈاکٹر تھا۔

اس نے یہی خواب دیکھا تھا۔

جس کی کھلی آنکھوں سے وہ تعبیر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

لاکھ دوستوں کے اصرار پر وہ الیکشن لڑنے پر آمادہ نہ تھا۔لیکن ایک دن وہ آپ ہی آپ راضی ہو گیا۔

صرف عالیہ کی وجہ سے۔ اس شام وہ واپسی پر بس اسٹاپ پر کھڑا تھا کہ عالیہ کی کار اس کے نزدیک گئی۔

اور عالیہ کار سے اتر کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اتنے قریب۔ کہ خوشبوؤں میں بسی عالیہ کی خوشبو۔ شہید کے حواس پر چھانے لگی۔ عالیہ کو قریب پا کر وہ گھبرانے لگا، شرمانے لگا۔

"مسٹر شہید آپ الیکشن کیوں نہیں لڑ رہے"۔ جی مجبوری ہے۔ شہید نے سر جھکا کر کہا۔

مجبوری کا کوئی احساس اپنے قریب پھٹکنے بھی نہ دیں آپ۔

میں آپ کے لئے کنویسنگ کروں گی۔ سب کچھ کروں گی۔ آپ صرف ہاں کر دیں۔ اس نے کار کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

لیکن۔ اس میں آپ کا کیا فائدہ۔ شہید نے آگے بڑھتے ہوئے سوال کیا۔ یہ میری خواہش ہے۔ کہ آپ ہی یونین کے صدر منتخب ہوں۔

وہ کار میں بیٹھ کر نظروں سے جب تک اوجھل نہ ہوئی۔ شہید کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

میں صدر منتخب ہوں۔ یہ عالیہ کی خواہش ہے۔ کیوں۔ ؟۔ کیوں ؟۔

وہ کیوں میری جیت پسند کرتی ہے۔

شہید الجھ گیا۔ لیکن اس نے عالیہ کی خواہش پر انتخابات میں حصہ

لینے کا اعلان کر دیا۔ ان دنوں کالج میں پڑھائی وغیرہ تو برائے نام ہوتی۔ دن بھر ہنگامے جلسے اور جلوس ہوتے۔ مخالف گروپ ایک دوسرے سے ٹکراتے۔

عالیہ بھی کالج کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگی۔ وہ اکثر جلوس کی قیادت کرتی۔ اس جلوس کو صرف کالج کے احاطے میں رہنے کی اجازت تھی۔

جب دو جلوسوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا۔ تو مزہ آجاتا۔

ایک دوسرے پر جملوں کے تیر برسائے جاتے۔ چوٹیں کی جاتیں۔

شہید سچائی پر سچ مچ شہید ہو جائے گا۔

لیکن ہارے گا نہیں۔

جیت شہید کی ہوگی۔

جیت ہماری ہوگی۔

دوسری طرف نعرے لگتے۔

جیت اقبال کی ہوگی۔

جیت عرفان کی ہوگی۔

تم ہار وگے۔

میدان سے بھاگو گے۔

شہید کی پارٹی بھی چپ نہ رہتی۔

تم زور لگالو۔ ہم جیتیں گے۔

تم شرط لگالو۔ ہم جیتیں گے۔

تم پیسہ لٹادو۔ ہم جیتیں گے۔

وہ لوگ تالیاں پیٹتے بگل بجاتے۔ ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے۔

کبھی مارے جذبات کے ہاتھا پائی ہو جاتی۔

مخالف گروپوں کی لڑکیاں ایک دوسرے سے الجھ پڑتیں۔ بال نوچ ڈالتیں۔ دوپٹے پھٹ جاتے ایک بار عالیہ کے منہ پہ بھی خراشیں آگئیں۔ نیا دوپٹہ چھید چھید ہو گیا۔

اس نے بھی زوردار تھپڑ مار کر —— مخالف گروپ کی لڑکی کا ایک دانت سچ مچ ہلا دیا۔

لڑکے بھی مار کٹائی پر آمادہ ہو جاتے۔

اور اقبال کے گروپ کے لڑکے تلملا جاتے۔ اے تم تو سچ مچ کے غنڈے ہو۔ ٹھیک ہے۔ وہ سب مل کر انہیں چڑاتے۔

تم غنڈے بلوالو۔ ہم جیتیں گے۔

تم ڈنڈے لگوالو۔ ہم جیتیں گے۔

تم پولیس کو بلوالو۔ ہم جیتیں گے۔

دونوں گروپوں کی آپس میں ٹھنی ہوئی تھی۔ چند اور چھوٹی موٹی پارٹیاں تو آپ ہی آپ میدان چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں۔

بس اقبال اور شہید کا مقابلہ رہ گیا تھا۔

اقبال کا باپ مل کا مالک تھا۔ اقبال دل کھول کر باپ کی دولت لٹا رہا تھا۔ روز میٹنگ میں زبردست قسم کی چائے پانی کا انتظام کیا جاتا۔

اس کا مال کھا کھا کر اس کے ساتھی۔ اس کی وفاداری کا پختہ عہد کر رہے تھے۔

اور ساتھ ساتھ اقبال کو یہ یقین دلا رہے تھے۔ کہ شہید کا اس کے ساتھ کیا مقابلہ۔ شہید نہیں جیت سکتا۔

بھلا دیکھنا آج نہیں تو کل میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

اقبال بڑے بڑے وعدے کر رہا تھا۔

میں کالج کا سارا انتظام بدل ڈالوں گا۔ میرا دور اس کالج کا سنہرا اور یادگار دور ہو گا۔

دوسری طرف شہید کے ساتھیوں کو اس کی جیت کی قوی امید تھی۔ عالیہ تو شہید کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اپنا پیسہ بری طرح خرچ کر رہی تھی۔ اور شہید اس کے احسان کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔

کتنا غلط سمجھا تھا سب نے عالیہ کو۔ وہ تو بڑی اچھی پُرخلوص سی لڑکی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے وہ پوسٹر بنا کر لاتی۔ بینر بناتی۔ پھر مخالف پارٹی کے پوسٹرز پھاڑنے کا کام بھی عالیہ اور اس کے ساتھیوں کا تھا۔

روز نئے پوسٹرز لگائے جاتے۔ روز پھاڑے جاتے۔

عالیہ بڑی انقلابی اور جذباتی قسم کی لڑکی تھی۔

اس میں سیاست کا شعور بہت زیادہ تھا۔ کبھی بحث کے موڈ میں آتی تو سب کو خاموش ہونا پڑتا۔

ایک بار اس نے جان پر کھیل کر تیسری منزل کی ریلنگ عبور کر کے پتلی

سی کنگرے پر چل کر کالج کی عمارت کی پیشانی پر شہید کے نام کا پوسٹر لگا ڈالا۔

یہ تو جان جوکھوں کا کام تھا۔

اگر۔ ذرا بھی پاؤں ڈگمگاتا تو وہ گر پڑتی۔ تیسری منزل سے نیچے پختہ گراؤنڈ میں آ پڑتی۔

اس طرح وہ شہید کی خاطر سچ مچ شہید ہو جاتی۔ پھر وہ دن آ گیا جس دن پولنگ تھی۔ اس دن نعرہ بازی ختم ہو گئی۔ سنجیدگی سے ووٹ ڈالے گئے۔

لڑکیوں نے چپکے چپکے منتیں مان لیں۔

اگر ہار گئے تو سبکی ہوگی۔ بے عزتی ہوگی۔ یہی ڈر اب ستا رہا تھا۔ عالیہ کی صورت تو یہ بتا رہی تھی۔

کہ وہ رات بھر جاگی ہوگی

پھر پولنگ ختم ہو گئی۔ ووٹوں کی کاؤنٹنگ ہونے لگی۔

دل دھڑکنے لگے۔

ساعتیں رکنے لگیں۔ سردی کے زمانے میں بھی سچ مچ پسینہ آنے لگا۔

جب تک نتیجہ نہ آیا۔

سب کے سب کالج میں جمے رہے۔

ایک دوسرے پر طعنوں کے تیر برساتے رہے۔

اعلان ہو گیا۔

جیت شہید کی ہوئی تھی۔

جیسے سب کو عید کی سی خوشی مل گئی۔ لڑکے ایک دوسرے سے

گلے ملنے لگے۔ ناچنے لگے۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں۔
ان کی پارٹی اکثریت سے جیتی تھی۔
ہارنے والوں کے منہ لٹک گئے۔ بے ایمانی ہوئی ہے۔ یہ ہوا ہے وہ ہوا ہے۔ وہ لوگ دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگے۔
پھر بجھے دل سے اپنی ہار مان گئے۔ اور کرتے بھی کیا بے چارے۔
شہید کی کامیابی کی خوشی میں عالیہ نے اپنے بنگلے پر زبردست ڈنر کا اہتمام کیا۔ وہ بزنس مین کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ کروڑپتی تھا۔
عالیہ دولت خرچ کرنے کے معاملے میں بڑی شاہ تھی۔
اس رات شہید کو ڈنر میں سب میں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہ تقریب اسی کے اعزاز میں تو عالیہ نے دی تھی۔ عالیہ نے شہید کو سچ مچ آسمان کی وسعتوں پر پہنچا ڈالا تھا۔ اُسے کیا سے کیا بنا ڈالا تھا۔ شہید کو اپنے آپ پر غرور ہو چلا تھا۔ عالیہ جیسی لڑکی جو خود کالج کی سب سے اہم شخصیت جانی جاتی۔ اس کا کتنا ساتھ دے رہی تھی۔
ڈنر میں عالیہ نے کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کے علاوہ۔ اپنے کچھ اور دوستوں اور رشتے داروں کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ بڑی اچھی GATHERING تھی سب ہی اچھے قسم کے لوگ تھے عمدہ عمدہ لباسوں میں۔ مردوں کے سوٹ چمک رہے تھے۔ لڑکیوں کے لباس جھلملا رہے تھے۔ آج شہید نے بھی اپنا سب سے عمدہ لباس زیب تن کیا تھا۔ گرے کلر کا ایک اکلوتا تو سوٹ تھا اس کے پاس پھر اس نے نئی خوبصورت سی ٹائی آج ہی خریدی تھی۔

شہید آج اپنی وجاہت کے اعتبار سے سب میں نمایاں تھا۔

اور عالیہ نے بھی آج کھلے الفاظوں میں اس کی تعریف کر ڈالی۔ تو وہ کچھ شرما سا گیا۔ اس کے چہرے پر ایک سرخ سی لہر دوڑ گئی۔

سفید لباس میں عالیہ کی رنگت آج کچھ دبی دبی سی تھی۔ وہ کوئی خاص جچ نہ رہی تھی۔ لیکن شہید کا دل اور نظریں بس عالیہ کی طرف کھنچے جا رہی تھیں۔ عالیہ۔ اسے بھا گئی تھی۔

کیسی انجان سی غلطی کر بیٹھا تھا وہ۔ اس کا دماغ ابھی اتنا مجبور کب ہوا تھا۔ وہ تو انٹر سائنس میں پڑھنے والا۔

ایک نو عمر سا لڑکا تھا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو نہ چاہا تھا۔

لیکن اب اس کے خیالات بہکنے لگے تھے۔ بھٹکنے لگے تھے۔

وہ عمر کے اس دور میں تھا۔ جب امنگیں خود بخود جوان ہو جاتی ہیں۔ اس کی سوچیں اب تک پاکیزہ تھیں۔

لیکن اب عالیہ کا تصور اسے گمراہ کرنے لگا تھا۔ وہ الجھنے لگا تھا۔ خوابوں کے خیالوں کے تانوں بانوں میں۔ ان تصورات میں۔ جو حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں۔

بند آنکھوں میں بھی عالیہ سما گئی۔

وہ عالیہ سے محبت کرنے لگا۔ اسے چاہنے لگا۔ اس کی یادوں میں راتیں بے خواب کرنے لگا۔ اب اس سے دلجمعی سے پڑھا بھی نہ جاتا۔

کتاب کے صفحے پر نظریں ضرور ہوتیں۔ لیکن دماغ۔ وہ تو عالیہ کی طرف

ہوتا۔ اس کا دل اب اس کا کہاں رہا تھا۔

وہ تو باغی ہو چکا تھا۔

اظہارِ محبت کی جرأت اس میں نہ تھی۔

وہ بے باکی نہ کر سکتا تھا۔ چپ چپ سرد آگ میں جلنے لگا۔

اب عالیہ کی چاہت کے ساتھ ساتھ۔ اس کی قربت کا خواہاں بھی تھا۔

وہ دونوں روز ہی کالج میں ملتے۔ الیکشن کے ہنگاموں کے بعد کالج کی زندگی پھر معمول پر آگئی تھی۔ پڑھائی کا دور پھر شروع ہو چکا تھا۔

یونین کا صدر منتخب ہو جانے کے بعد۔ شہید کی ذمہ داریوں میں اب کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ صدر کی حیثیت سے اس پر کافی کام آپڑے تھے۔ وہ ایک احساسِ ذمہ داری لے کر اپنی مصروفیات میں گم ہو گیا۔ یونین کے نظام میں اس نے کافی اصلاحات کیں۔

وہ حد درجہ شریف اور دیانتدار لڑکا تھا۔ ذہانت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنی شخصیت اور قابلیت کی وجہ سے وہ کالج میں ممتاز نظر آتا۔

اسکول سے لے کر کالج تک اُسے ہمیشہ وظیفہ ملا تھا۔ اس کا مستقبل محنت کی لگن کی وجہ سے بڑا شاندار نظر آتا تھا۔

کالج میں سارے استاد شہید کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور اسی طرح عالیہ بھی پسندیدہ شخصیت کی حامل تھی۔

عالیہ اور شہید دوست تھے۔ الیکشن کی سرگرمیوں میں وہ اس کے بہت

قریب آچکی تھی۔ اس نے اپنی ذات پر چڑھا ہوا خول اتار پھینکا تھا۔ اب وہ بھی پہلے جیسی ٹھاٹ بھاٹھ سے کالج آتی۔ لیکن اب وہ الگ تھلگ نہیں رہتی۔ بلکہ اس کی اپنے ہم جماعتوں سے بے حد دوستی تھی۔ شہید اس سے سینئر تھا۔ لیکن اکثر فری پریڈز میں اس کی شہید سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ وہ شہید سے کافی فری ہو چکی تھی۔

پتہ ہے آپ کو۔ کیوں چاہتی تھی۔ جیت صرف آپ کی ہو۔ ایک بار اس نے شہید سے کہا۔

کیوں۔؟ شہید کا دل دھڑکنے لگا۔

اس لئے کہ آپ مجھے کالج کے سارے لڑکوں سے مختلف لگے۔ میں نے نہ آپ کو کبھی لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرے دیکھا اور نہ ہی کسی قسم کی چھچھوری کرتے دیکھا۔ وہ سچ مچ شہید کی تعریف کے موڈ میں تھی۔

اور عالیہ کے اس انداز پر شہید کا خون سیروں بڑھ گیا۔

عالیہ کہہ رہی تھی۔ میں نے تنقیدی نظروں سے سب کا جائزہ لیا۔ سب کو پرکھا۔ مجھے بس آپ ہی مناسب لگے۔ اور پھر آپ کا جائز مقام دلانے کے لئے۔ میں بھی میدان میں اتر آئی۔

اوہو۔ بڑا اکرم کیا آپ نے ہم پر۔ ورنہ ہم اس قابل کہاں تھے۔ شہید نے انکساری سے کہا۔ اکثر وہ دونوں کالج لائبریری میں بیٹھ کر گھنٹوں باتوں میں مصروف رہتے۔

کالج میں۔ عالیہ اور شہید کے بارے میں بھی افواہیں اڑنے لگی تھیں۔ وہ دونوں ان باتوں سے لاپرواہ تھے۔

عالیہ عام قسم کی لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ انقلابی ذہن رکھتی تھی۔
اسے شہید کی لائن پسند نہ تھی۔ آپ نے یہ ڈاکٹر بننے کا کیوں سوچا۔
ایک بار وہ اس مسئلے پر شہید سے الجھ گئی۔

لوگوں کی خدمت کرنے کے واسطے بیماری دور کرنے کی خاطر وہ بتاتا۔

اونہہ۔ وہ ناک سکیڑتی۔ کم ڈاکٹر ایسے ہمدرد ہوتے ہیں۔ ورنہ سب مفاد پرست ہوتے ہیں اور پھر مجھے یہ پروفیشن۔ ڈاکٹروں کا۔ بزنس مین کا۔ بالکل پسند نہیں وہ شہید کو اپنی پسند بتانے لگی۔

تو پھر آخر آپ کو کس قسم کے لوگ پسند ہیں۔ شہید اس سے اس کی پسند پوچھتا۔

مجھے۔ وہ سکون سے اپنی آنکھیں موند لیتی۔

" انقلابی ذہنیت والے۔ شورش فساد کرنے والے۔ سیاست میں حصہ لینے والے جلسے جلوسوں کی قیادت کرنے والے۔ عالیہ نے سچ مچ شہید کو بجھا دیا۔ وہ سخت ہنگامہ پرور خیالات کی لڑکی تھی۔

شہید اور وہ دونوں مختلف خیالات کے مالک تھے۔

عالیہ کی باتیں سن کر شہید کا دل بجھ سا گیا۔

وہ عالیہ کا آئیڈیل نہ تھا۔

عالیہ کو سیاست کے بارے میں بڑی معلومات حاصل تھیں۔ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے ملکوں کی سیاست کے بارے میں بھی گھنٹوں گفتگو کر سکتی تھی۔

اور شہید کو اس سیاست وغیرہ کے چکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ عالیہ

سے اس موضوع پر بحث کرتے گھبراتا۔

اور عالیہ منہ بنا کر کہتی۔ اُف بڑے بور ہیں آپ۔

اور شہید کا منہ اتر جاتا۔ کالج میں سالانہ فنکشن تھا۔ پورے ہفتے جشن منایا جانے والا تھا۔ ایک دن مشاعرہ۔ دوسرے دن مباحثہ۔ اس طرح ہر دن ایک نیا پروگرام پیش کیا جانے والا تھا۔ سب سے آخر والے دن ڈرامہ رکھا گیا۔

اور ڈرامہ بھی۔ بے حد رومینٹک سا۔ محبت کی ناکام داستان۔

کنیز اور شہزادے کی محبت کا کھیل۔ انارکلی ڈرامہ اسٹیج کیا جانے والا تھا۔ کرداروں کا انتخاب ہوا۔

اصرار سے ہیرو شہید کو منتخب کیا گیا۔ اور ہیروین عالیہ کو۔ ہیروین بننے پر عالیہ بالکل راضی نہ ہوئی۔

اللہ۔ میں۔ میں۔ میں کس طرح انارکلی بن سکتی ہوں۔ کتنی لڑکیاں ہیں اور خوبصورت حسین۔ آپ ان کو لیں نا۔

لیکن سب کو شہید کے ساتھ جوڑی عالیہ کی ہی مناسب لگی۔ آخر وہ راضی ہو گئی۔ اور پھر ڈرامے کی ریہرسل شروع ہو گئی۔

عالیہ انارکلی کے روپ میں جب شہید سے جذباتی محبت بھرے بول بولے گی۔ یوں اس طرح کے۔

"میرے ہوش حواس گم ہیں سلیم تمہارے ہوتے ہوئے میں کیوں بیہوش ہونے لگی۔

مجھے پہچانو شہزادے۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے"
اور شہید ایک عالم میں ڈوب کر یہ بول ادا کرتا۔
تو میرے دل کے سنگھاسن پر بیٹھ کر حکومت کرے گی۔ تو میری ملکہ ہو گی
اور میں تیرا غلام۔
اور پھر انارکلی کہتی۔
وہ مجھے تم سے چھین لیں گے۔ محبت بچھڑ جائے گی۔ پھر کیا ہو گا؟
اور شہید کا دل سچ مچ دھڑکنے لگتا۔
اگر واقعی اس سے عالیہ کی محبت چھن گئی تو پھر کیا ہو گا۔
پھر محبت کا یہ جھوٹا کھیل کھیلتے کھیلتے وہ دونوں بہت دور نکل گئے۔
شہید کو عالیہ کے دل کا حال بھی معلوم ہو گیا۔
عالیہ بھی شہید پر مرمٹی تھی۔ دونوں شانہ بشانہ محبت کی راہوں میں آگے
بڑھنے لگے۔ کہ پھر واپس آنا مشکل تھا۔
ناممکن تھا۔
انارکلی ڈرامہ بے حد کامیاب رہا۔ عالیہ اور شہید کو خصوصی انعام بھی ملا۔
لیکن عالیہ اور شہید کے لئے یہ انعام کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا۔
دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی محبت کا آغاز جو بخش ڈالا تھا۔
عالیہ۔ عالیہ۔ عالیہ۔ شہید کے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ سچ مچ اس کی
راتوں کی نیند لے گئی تھی۔ دل کا سکون لے گئی تھی۔
ایک بے قراری بخش گئی تھی۔ عجیب سی بیقراری۔ کہ شہید کا دل کسی چیز

میں نہ لگتا نہ پڑھائی میں نہ تنہائی میں۔ نہ گھر میں اور نہ کالج میں۔

شاید یہی حال عالیہ کا بھی تھا۔ وہ اس کی پہلے کی غلط فہمی دور کرتی۔ میں آپ کو آزمانے کے لئے۔ ایسی باتیں کرتی تھی۔ کہ آپ میرا آئیڈیل نہیں۔ ورنہ مجھے آپ کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا تھا کہ جسے میں کب سے تلاش کر رہی ہوں۔ وہ روپ آپ کا ہے۔

اچھا۔ شہید خوش ہو جاتا۔ سرور و کیف کے نشے میں ڈوب جاتا۔

دونوں ملتے گئے۔ چوری چھپے۔

عالیہ اگرچہ آزاد خیال گھرانے کی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی محبت اپنے گھر والوں سے چھپا رکھی تھی۔ اس کو پتہ تھا اس کا دولت مند باپ اپنی اکلوتی بیٹی کا۔ ایک غریب لڑکے سے عمر بھر کا ساتھ پسند نہ کرے گا۔

لیکن پھر بھی عالیہ۔ شہید سے کہتی:

میں تمہاری ہوں شہید صرف تمہاری۔ دولت چھوڑ دوں گی۔ سب کا پیار چھوڑ دوں گی۔ لیکن تم کو نہ چھوڑوں گی وہ جذباتی سی ہو کر شہید کے گھٹنے پہ سر ٹیک دیتی۔

اور اس لمس سے۔ اس قربت کے احساس سے۔ شہید تھرتھرانے لگتا۔ کانپنے لگتا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں جیسے جان نہ رہتی۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔

عالیہ اس کے کس قدر قریب ہوتی۔ اس کے خوب صورت بال۔ جو وہ اکثر کھول کر رکھتی تھی۔ شہید کے گھٹنوں پر پھیلے ہوتے۔

لیکن شرمیلا شہید چاہتے ہوئے ان زلفوں کو اپنے ہاتھوں سے سمیٹ بھی نہ سکتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔

قربتیں بڑھتی گئیں۔

شہید کی جھجک جاتی رہی۔ اپنے مضبوط ہاتھ میں اب وہ عالیہ کا نازک ہاتھ دبا کر پہروں نہ چھوڑتا۔

اس کے جذبات بھڑک بھڑک کر شعلے بن جاتے۔ اس کا جی چاہتا وہ عالیہ کے ساتھ بہت سی بے باکیاں کر ڈالے۔ لیکن پھر فطرت عام جذبات پر قابو پا لیتی۔ وہ حد درجہ شریف لڑکا تھا۔ وہ کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کر سکتا تھا۔ جو اس کی شرافت پر چھینٹیں ڈال سکے۔

سب کچھ تھا۔ اُسے عالیہ سے محبت تھی۔ پاک اور گہری محبت۔ اس کی چاہت پرخلوص تھی۔ من کی کتاب پر فقط اس نے ایک ہی تو نام لکھا تھا۔

وہ تھا عالیہ کا نام۔

عالیہ کی پسندیدگی بھی اس پر ظاہر ہو چکی تھی۔ لیکن شہید کو کبھی یقین نہ آتا۔ کہ عالیہ اس کی بن سکتی ہے۔

عالیہ تو محلوں میں رہنے والی ہے۔ محلوں میں جائے گی۔

پھر ابھی اس کے پاس تھا کیا۔

کچھ بھی تو نہیں۔ اب تک اس نے ایک آنہ بھی نہ کمایا تھا۔ پھر اسے ڈاکٹر بننے کے لئے ایک عرصہ چاہیئے تھا۔

لیکن وہ تو عشق کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ وہ بھی ایک دولت مند گھرانے کی لڑکی کیساتھ جسے اپنانا اس کے لئے کٹھن تھا۔

ابھی تو وہ منزل سے بہت دور تھا۔ منزل تک پہنچنے کے لئے اسے محنت کی ضرورت تھی۔ بے پناہ عرصہ درکار تھا۔ عالیہ کو انتظار کرنا تھا۔ صبر آزما انتظار کبھی اس کا دل کہتا عالیہ اتنا صبر آزما انتظار کر سکے گی۔ ثابت قدم رہ سکے گی۔ دل کی یہ سوچ اسے افسردہ کر دیتی۔

انٹر کے امتحانات ہونے والے تھے۔ اس وجہ سے سارے طالب علم پڑھائی میں گم نظر آتے۔ شہید کو بھی بے حد محنت کرنی تھی۔ وہ بھی تن من سے پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔

امتحانات آئے اور ختم بھی ہو گئے۔ کالج بند تھے اس وجہ سے روز عالیہ سے ملنا مشکل تھا۔ لیکن اکثر وہ کبھی کسی دکان۔ کبھی پبلک بوتھ۔ سے عالیہ کو فون کرتا۔ عالیہ ٹیلی فون موصول کرتی تو دونوں گھنٹوں باتیں کرتے۔

کبھی ملتے بھی۔ کبھی کسی پارک میں کبھی کسی اور پرُسکون گوشے میں۔ یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں عالیہ اور شہید کو بدنام بھی کر سکتی تھیں۔

لیکن دونوں کو انجام کی کب پروا تھی۔

عالیہ ایک روشن خیال والدین کی بیٹی ضرور تھی۔ مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھتی تھی۔ لیکن پسند کی شادی کی اسے اجازت نہ تھی۔

اگر اس کی پسند ان کی طرح اعلیٰ اور رئیس خاندان کا فرد ہوتا تو یقیناً اس کے والدین کو انکار نہ ہوتا۔

لیکن عالیہ کی پسند ایک مفلس لڑکا تھا۔ عالیہ نے سوچ لیا تھا۔ اگر اس کی شادی کی آواز گھر میں آئی۔ تو وہ شہید کا نام لے گی۔ اور اپنے فیصلے پر اٹل رہے گی۔ لیکن ابھی تو یہ دن دور تھے۔ اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی تھی۔ جرنلیزم میں ایم اے کرنا تھا۔ اس کے ڈیڈی کو بھی اُسے پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اور اکثر مذاق میں۔ شہید عالیہ کو چھیڑتا۔ جرنلسٹ اور ڈاکٹر کی جوڑی کیسے جچے گی۔ اور عالیہ صرف ہنسنے لگتی۔

رزلٹ آیا۔ شہید کلاس میں فرسٹ آیا تھا۔ بغیر کسی سفارش کے اسے صرف قابلیت کے بل بوتے پر میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ منزل کی طرف اب وہ پہلا قدم بڑھا چکا تھا۔

چند قدم اور تھے پھر منزل سامنے تھی۔

شہید ہونہار۔ اور لائق لڑکا تھا۔ اُسے اسکول کی ابتدائی کلاسوں سے وظیفہ ملتا تھا۔ اور اب تک اس کی قابلیت کی بنا پر مل رہا تھا۔

پھر بھی اس کے اور اخراجات تھے۔ ڈاکٹری کی ایک ایک کتاب ۵۰۰ سے کم کی نہ آتی تھی۔ شہید کی ماں نے شہید کی خاطر اپنا مکان بیچ ڈالا۔

اور شہید نے سوچ لیا۔ وہ دن رات محنت کر کے شاندار کامیابی حاصل کرے گا۔ اور پھر اس کے افلاس کے اندھیرے دور ہو جائیں گے۔

اس گھر میں جہاں اس نے دولت مند عالیہ کو آباد کرنا تھا۔

پانچ سال۔ اپنے اندر بہت سی باتیں بہت سے واقعات لپیٹ کر رخصت ہونے کے قریب تھے۔

شہید اور عالیہ اب اپنی منزل کے بہت قریب تھے۔

شہید ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے آخری سال میں تھا۔

اور عالیہ ایم اے کے آخری سال میں۔

شہید نے اب تک ہر امتحان میں نمایاں اور شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔

وہ میڈیکل کا سب سے ہونہار اسٹوڈنٹ تھا۔

سارے پروفیسر اس سے بے حد خوش تھے۔

حکومت کی طرف سے۔ جن ہونہار ڈاکٹروں کو باہر مزید تعلیم کے لئے بھیجے جانے کا امکان تھا۔ اس میں شہید کا نام سرفہرست تھا۔

شہید کو پڑھائی کی مصروفیات اتنی تھیں۔ کہ اُسے اب عالیہ سے ملنے کا موقع کم ملتا۔ کیونکہ دن کے بعد اب راتوں کو بھی اس کو ہسپتال میں ڈیوٹی کی خاطر رہنا پڑتا تھا۔

لیکن۔ یہ بات نہ تھی۔ کہ عالیہ سے ملنے کا موقع فراہم نہ ہوا۔ تو اس کی چاہت اور محبت بھی دل سے مٹ گئی۔ عالیہ کی محبت تو آج بھی ایک وسیع سمندر کی طرح

اس کے دل میں سمائی ہوئی تھی۔

بے پناہ چاہت۔ خلوص۔ سچائی۔ کی روشنی سے شہید کا دل منور تھا۔

لیکن اب عالیہ کو اُس سے شکایت ہو چلی تھی۔ کہ شہید اب پہلے جیسی بیقراری سے اس سے ملنے کی خواہش نہ کرتا تھا۔

کتنے دن ہو جاتے تھے اُسے شہید سے ملے ہوئے۔

پھر بیقرار ہو کر وہ وقت نکال کر شہید سے ملنے کالج چلی آتی۔

بڑی تلاش کے بعد وہ ملتا۔

اس کا کو دیکھ کر عالیہ کا منہ پھول جاتا۔

تمہیں اب ہماری پروا بالکل ہی نہیں رہی نا۔ شہید۔؟۔

وہ جلے دل سے پوچھتی۔

بھئی کون کہتا ہے یہ۔ میرے چاروں طرف تم ہی تم تو ہو۔

اونہہ۔ ایسی فضول سی باتیں مت کرو۔ عالیہ تنک کر کہتی۔

میں تو نہیں۔ البتہ۔ سچ مچ پریوں کا گروہ نظر آتا ہے اِدھر اُدھر — اُسے جلن ہونے لگتی۔

اُف او۔ شہید ہنسنے لگتا۔ میرے لئے ایک پری کافی تھی نا۔ وہ تو کب کی مل چکی ہے۔ اور پریوں سے مجھے کیا۔

وہ عالیہ کو ساتھ لے کر۔ کسی پُرسکون گوشے میں جا بیٹھتا۔

"دیکھو۔ عالی۔ اب منزل قریب ہے"

میں چند ماہ میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔

پھر۔ تمہارے بر نازک سے ہاتھ ۔ تمہارے ڈیڈی سے عمر بھر کے لئے مانگ لوں گا۔

عالیہ شرما کر ہنسنے لگتی۔

ایسی باتیں کر کے۔ دونوں دیر تک خوش ہوتے رہتے۔

اور ان دنوں اُس کے گھر پر۔ بڑی رونق تھی۔

بڑا ہنگامہ تھا۔

بڑے بھیا فرید کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گھر میں ہر دم ہلچل مچی رہتی

ویسے بھی اُس کا گھر بے حد چھوٹا سا تھا۔

چند کمرے ایک آنگن۔

اماں نے اُسے ایک علیحدہ کمرہ تو دے رکھا تھا۔ لیکن اب وہ بھی اس سے چھن گیا تھا۔ شہید تو بے حد پُرسکون فطرت کا تھا۔

اُسے ہنگاموں سے نفرت سی تھی۔

تنگ آ کر وہ اب زیادہ دیر گھر سے باہر رہنے لگا تھا۔

پھر شادی کے ہنگاموں میں شہید کو پڑھنے کا بالکل موقع نہ ملا۔

بھابی گھر آئی۔ تو ڈھیر سی رونقیں لائی۔

اور پھر بھابی تھی بھی کیسی پیاری۔

روشن روشن صورت والی۔

کچھ شوخ سی کچھ شریر سی۔

اب اس کی ہنسی ہر دم گھر کے آنگن میں گونجا کرتی۔

بے وقت کی راگنی۔ شہید کو بالکل نہ بھاتی تھی۔
اُسے ہنستی کھل کھل کرتی۔ لڑکیاں سخت ناپسند تھیں۔
اسے تو سنجیدہ سنجیدہ لڑکیاں پسند تھیں۔
عالیہ جیسی۔
بھابی کے آنے سے اس کے پڑھنے کا ٹھکانہ بھی چھن گیا تھا۔
بیچارہ رات آنگن میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔
لیکن گلی سے آتے شور۔ کچھ بھابی کی ہنسی کی جھنکار سے۔ اس سے بالکل پڑھا جاتا۔ پھر تارا اس کو ڈسٹرب بھی بہت کیا کرتی۔
کبھی اس کے لئے دودھ لے کر چلی آرہی ہے۔
ڈاکٹر دیور کی خدمت کرنا اُسے بھلا لگتا تھا۔
میں نے نہیں پینا دودھ وہ منہ پھلا کر کہتا۔
"ہائے۔ کیوں —"؟
وہ آنکھیں پھیلا کر معصومیت سے پوچھتی۔
"مجھے پڑھنے دو بھابی" وہ اُسے گھورتا۔
ایمان سے اتنا پڑھتے ہیں آپ شہید بھیا۔ دماغ خشک ہو جائے گا۔
دودھ صحت لے ... ضروری ہوتا ہے۔
وہ لیکچر دینے لگتی۔
بابا ... سر میں درد کر دیا تم نے۔ وہ اُسے ٹالنے کے لئے۔ پیالہ منہ سے لگا لیتا۔ اتنا پڑھتے ہیں۔ تو سر میں درد ہوگا ہی نا

اور پھر شاید تیل بھی مہینوں آپ سر میں نہیں ڈالتے ۔
وہ دوڑ کر اندر سے تیل کی شیشی اٹھا لاتی ۔
بابا ۔ بخشو بھابی مجھے ۔
وہ سچ مچ ہاتھ جوڑنے لگتا ۔
اور اس کے اس انداز پر ۔ تارا ہنسنے لگتی ۔
لہرا لہرا کر جھوم جھوم کر وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی ۔
اور شہید کو یہ بے بات اور بے وقت کی ہنسی بالکل نہ بھاتی ۔
آپ جا کر سو جائیں بھابی ۔
مجھے پڑھنا ہے ۔ شہید کے چہرے کی بیزاری چھپائے نہ چھپتی ۔
شہید کو تارا کا اس طرح ہنسنے کا انداز سخت برا لگتا ۔
تارا میں سنجیدگی تو نام کو نہ تھی ۔
آخر آپ کو اتنی ہنسی کیوں آتی ہے ۔ بھابی ۔
ایک دن شہید نے سوال کر ہی ڈالا ۔
اور جواب میں ۔ تارا اور ہنس ہنس کر گلابی ہو گئی ۔
تم ڈاکٹر بن رہے ہو ۔
ہنسی روکنے کا کوئی علاج دریافت کر لینا ۔ فرید کو شہید کا یہ سوال برا لگتا ۔
اسے تو اپنی بیوی کا ہنستا چہرہ اور ہنستی ادائیں بے حد پسند تھیں ۔
شہید کے لئے پڑھنا محال تھا ۔
وہ ہوسٹل چلا گیا ۔

اور تارا کو احساس ہوا ۔
شہید نے اس کی خاطر گھر چھوڑا ہے ۔
وہ اداس ہو گئی ۔
ساتھ دل ہی دل میں شہید سے ناراض تھی ۔
شہید ہفتے میں صرف ایک آدھ گھنٹے کے لئے گھر آیا کرتا ۔
اور جب شہید آتا تو ۔ تارا چپ اور سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتی ۔
اس کی خوب خاطر مدارات کرتی ۔
جیسے شہید کوئی خاص مہمان بن کر آیا ہو ۔

شہید کا آخری امتحان ختم ہو گیا۔

اُسے اپنی شایانِ شان کامیابی کی امید تھی۔

فرصت میسّر ہوئی۔ تو عالیہ کی یاد آئی۔

بے ایمان۔ نہ جانے کہاں غائب تھی۔

اتنے دنوں سے اُس سے ملنے بھی تو نہ آئی تھی۔

عالیہ بھی اب یونیورسٹی کے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی۔

عالیہ سے ملنے اور اس سے بہت سی باتیں کرنے کو شہید کا دل بے چین رہنے لگا

عالیہ کے گھر اُس نے ایک دو بار فون کیا۔

ہمیشہ پتہ چلا گھر پر نہیں ہے۔

نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی وہ۔

اور پھر۔ ایک دن۔ سچ مچ شہید پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ارمانوں کے بنائے محل میں آگ لگ گئی۔

شہید کا وجود بھی دھڑا دھڑ ان شعلوں میں جلنے لگا۔

ان دیکھی آگ نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ڈاک سے اُسے ایک کارڈ ملا۔

سنہرا۔ سنہرا لفافہ۔
باہر سے یہی تنا رہا تھا۔ کہ کسی نوید مسرت کا کارڈ ہے۔
کسی کلاس فیلو کی شادی کا ہوگا۔
امتحانوں کے فوراً بعد بہت سوں کے گھر بسنے والے تھے۔
اس نے مسکراتے ہوئے کارڈ کھولا۔
خوشی کی خبر۔ منحوس خبر میں تبدیل ہوگئی۔
شہید کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے آنے لگے۔
وہ کارڈ۔ عالیہ کی منگنی کا کارڈ تھا۔
کسی رضا حسن کے ساتھ۔
آگے بڑھنے کی۔ شہید کی آنکھوں میں تاب نہ رہی۔
عالیہ بے وفا تھی۔ عالیہ بے وفا تھی۔
بے وفا۔ بے۔ وفا۔
شہید کا دل اس سے چیخ چیخ کر یہی کہہ رہا تھا۔
عالیہ ٹھکرانا تھا۔ تو اس وقت ٹھکرا دیتی۔ جب منزل دور تھی۔ لیکن منزل پر پہنچ کر میرا ساتھ کیوں چھوڑا۔
عالیہ کیساتھ ساتھ تقدیر نے بھی کتنا بڑا دھوکہ کیا تھا اس کے ساتھ۔
کتنا ظلم کیا تھا عالیہ نے اس پر۔
اس کے دل میں اب تک خوشبوؤں کے پھول مہکے تھے۔
لیکن اچانک وہ پھول آدھ کھلے مرجھا چکے تھے۔

یہ سب کچھ عالیہ کی مرضی سے ہوا ہوگا۔

جب ہی تو اس نے مجھ سے کتنے دنوں سے کنارہ کیا ہوا ہے۔

شہید کو۔ عالیہ کی پچھلی باتیں یاد آنے لگیں۔

اور پھر اس کا دماغ تپنے لگا۔

وہ اپنے ہوش وحواس میں نہ رہا۔

دیوانہ سا ہو گیا۔ پلنگ پر گر پڑا۔ بخار میں تپنے لگا۔ سب گھر والے پریشان ہو گئے۔

اماں سمجھتی تھیں۔ یہ اس دن رات محنت کا اثر ہے۔ جو شہید نے امتحانوں کے زمانے میں کی تھی۔

شہید کے دل کی کسی کو خبر نہ تھی۔ کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

وہ تو پاگل سا ہو رہا ہے۔ محبت کے انجام کے صدمے پر۔

فرید۔ شہید کے پروفیسروں کو بلا لایا۔

ڈاکٹر احسن۔ شہید کو بے حد جانتے تھے۔ انہوں نے اس کا علاج کیا۔

دواؤں سے اُس کی کمزوری جاتی رہی۔

لیکن دل کا مرض۔ وہ تو بے علاج تھا۔

شہید کو عالیہ کی یاد آتی۔ دل ڈوبنے لگتا۔ وہ تو خوش ہو گی شاید۔

بہت خوش۔ خوشی خوشی اپنی شادی کی تیاریوں میں گم ہو گی۔

بے وفا۔

اس کے دل میں دھواں اٹھنے لگتا۔

اس کی محبت دو دنوں کی محبت تو نہ تھی۔

یہ محبت تو چھ سات سالوں کی محبت تھی۔

پختہ محبت۔ سچی محبت۔

اگر ایک درخت بھی لگاؤ تو اتنے عرصے میں وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح شہید کی خواہشات۔

عالیہ کے لئے نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھیں۔

لیکن وہ تو اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

ہمیشہ۔ ہمیشہ کے لئے۔

"عورت ذات ہوتی ہی بے وفا ہے"

اس کا دل۔ ساری عورتوں سے بد دل ہو گیا۔ اس نے کب کسی عورت کو قریب سے دیکھا تھا۔

ایک ماں تھی گھر پر۔ اور ماں تو محبت کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

بہن بھی نہ تھی۔ اس کی جو عورت کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک عالیہ آئی تھی۔ وہ دھوکہ باز نکلی تھی۔

اور اب گھر کا آنگن آباد ہوا تھا۔ تارا سے۔

جو رونقیں بکھیرتی پھرا کرتی تھی گھر بھر میں۔

ہر دم ہنسا کرتی۔

سب اس سے خوش تھے۔

لیکن شہید کو۔ عورت کی صنف سے نفرت ہو گئی تھی نا۔ وہ تارا سے بھی

نفرت کرنے لگا۔

ایک دوپہر وہ اداس اداس لیٹا، عالیہ کی یاد میں گم تھا۔ کہ تارا ہاتھ میں ٹرے لے کر آ گئی۔

کھانا کھا لیں۔ شہید بھیا۔

وہ اس کے خوابوں میں مخل ہوئی تھی۔

نہ جانے۔ پھر شہید پر کیوں جنون طاری ہو گیا۔

سرخ سرخ آنکھوں سے تارا کو گھور کر دیکھا۔

"میں نے نہیں کھانا کھانا۔ لے جاؤ اُسے۔" اُس نے برتنوں سے بھری ٹرے دور پھینک دی۔ برتن ٹوٹ پھوٹ کر کمرے میں بکھر گئے۔

نفرت ہے۔ مجھے تم سے۔ کیوں آئی ہو میرے قریب۔

تارا کانپنے لگی۔ رونے لگی۔ ڈر کر اپنے کمرے میں جا چھپی۔ دیر تک روتی رہی۔ کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ آج شہید بھیا نے اُسے۔

کیوں ۔ بھلا تارا نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔

وہ تو اُسے بھائیوں کی طرح چاہتی تھی۔

اللہ میاں نے اُسے کوئی بھائی نہ دیا تھا۔

وہ سسرال آکر اس وجہ سے اور خوش تھی۔ کہ اُسے ایک کے بجائے تین بھائی مل گئے تھے۔

تارا نے۔ شہید کے سامنے جانا چھوڑ دیا تھا۔

وہ اُس سے ڈرنے لگی تھی۔ چھپنے لگی تھی۔

گذرتے دنوں کے ساتھ۔ شہید بہل گیا۔

صبر آ گیا اُسے۔

وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

پھر باہر جانے لگا۔

اُسے علم ہو گیا۔ عالیہ کی شادی ایک بے حد امیر دولت مند آدمی سے ہو رہی تھی۔ جو سیاستدان بھی تھا۔

بڑا نام تھا اس کا شہر میں۔ جلسے جلوسوں کی اکثر وہ قیادت کرتا تھا۔

دھڑا دھڑ اس کی اخباروں میں تصویریں آیا کرتی تھیں۔

اوہ۔ تو وہ تھا۔

عالیہ کا آئیڈیل۔ جس کی جھلک برسوں پہلے ایک بار عالیہ نے شہید کو بھی تو دکھائی تھی۔

پھر اتنے دن۔ وہ کیوں۔ میرے دل۔ جذبات۔ میری تمناؤں سے کھیلتی رہی۔ شہید کی محبت کا جذبہ۔ نفرت میں تبدیل ہو گیا۔

وہ سچ مچ۔ عالیہ سے نفرت کرنے لگا۔ وہ چاہتا تو عالیہ کو بدنام کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

وہ شریف ذہنیت کا تھا۔ اس کی رگوں میں شرافت دوڑتی تھی۔ وہ کوئی نیچ کام کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار بھری شاہراہ پر اُس نے عالیہ کو دیکھا تھا۔

وہ بے حد بنی سنوری تھی۔ لباس بھی اُس نے بڑا واہیات پہن رکھا تھا۔

وہ خریداری کرتی پھر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر۔ حزن و ملال کا ذرا سا بھی پرتو نہ تھا۔

پھر ہوتا بھی کیسے۔

وہ کوئی سیدھی سادی تو نہ تھی۔ وہ تو بے حد ہوشیار لڑکی تھی۔ شہید کے ساتھ زندگی اُس کی اتنی آسائشوں میں تو نہ گذر سکتی تھی۔

جیسی اب گذرنے والی تھی۔

ایک شہید ہی احمق تھا۔ جو اب بھی۔ اکثر اس کی وجہ سے پریشان رہتا۔

شہید کا نتیجہ آ گیا ۔

وہ صوبہ بھر کے لڑکے اور لڑکیوں میں اوّل آیا تھا ۔

کتنا بڑا اعزاز حاصل کیا تھا اس نے ۔ اس کے گھر والے کتنے خوش تھے ۔ اماں نے ملنے جلنے والوں میں مٹھائی بانٹی تھی ۔

شہید کے دوست خوش تھے ۔ استاد خوش تھے ۔

لیکن وہ اب بھی ناخوش تھا ۔

اس کا دل اب اس جگہ لگتا ہی نہ تھا ۔

وہ وطن چھوڑ کر جانا چاہتا تھا ۔

آگے بڑھنے ۔ بہت کچھ حاصل کرنے کیلئے اس نے سوچ لیا تھا ۔ انسانیت کی خدمت کرتے کرتے اب زندگی بتا دے گا ۔

کوئی خوشگوار لمحہ یا احساس اب بھی اس کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکتا ۔

فی الحال وہ ایک مقامی ہسپتال میں ہاؤس جاب کرنے لگا ۔ اور پھر جلد اسے باہر جانے کا موقع مل گیا ۔

"فزیشنز اینڈ سرجن کا ڈپلومہ لینے ۔ اور بہت کچھ سیکھنے وہ ملک سے جانا چاہتا تھا ۔ اماں سے اس نے اس کا ذکر کیا ۔ تو وہ اداس ہو گئیں ۔ نہ بیٹے ۔ ڈاکٹر تو بن

گیا نا۔ بس اب تو یہاں میرے پاس ہی رہ۔ وہ چاہت سے بولیں۔

اب تو میں تیرا گھر بھی بساؤنگی۔ چاند سی دلہن لاؤں گی۔

اونہہ۔ وہ زہر بھرے انداز میں مسکرانے لگا۔

"ماں کی امید اور تصور یہی ہوتا ہے۔ اولاد کا گھر آباد کرنا۔ اُسے بال بچوں والا دیکھنا۔

لیکن شہید تو اب عمر بھر اس جھنجھٹ میں نہ پڑنے کا عہد کر چکا تھا۔ اماں کا دل صاف لفظوں میں نہ توڑ سکا۔

لیکن بہانہ ضرور بنا گیا۔

"اماں بس تین چار سالوں کی تو بات ہے۔ پھر لوٹ آؤں گا۔"

تین چار سال۔ کیا یہ عرصہ کم ہوتا ہے۔ اماں کو یہ دن بھی بہت لگے۔

لیکن بیٹے کی مستقبل کی سوچ میں رکاوٹ نہ پیدا کرنا چاہتی تھیں۔

چپ ہو رہیں۔

اور پھر شہید اپنے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اُسے ہسپتال والے اپنے خرچ پر بھیج رہے تھے۔ اس کے جانے کے انتظامات جلد پورے ہوگئے۔

جاتے جاتے سب کو اداس کر تا گیا۔

اماں تو بلبلا کر رو رہی تھیں۔

نہ جانے اب دیکھ بھی سکوں گی تجھے یا نہیں۔ ان کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

شہید سب کو تسلی دیتے وقت۔ خود بھی رونے لگا۔

جاتے جاتے۔ اس نے تارا سے بھی اپنے رویے کی معافی مانگی۔

تارا اب شہید کے سامنے کم آتی تھی۔ آتی بھی تو سہمے سہمے انداز میں۔

مجھے معاف کر دو گی نا بھابی۔

وہ نادم ہو کر اس کے قریب آگیا۔

میں آپ سے ناراض کب تھی شہید بھیا۔ تارا نے سچ مچ کہا تھا۔ وہ بڑے صاف دل کی لڑکی تھی۔ کوئی بات دل میں نہ رکھتی۔

نوید ان دنوں چھ سات ماہ کا تھا۔

شہید نے اس کی گود سے لے کر نوید کو بھی خوب پیار کیا۔

اور پھر وہ رخصت ہو گیا۔ ایک طویل مدت کے لئے۔

آگے ایک انجانی دنیا اس کی منتظر تھی۔

یہ دنیا اس دنیا سے کتنی مختلف تھی۔ جسے شہید چھوڑ کر آیا تھا۔

لیکن اس رنگین ماحول میں گم ہونے نہ آیا تھا۔

وہ کچھ کرنے اور سیکھنے آیا تھا۔

اس کی پہلی منزل شکاگو (امریکہ) تھی۔ یہاں اس نے ہسپتال جوئن کر لیا —

ایف۔ پی۔ ایس (فیلو آف فزیشنز اینڈ سرجن) کا ڈپلومہ لیا۔

پھر دوسرے ہسپتال میں کام شروع کر دیا۔

یہاں اس نے نیورو لوجسٹ (اعصابی امراض) پر ریسرچ اور ان کی تربیت حاصل کرنی شروع کی۔

اس کا دن کا ایک بڑا حصہ ہسپتال میں کام کرتے گذر جاتا۔ اس کی رہائش کا بندوبست بھی وہیں ہوسٹل میں تھا۔

کام کے بعد زیادہ وقت وہ مطالعے میں گذارا کرتا تھا۔

اس کے خیالات اور قدم۔ اس جگہ آکر ایک دم نہ بھٹکے تھے۔

گھر والوں کو پابندی سے خط لکھا کرتا تھا وہ۔ ماں کے ممتا بھرے خط بھائیوں کے خط اکثر اُس کے پاس آتے۔

تارا کو اُس نے ایک دو خط لکھے تھے۔

لیکن تارا نے ان کا جواب نہ دیا تھا۔ اس کے بدلے فرید نے لکھا تھا۔ یہ تمہاری بھابی تارا ہے نا۔ لکھنے کی چور ہے۔ اس کی طرف سے میری معذرت قبول کر لو۔ پھر ایک خط میں فرید نے یہ خوشخبری بھی دی تھی۔ کہ اب تارا کی گود میں۔ چاندنی بھی اتر آئی ہے۔

اور پھر مبارک باد کے ساتھ۔ شہید نے یہ شوخ سا جملہ بھی اسے لکھ ڈالا تھا۔ بھابی بس۔ اب منصوبہ بندی والوں پر رحم کرنا۔

اتنے قلیل عرصے میں تارا دو بچوں کی ماں جو بن گئی تھی۔

اور پھر دو سالوں میں۔ دو روح فرسا خبریں۔ شہید تک پہنچیں۔ فرید اور ماں کے بچھڑنے کی خبریں۔

شہید۔ دیار سے دور۔ کتنا رویا تڑپا۔ اپنا کوئی تسلّی دینے والا بھی نہ تھا۔

قلم کاغذ لے کر تارا کو خط لکھنے بھی بیٹھا۔ لیکن اُسے خط لکھنا بھی نہ آیا۔ تارا کو دو بول تسلی کے بھی نہ لکھ سکا۔

جس پر اتنا بڑا سانحہ ٹوٹ گیا تھا۔

شہید کو احساس ہوا۔ وطن میں صرف انتظار کرنے والی۔ اس کی جدائی کی گھڑیاں کاٹنے والی۔ صرف ماں کی ہی تو آنکھیں تھیں۔

ماں کی آنکھیں تو اب عمر بھر کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ اب اس لٹی ہوئی جگہ پر وہ جا کر کیا کرتا۔ دکھوں کی نگری میں اب وہ لوٹ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔

کورس مکمل کر کے۔ شہید وہیں کے ہسپتال میں کام کرنے لگا۔

اور کچھ اس طرح رینگ رینگ کر۔ کھسک کھسک کر دس سال بیت گئے۔

شہید اکتا گیا۔

اب اس ماحول سے۔ اُسے اپنا وطن یاد آنے لگا۔

یہ ماحول۔ بھی شہید کو خوش نہ رکھ سکا تھا۔

یہاں اس کے پاس دولت تھی۔ کار تھی۔ دنیا دکھلاوے کی ہر چیز موجود تھی۔ لیکن سکون نہ تھا۔

سچی خوشی نہ تھی۔

شہید وہاں رہ کر پارسا نہ رہا تھا۔

اس کے پاس دولت آئی۔ اس نے دولت سے سب کچھ خریدا۔ لڑکیاں اس کی دولت بنیں۔

وہ ان کے ساتھ گھوما۔ پھرا۔ محبت کے جھوٹے کھیل رچائے۔ بہت مرحلوں سے گذرا۔ لیکن کسی کو بھی اپنا نہ بنایا۔

اس نے تو بس تنہا رہنے کا عہد کر رکھا تھا۔

اور یہ عہد نبھا رہا تھا وہ۔

پھر وہ اکتا گیا۔ ان گناہوں سے نادم ہونے لگا۔ بچنے کے لئے گناہوں سے وہ اس ماحول سے فرار چاہتا تھا۔

اس نے رختِ سفر باندھا۔

پلٹ آیا۔ اس سرزمین پر جہاں اس کا جنم ہوا تھا۔ جہاں اُس نے بہت کچھ پایا تھا۔

بہت کچھ کھویا بھی تھا۔

یہاں آتے ہی اس کو ماضی کی کہانی یاد آگئی۔

کتنے کردار نظروں کے سامنے اُبھر آئے۔ مظلوم بھابی کی یاد آئی۔

اور شہید نے اپنی پہلی فرصت میں تارا سے ملنے بھائی کی امانتوں کو گلے سے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ جو اس کے پیار کے سچے حق دار تھے۔

نوید ساتویں جماعت میں بڑی طرح فیل ہو گیا۔

فیل تو اس نے ہونا تھا ہی۔ اس نے ایک دم محنت نہ کی تھی۔ لیکن اب جب نتیجہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ تو اُسے ماں کا خوف لاحق ہوا۔

تارا ان دنوں حد درجہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ پچھلے ماہ وہ بیمار رہی تھی۔ اس وجہ سے اُس سے سلائی کا کام بھی نہ ہو سکا تھا

نوید اور چاندنی کی اسکول کی فیس بھرنے کے لئے اس نے اپنی کانوں کی بالیاں بیچ ڈالی تھیں۔

صرف اولاد کی خاطر وہ کتنی مصیبتیں جھیل رہی تھی۔ اب تو وہ حد درجہ بدمزاج ہو گئی تھی۔ ہر دم اپنی قسمت کو کوسنے کے ساتھ ساتھ۔ سنگدلی سے بچوں کو بھی کوسنے لگ جاتی۔ کاش تم پیدا نہ ہوتے۔ ہوتے بھی تو مر جاتے۔ تم کو بھی صبر کر کے بیٹھ رہتی۔

اور اماں جب ایسی بد فالیں اس کے منہ سے سنتیں۔ تو ان کو ہول اٹھنے لگتے۔ ایسی باتیں نہ کر تارا۔ کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے تارا کو ٹوک دیتی تھیں۔

"کاش قبولیت کی ہی گھڑی ہو۔ میں مر جاؤں"۔ وہ خود کو اور جی بھر کے

کوسنے لگتی۔ تارا اب اماں کی کب سنتی تھی۔

اس کو تو اماں کی خدمت کرنا بھی اب کھٹکتا تھا۔ اماں سچ مچ اس پر بوجھ بن گئی تھیں۔ اماں کو یہ احساس تھا۔

ان کا بڑھاپا اب فضول بن گیا تھا۔ بس وہ تو بے مقصد جئے جا رہی تھیں۔ حالانکہ اب کیا مقصد رہا تھا ان کی زندگی کا۔

"ماں باپ تو اولاد کے لئے جان کی بازی تک لگا دیتے ہیں۔ تارا اب بھی اماں کی جان تھی۔ اور اس طرح تارا کی جان اپنے بچوں میں اٹکی رہتی۔

لیکن نوید۔ کتنا برا صلہ دے رہا تھا۔ اس محبت کا اس چاہت کا۔

تارا سے جہاں تک ہو سکتا تھا۔ نوید کی اصلاح کرنے کی کوشش میں رہتی۔ امتحان کے زمانے میں بھی نوید کا پڑھنے میں دل نہ لگتا۔ لیکن تارا امتحان کے زمانے میں سے باہر نکلنے نہ دیتی کمرے میں بند کر کے باہر سے قفل لگا دیتی۔ تارا سمجھتی۔ اندر نوید پڑھ رہا ہوگا۔ لیکن نوید سے تو ایک حرف نہ پڑھا جاتا۔

اُسے آپ ہی آپ پڑھنے سے نفرت ہو گئی تھی۔

اس کا بس چلتا تو۔ کتابوں کو آگ لگا دیتا۔

لیکن یہ اس کے بس میں کہاں تھا۔ اُسے اپنی ماں سے بے حد خوف آتا تھا۔ وہ جو اُسے مار مار کر سچ مچ ادھ موا کر دیتی تھی۔

صلہ تو محنت کا اچھا ملتا ہے۔ نوید نے محنت نہ کی۔ صلہ بھی برا ملا۔

لیکن اب گھر جاتے ہوئے اس کا دل [illegible] رہا تھا۔ لرز رہا تھا۔

وہ ماں کی مار کھانے پر بالکل تیار نہ

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لئے۔ نوید جب اسکول گیٹ سے باہر نکلا تو عابد باہر اس کا منتظر تھا۔

عابد۔ جو نوید کو اپنا ہمدرد۔ دوست۔ مخلص سب کچھ لگتا تھا۔

نوید کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر عابد اس کی کیفیت کو بھانپ گیا۔ پھر بھی انجان بن کر پوچھنے لگا۔

کیا ہوا نوید۔؟۔

اور عابد کو سامنے پا کر نوید پھوٹ کر رونے لگا۔

ارے یار شرم کرو۔ کیا لونڈیوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔ مرد بنو۔ مرد۔ اور نوید اپنے آنسو قمیص کی آستین سے خشک کرنے لگا۔

میں فیل ہو گیا یار۔ اس نے پھر منہ بسورا۔

اونہہ اس پڑھنے وڑھنے کے چکر میں یہ سب ہوتا ہے۔ چھوڑو اس کو۔ کیا کرنا ہے پڑھ کر۔

ہم کو دیکھو۔ جب سے یہ چکر ختم ہوا ہے۔ بس موج ہی موج ہے ہماری۔

لیکن میری امی کہتی ہیں۔ جاہل رہ کر تم دنیا میں کچھ نہ کر سکو گے۔ بھیک مانگو گے۔

نوید نے ماں کا خدشہ عابد پر ظاہر کیا۔

عابد۔۔ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ہم تو جاہل ہیں۔ کیا تمہیں بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ دیکھو کیا شان ہے

ہماری۔ نوید نے عابد کے سراپے پر نظر ڈالی۔

وہ تو سر سے پیر تک اجلا اجلا دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ کتنا گندا رہتا تھا۔ لیکن اب تو عابد کے ٹھاٹ بھاٹھ ہی نرالے تھے۔

یہ سب اشفاق چچا کے روپے کی بدولت ہے۔ انہوں نے تم کو بھی بلوایا ہے۔ عابد نے کہا۔

مجھے۔ نوید جھجکا۔

مجھے تو پہلے گھر جانا ہے۔ لیکن دوسرے پل اُسے گھر کے ساتھ امی کا غصہ اور مار بھی یاد آگئی۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو اٹک آئے۔

اور پھر اس کو راہِ فرار اشفاق کے یہاں جانا ہی نظر آیا۔

وہ عابد کے ساتھ اسی وقت چلنے پر راضی ہو گیا۔

عابد نے سڑک پر جاتا رکشہ روک لیا۔

دونوں رکشہ میں بیٹھ کر اشفاق کے گھر کی طرف چل پڑے۔

نوید اس وقت حد درجے پریشان اور الجھا الجھا لگ رہا تھا۔ اُسے خود فیل ہونے کا دکھ نہ تھا۔ ہاں ماں کے دکھ کا تھوڑا بہت احساس اس کے دل میں موجود تھا۔

یہی وجہ تھی۔ وہ نادم بھی تھا اور اداس بھی۔ راستے بھر خاموش رہا۔ لیکن عابد اشفاق چچا کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا۔ جو ان کے گھر پہنچ کر ختم ہوئے۔

اشفاق بہت سے لوگوں میں گھیرا اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔

وہ سجا سجایا کمرہ کسی بادشاہ کا دربار ہی لگتا تھا۔

اشفاق کے ملازم نے عابد اور نوید کو اس کمرے میں جانے سے روک دیا۔ جب کوئی خاص قسم کی میٹنگ ہو رہی ہوتی تھی۔ تو چند مخصوص آدمیوں کے علاوہ اندر کسی اور کو جانے کی قطعی اجازت نہ تھی۔

باہر کمرے میں نوید عابد کے ہمراہ بیٹھ کر اشفاق سے ملنے کی گھڑیاں گننے لگا۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ پھر کہیں جا کر اشفاق کو فرصت ملی۔

وہ باہر آیا۔

دو لڑکے اس کے منتظر تھے۔

اشفاق نوید سے بڑی محبت سے ملا۔

نوید تو اب تک اپنے فیل ہونے کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔

اشفاق کے ہمدردی کے بول پر رونے لگا۔

پھر اس کے پوچھنے پر اپنے فیل ہونے کا قصہ بھی سنا ڈالا۔

تو یہ بات ہے۔

چھوڑو پڑھائی کے چکر کو۔

تم ویسے مجھے بہت ہوشیار لگتے ہو۔ میرے پاس رہنے لگو۔ میں تمہیں کام دوں گا۔ پیسے بھی ملیں گے۔

تمہارا بھی بھلا ہو گا۔

بولو۔ کرو گے میرا کام۔؟ اشفاق نے اس کی مرضی معلوم کرنی چاہی۔

جی۔ نوید نے فوراً اقرار کر لیا۔

میری بھی بہت سی شرائط ہیں۔ ان کو پورا کرنا لازمی ہو گا۔ تم کو حلف اٹھانا

پڑے گا۔ کہ تم میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرو گے۔ بولو منظور ہے۔
اشفاق نے پھر کہا۔

جی۔ جی۔ نوید کی گردن پھر اقرار میں ہلنے لگی۔ لیکن میرا نام پتہ یا ٹھکانہ تم کسی کو نہ بتانا۔ کام ہوشیاری سے کرنا۔

اگر تم نے ہمارے خلاف ذرا بھی کام کیا۔ تو وہ دن تم دونوں کا آخری دن ہوگا۔ اشفاق نے ان کو دھمکی بھی دے ڈالی۔

نوید اور عابد کی آنکھیں خوف کے احساس سے پھیل گئیں۔

اشفاق نے اپنے ملازم سے کیمرہ لانے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کیمرہ لے آیا۔ اشفاق نے عابد اور نوید کے چہرے پر روشنی ڈال ڈال کر۔ ان کی تصویریں اتار لیں۔

اب تم دونوں مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ میرے ساتھی ہر جگہ پھیلے ہیں۔ تم کو ہر جگہ سے ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ دونو عمر لڑکے۔ اشفاق کے شکنجے میں بری طرح پھنس چکے تھے۔

میں جتنا اچھا ہوں۔ اس قدر بُرا بھی۔

اشفاق نے ان کو اپنی عادت بتائی۔ ویسے ابھی تو تم میرے دوست ہو۔ اگر مجھ سے دغا کرو گے تب میں برائی پر اتر آؤں گا۔

اشفاق کی باتوں پر نوید تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ کسی مصیبت میں پڑ گیا تھا یہ مصیبت تو فیل ہونے کی مصیبت سے بھی زیادہ تھی۔

اُسے اپنی امی یاد آنے لگی۔ اُسے علم تھا اس کی امی اس کے انتظار میں

کس قدر بے قرار ہو گی۔

لیکن عابد تو خوش تھا۔

اُسے بھی تسلی دینے لگا۔ لیکن نوید کو چین محسوس بھی نہ ہو رہا تھا۔

باہر گھپ اندھیرا پھیل چکا تھا۔

اشفاق پھر اندر سے آیا۔ اس کے ملازم نے دو بڑے بڑے ڈبے بھی ان دونوں لڑکوں کے سامنے لا رکھے۔

بیٹے تم دونوں شہر کی طرف جا رہے ہو نا اپنے گھروں کو۔ تو یہ درخشاں اسٹریٹ پر ہوٹل شان کے منیجر کو میرا سامان پہنچا دینا۔ ساتھ ساتھ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالے دونوں کو پچاس پچاس کا نوٹ دے کر ان کا جی خوش کر دیا

اتنی بڑی رقم اس سے قبل کبھی اشفاق نے نوید کو نہ دی تھی۔ لیکن نوید یہ رقم پا کر خوش نہ ہوا۔ وہ گھر تو یہ روپے لے جا نہ سکتا تھا۔ پھر بھی اُس نے نوٹ لے کر اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لئے۔

وہ دونوں ڈبے بے حد بھاری تھے۔

بمشکل نوید اور عابد نے ان کو اٹھایا۔

اشفاق اپنا کام کرواتے وقت کبھی ان کو اپنی کار میں نہ بھیجتا۔ بلکہ وہ رکشہ یا ٹیکسی میں جاتے۔ اشفاق کا یہ بھی حکم تھا۔ کرایہ اشفاق دے ہی دیتا تھا۔ کہ رکشہ یا کوئی اور دوسری سواری بھی اس کے گھر سے دور جا کر جائے۔

نوید اور عابد کو وہ وزنی بوجھ اٹھا کر دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو گیا۔ لیکن کیا کرتے

ہانپتے کانپتے۔ آگے بڑھنے لگے

اب سڑکیں اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں۔ اس طرف سڑکوں پر روشنی کے لئے پول بھی نہ لگے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک رکشہ ملا۔

اور جب وہ شان ہوٹل سے مینجر کو ڈبے سونپ کر نکلے تو رات کے نو بج چکے تھے۔ نوید کو اب گھر جانے کی فکر تھی۔

اس کے پاس پچاس روپے تھے۔ جو اتنی جلد ختم نہ ہو سکتے تھے۔ قریب کی دکان سے اُس نے ٹھنڈی ٹھنڈی کوکا کولا کی بوتل پی۔

شاہ بن کر عابد کو بھی اپنے خرچ پر پلائی۔ پھر سموسے خرید کر کھائے۔ پان بھی لئے۔ لیکن اب بھی اس کے پاس چالیس روپے بچتے تھے۔

جو اس نے امانت کے طور پر عابد کے پاس رکھوا دیئے۔

عابد تو اسے گھر جانے کی اجازت دے ہی رہا تھا۔ اتنا ڈرتے ہو ماں سے میری ماں بھی جب دیر سے جاتا ہوں۔ دو چار گالیاں سنا کر چپ ہو جاتی ہے۔ اور ان گالیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیا بگاڑ لیتی ہیں۔ ماں کی گالیاں ہمارا عابد ہونٹ سیکڑ کر بولا۔

پھر اس نے پان کی دکان سے گھٹیا سی سگریٹ کی ایک ڈبیہ بھی خریدی۔ عابد سگریٹ بھی پیتا تھا۔

آج جیب گرم تھی۔ تو یہ شوق کس طرح پورا نہ کرتا۔

عابد نے سگریٹ سلگایا۔ یار بے حد مزے کی چیز ہوتی ہے۔ تم بھی پیو نا۔ اس نے ڈبیہ کھول کر نوید کے آگے کر دی۔

نوید سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سن رکھا تھا۔ سگریٹ بُری چیز ہوتی ہے۔ وہ جھجکنے لگا۔ یہاں کون دیکھ رہا ہے تم کو۔ جو ڈر رہے ہو۔ عابد نے اس کا ڈر محسوس کر لیا۔ یار اب ہم اشفاق کے ساتھی ہیں۔

تم ہمت پیدا کرو اپنے میں۔ میری طرح بنو میری طرح۔ عابد نے فخر سے کہا۔

نوید نے عابد کے کہنے پر سگریٹ سلگا کر منہ سے لگا لیا۔ پھر اُسے پیچ پیچ دھواں چھوڑنے میں مزہ آنے لگا۔

اس نے پوری سگریٹ ختم کر ڈالی۔

اس کے منہ میں ایک عجیب سی بدبو بس گئی جو اُسے بُری نہ لگی۔

یار اب میں چلوں ۔ نہ جانے کتنے بج گئے۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔

نوید کو بار بار۔ امی کا خیال آ رہا تھا۔

رکشہ کے پیسے تو اس کی جیب میں تھے ہی۔ وہ رکشہ کی تلاش میں عابد سے رخصت ہو کر فٹ پاتھ پر آگے بڑھنے لگا۔

کیونکہ اس کا گھر درخشاں سٹریٹ سے دو تین کوس پرے تھا۔

رات کے بارہ بج گئے۔ نوید نہیں آیا۔

تارا اس کے انتظار کا سیکنڈ سیکنڈ گن رہی تھی۔

دوپہر ایک بجے سے اُسے نوید کا انتظار تھا۔ آج وہ اپنا نتیجہ لینے گیا تھا۔

تارا کو پوری امید تھی اُس کا بیٹا پاس ہو جائے گا۔

نوید پڑھائی میں جتنا بھی بُرا تھا فیل تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ اچھے نمبروں سے تو نہیں۔ ہاں برے نمبروں سے پاس ضرور ہو جاتا تھا۔

نوید کی ناکامی کا صدمہ اٹھانے کو تارا کا دل بالکل تیار نہ تھا۔

آج چاندنی کے اسکول میں بھی نتیجہ نکلا تھا۔

چاندنی پاس ہو گئی تھی۔ اب وہ چھٹی جماعت میں چلی گئی تھی۔ یہ نوید مسرت سن کر وہ امی کے گلے لگ گئی۔

امی میں اپنی کلاس میں سیکنڈ آئی ہوئی۔ اُس کو اسکول سے تحفے کے طور پر بصورت اصلاحی کتابیں بھی ملی تھیں۔

تارا نے چاندنی کو گلے لپٹا لیا۔ خوب پیار کیا۔

کاش۔ کاش۔ ایسی خوشی اس کا نوید بھی لے کر آئے۔

نوید اور چاندنی کے اسکول کی چھٹی ایک وقت ہوا کرتی تھی۔ چاندنی تو

فوراً گھر آجاتی تھی ۔ لیکن نوید ہمیشہ دیر سے آتا تھا ۔

وہ لڑکا تھا۔ تارا کو علم تھا۔ دوستوں کے ساتھ باتوں یا کھیل کود میں مصروف ہو جاتا ہوگا ۔ وہ چھٹی کے بعد۔ اُسے نوید کا بے چینی سے انتظار تھا ۔

آج اس نے کھانا بھی بچوں کے لئے اچھا پکایا تھا۔ دودھ کی میٹھی سویاں بھی بنائی تھیں ۔ چاندنی کو بھوک لگنے لگی تھی ۔

لیکن تارا کا کہنا تھا نوید آجائے پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے ۔

لیکن نوید تو آنے کا نام نہ لیتا تھا۔

محلے کے اور لڑکے جو نوید کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اپنے گھروں میں آچکے تھے ۔

نوید کی خبر گیری کے لئے تارا باہر نکلی تو یہ روح فرسا خبر اُس کے کانوں نے سن لی۔نوید فیل ہوگیا ۔

نوید فیل ہو گیا ۔

کسی نے پگھلا ہوا سیسہ جیسے تارا کے کانوں میں انڈیل دیا ۔

دو تین گھر چھوڑ کر فاروق کی ماں رہتی تھی ۔ ان کا فاروق نوید کا ہم جماعت تھا فرسٹ آیا وہ کلاس میں ۔

نوید کے فیل ہونے کی خبر اس نے ہی محلے میں مشہور کی تھی۔ فاروق کی ماں تو بے حد خوش تھی ۔ اپنی خوشی کے ساتھ تارا کے دل پر وار کر گئی ۔نوید کو کھلنڈرا۔ آوارہ نہ جانے کیا کیا کہا ۔

سارا وقت آوارہ فطرت لڑکوں میں رہے گا تو یہی ہوگا۔ میرا فاروق

کیا مجال جو گھر سے نکل جائے۔

تارا کو محسوس ہونے لگا۔ آج وہ خود کسی بڑے امتحان میں فیل ہو گئی ہے۔

لرزتی ٹانگوں سے گھر لوٹ آئی۔

کتنی غلط روش پر چل پڑا تھا نوید۔ میں۔ اس کی ٹانگیں سچ مچ توڑ دوں گی۔ وہ پھر جذباتی فیصلے کرنے لگی۔

دوپہر شام میں ڈھلی۔ شام رات میں۔ رات آگے بڑھنے لگی۔ نوید نہ آیا۔ تارا بے قرار ہو گئی۔

غم غصہ۔ سب آنسوؤں میں ڈھل گیا۔

اب اُسے صرف یہ فکر تھی۔ نوید کیوں نہیں آیا۔

آخر پھر اس نے مجبور ہو کر پڑوس کے احمد چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ صحیح معنوں میں اس کے ہمدرد تھے۔

لیکن اس وقت وہ بھی تارا کے کام نہ آئے۔

نوید کے فیل ہونے کا کارنامہ وہ سن چکے تھے۔

تمہارے خوف سے بھاگ گیا — آج نہیں تو۔ کل آجائے گا۔ میں اتنی رات کہاں بھٹکتا پھروں۔ انہوں نے صاف انکار کر ڈالا۔

تارا کچھ اور مغموم ہو کر واپس چلی آئی۔

اس کے دل کو کب قرار تھا۔ گھر کے علاوہ نوید کا اور کون سا دوسرا ٹھکانہ تھا۔ وہ بھاگ کر پناہ بھی کہاں جا کرے گا۔

تارا کے دل میں طرح طرح کے وہم آ رہے تھے۔
بھیا کی فکر میں۔ چاندنی بھی اپنے پاس ہونے کی خوشی کب کی فراموش کر چکی تھی۔ دوپہر سے وہ بھی ماں کے ساتھ بھوکی تھی۔
چاندنی کو اپنے بھیا سے بے حد چاہت تھی۔ اس کی حرکتوں پر خود چاندنی کا دل دکھتا۔ حالانکہ نوید۔ چاندنی پر صرف رعب ڈالا کرتا۔
اس سے ہر بات پر لڑائی پر آمادہ ہو جاتا۔ کبھی چھوٹی بہن پر ہاتھ بھی اٹھا لیتا۔ لیکن معصوم بے زبان چاندنی صرف آنسو بہا کر رہ جاتی۔ ایک بار امی نے اس کی حمایت پر نوید کو مارا تھا۔
اس دن چاندنی کا کتنا جی دکھا تھا۔ کہ اس کی وجہ سے بھیّا کو مار پڑی۔
رات وہ سونے لیٹی تو۔ دکھ سے کتنی دیر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔
جب سے چاندنی نے ہوش سنبھالا تھا۔
گھر میں ماں کا ہاتھ بٹانے کی اس کی عمر ہوئی تھی۔ وہ نوید کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی۔ کپڑے دھوتی کپڑوں پر استری کرتی۔ اس کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ کر رکھتی۔
اب وہ دوپہر سے نوید کے انتظار میں ۔۔ کتنی بار بے قراری سے رو چکی تھی۔ نماز پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگ چکی تھی۔
اب گلی میں کھلنے والا دروازہ کھولے وہ دونوں ماں بیٹی نوید کے انتظار میں دہلیز پر بیٹھی تھیں کہ اچانک گلی میں جلتے بلب کی روشنی میں۔ دور سے نوید آتا نظر آیا۔

سر جھکائے۔ دھیرے دھیرے اُسی طرف آتا وہ نوید تھا۔

تارا اس کو اچھی طرح پہچان چکی تو۔ پریشانی نے پھر غم اور شدید غصّے کا روپ پل بھر میں دھار لیا۔ نوید محفوظ تھا۔ یہی دل کو تسلی ہو گئی۔

اس نے اٹھ کر چاندنی کو اندر دھکیل کر نوید کے داخل ہونے سے پہلے دروازہ اندر سے مضبوطی سے بند کر لیا۔

اور چاندنی تڑپ گئی۔ امی بھیا کو اندر بلالیں نا۔ وہ رونے لگی۔ لیکن تارا آنگن کی جلتی مدھم سی روشنی بجھا کر کمرے میں چلی گئی۔ گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔

روتی التجائیں کرتی۔ چاندنی اس کے پیچھے چلی آئی۔

باہر کا دروازہ ہولے ہولے بجنے لگا۔

نوید کتنی دیر مسلسل دستک دیتا رہا۔

تارا سچ مچ کانوں میں انگلیاں ٹھونسے بیٹھی تھی۔

نوید۔ اب باہر روتے ہوئے۔ امی۔ امی بھی پکارنے لگا تھا۔ لیکن تارا کا دل نہ پسیجا۔ وہ تو بس کچھ دیوانی سی ہو گئی تھی۔

کتنی دیر ہو گئی نوید کو دروازہ پیٹتے اور آوازیں دیتے۔ لیکن تارا ٹس سے مس نہ ہوئی۔

آخر نوید تھک گیا۔ تارا کو بھی اس کی آواز آنی بند ہو گئی۔

وہ اپنے حساب میں۔ نوید کو کافی سزا دے چکی تھی۔

آدھی رات بیت گئی تھی۔ تارا نے سوچا۔ کہیں نوید وہیں گلی میں کوڑے

کرکٹ کے ڈھیر میں نہ سو جائے۔

اس کا دل الٹ پلٹ ہونے لگا۔ وہ اٹھی دروازے کی کنڈی کھول دی۔ باہر جھانکا۔ اندھیرے میں نوید کہیں نظر نہ آیا۔

نوید۔ نوید۔ نوید۔

تارا باہر نکل آئی۔ اُسے پکارنے لگی۔

لیکن نوید۔ تو جا چکا تھا۔

کہاں۔ یہ تارا کو علم نہ تھا۔ اس وقت سارا قصور تارا کا تھا۔

غصّے اور صدمے کا بھوت سر پر سے اترا۔ تو وہ غم کی شدت سے نڈھال تھی۔

"نوید"

نہ جانے کہاں ہوگا۔

یہ رات کیسی رات تھی۔

جو اس گھر کے کسی فرد کے لئے نیند نہ لے کر آئی تھی۔

تارا جذبات میں آکر صرف اپنے دل اور دماغ سے سوچتی۔ اس نے نہ اماں کی سنی تھی۔ نہ چاندنی کی۔

لیکن اب —— اب اس کا دل برابر اُس سے یہ کہہ رہا تھا۔

اس نے یہ ظلم کیوں کیا نوید پر۔

امنڈتے آنسو۔ اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔

تارا نے گھر کے دروازے جب نوید پر بند کر لئے تو وہ آدھی رات کو ایک دکان کے برآمدے میں جا سویا امی کے اس اقدام پر۔ نوید کا دل بری طرح مجروح ہوا تھا۔

وہ خود کو بے قصور سمجھ رہا تھا۔ اور ماں بے حد ظالم محسوس ہو رہی تھی۔

اب تک اس کی ماں نے اس پر ظلم ہی کیا تھا۔ مار مار کر اس کی ہڈیوں میں درد کر دیا تھا۔ جسم پر نیل ڈال دیئے تھے۔ ماں نے تو اس پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔

وہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کر سکتا تھا۔

نوید اب بچہ نہ رہا تھا۔

وہ خود مختاری چاہتا تھا۔ آزادی چاہتا تھا۔ تارا کی روک ٹوک اُسے بالکل پسند نہ آئی یہی وجہ تھی۔

ماں اُسے بری لگنے لگی۔

اس نے ماں کی پریشانیوں کو تکلیفوں کو بالکل فراموش کر ڈالا۔

نوید نے صرف اپنے آپ پر نظر رکھی۔

وہ خود کو مظلوم سمجھنے لگا۔ اور ماں کو ظالم۔

اور آج کے بعد تو اُسے ماں سے نفرت کا احساس ہونے لگا۔

راتوں رات اُس نے فیصلہ کر لیا۔

گھر چھوڑنے کا۔ اب میں گھر پر نہیں رہوں گا۔

اشفاق کا سہارہ اُس کا حوصلہ بندھائے ہوئے تھا۔

نوید اب اپنی مرضی سے جینا چاہتا تھا۔ آزاد فضا میں سانس لینا چاہتا تھا۔

منہ اندھیرے اٹھ کر اس نے عابد کے گھر کی راہ لی۔

عابد باہر آیا تو روتی بسورتی شکل کے ساتھ۔ نوید نے اپنی بپتا اسے سنا ڈالی

اوہو۔ یہ تو بہت برا ہوا تمہارے ساتھ۔

عابد کو بھی نوید پر ترس آ گیا۔

چلو اشفاق چچا کی طرف چلتے ہیں۔ وہ بڑے رحم دل ہیں۔ تم کو ضرور پناہ دیں گے۔

عابد نے حسب عادت اشفاق کی رحم دلی کا تذکرہ کیا۔

عابد اندر جا کر جلدی سے لباس تبدیل کر آیا۔ دونوں سویرے سویرے اشفاق کے یہاں پہنچ گئے۔

اور اشفاق نے اپنی رحم دلی کا ثبوت دیا۔ نوید کو اس کے یہاں رہنے کا ٹھکانہ مل گیا۔

نوید بہت خوش تھا۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے اس کو ایک بار بھی ماں کی یاد نہ آئی۔ اس کا خیال نہ آیا۔

تارا جو اُس کی ماں تھی۔

ماں جس کے دل میں صرف اولاد کی خوشیوں کی تمنا ہوتی ہے۔ جس کا دل اولاد پر مر مٹنے کو ہر دم آمادہ رہتا ہے۔

اور تارا کی لٹی پھٹی زندگی کا سرمایہ اولاد ہی تو تھی۔

چاندنی تو پرائے آنگن کی چاندنی تھی۔

نوید تو تھا سب کچھ۔

لیکن نوید۔ نہ جانے ماں سے منہ موڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔

تارا نے سچ مچ سدھ بدھ کھو دی۔ گھر میں پھر ماتم پڑ گیا۔ بغیر کسی کے مرے ویسا ہی سماں بندھ گیا۔

جس طرح کسی کے مر جانے پر گھر کا ماحول ہو جاتا ہے۔

تارا سے صدمے کے مارے بستر سے اٹھا نہ جاتا تھا۔ چاندنی نے رو رو کر حال بُرا کر لیا تھا۔ اماں ایسی بے حس ہو گئی تھیں۔ کہ دل پتھر کا ٹکڑا بن گیا تھا۔

نہ تارا کا حوصلہ بڑھا سکیں۔ نہ تسلی دے سکیں۔ نہ نوید کے لئے آنسو بہا سکیں۔ نوید کی گمشدگی کی خبر محلے میں پھیل چکی تھی۔

عورتیں پرسہ دینے آنے لگیں۔ تارا کو پھر ویسی وحشت ہونے لگی۔ جیسی فرید کے مرنے پر ہوئی تھی۔ ابا کے انتقال پر ہوئی۔

یا میرے مولا۔ میرے نوید کو اپنی امان میں رکھنا۔ وہ بمشکل پلنگ سے اٹھ کر نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی۔

چاندنی نے تو نوید کے آنے کے دل میں کتنے روزے۔ کتنے نفل۔ اور نہ

جانے کیا کیا منتیں مان رکھی تھیں۔ تارا بے بس تھی۔ ہر آنے جانے والے سے نوید کا پوچھا۔ لیکن کچھ پتہ نہ ملا۔

اور اس شام اچانک۔ تارا کے گھر کے دروازے پر ایک کار آکر رکی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

کار والا کب اس کے یہاں آیا کرتا تھا۔

وہ غریب تھی۔ غریبوں سے ملتا جلتا تھا اس کا۔

شاید۔ شاید۔ کوئی نوید کی خبر لایا ہو۔

تارا چارپائی سے اتر کر دہلیز پر آ کھڑی ہوئی۔

اور یہی احساس دل میں لے کر۔ چاندنی نے بھی دروازہ کھول دیا۔

بلند قد و قامت۔ سرخ و سفید سا۔ وہ کوئی اجنبی شخص تھا۔ ہاتھوں میں ڈھیر سے ڈبے اٹھائے۔

تارا اسی گھر میں رہتی ہے۔؟

وہ جھک کر چاندنی سے مخاطب ہوا۔

اس کی شخصیت سے چاندنی کچھ مرعوب سی ہو گئی۔

وہ اس کی ماں کا پوچھ رہا تھا۔

تارا کے کانوں میں بھی اپنا نام پڑ چکا تھا۔

نہ جانے۔ کون تھا وہ۔

وہ دروازے کی اوٹ سے نکل آئی۔

پیلی پیلی رنگت۔ بدرنگ میلے میلے کپڑے۔ بکھرے بال۔ جیسے برسوں کی بیمار

لگ رہی تھی وہ۔

تارا بھابی۔ تم۔ آنے والے نے بیقراری سے اُسے مخاطب کیا۔

بھابی۔ یہ لفظ کتنے سالوں بعد اس کے کانوں میں پڑا تھا۔ کبھی وہ کسی کی بھابی تھی۔ تارا نے آنکھیں پھیلا کر آنے والے کو گھورا۔

وہ شہید تھا۔ فرید کا بھائی۔

فرید سے ملتی جلتی شکل کا۔ ویسا ہی چہرہ لئے۔ وہی انداز لئے۔

تارا کو اچانک زبردست چکر آنے لگے۔ وہ گرنے لگی۔ لڑکھڑانے لگی۔ اور شہید نے اس کی یہ کیفیت جان لی۔

ہاتھوں میں تھاما سامان۔ اس نے آنگن میں پڑے تخت پر ڈال دیا۔ اور آگے بڑھ کر گرتی ڈولتی۔ تارا کو باہوں میں تھام لیا۔

تارا بھابی۔ بھابی۔ بھابی۔

وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تارا دوسرے پل پھر ہوش میں آگئی۔

جھٹکے سے شہید سے دور ہو کر۔ کمرے میں آکر اپنی چارپائی پر گر پڑی۔

شہید کا سواگت۔ اس نے کس انداز سے کیا تھا۔

شہید کا دل تارا کے گھر کی حالت دیکھ کر۔ اس کا روپ دیکھ کر خود رونے لگا۔ اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

یہ وہی تارا تھی۔

جس کی رنگت پر شفق سایہ کئے رہتی۔ جس کی آنکھوں میں ایک سحر تھا کشش تھی۔ وہ سر سے پیر تک خوب صورت تھی۔

چندے آفتاب چندے ماہتاب۔

وہ دلہن بن کر گھر آئی تھی۔ تو اس کی اماں نے کہا تھا۔ ہمارے آنگن میں چاند اتر آیا۔ وہ جوان کے سونے سونے آنگن میں ہر دم ہنسی کی جھنکار پیدا کئے رکھتی۔ یہ ہنسی کبھی شہید کا دھیان کس قدر بٹا دیتی۔

لیکن آج کی تارا۔ بدلیوں میں چھپے ہوئے چاند سے بھی تاریک تھی۔ بجھا ہوا چراغ تھی۔

شہید کو کچھ کہنے کو الفاظ ڈھونڈے سے بھی نہ مل رہے تھے۔

اور دوسری طرف چاندنی حیران پریشان آنکھوں میں آنسو لئے کبھی شہید کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی روتی ہوئی ماں کو۔

اور پھر شہید کی نظر چاندنی پر رک گئی۔

چاندنی تو اس کے جانے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔

لیکن اس میں تارا کی خوبصورتی کا بھرپور عکس موجود تھا۔ وہ بالکل برسوں پہلے تارا جیسی تھی۔ شہید نے آگے بڑھ کر۔ چاندنی کو لپٹا لیا۔

وہ ڈر کر۔ سہم کر دور ہٹ گئی۔ وہ کبھی کسی اجنبی کے اتنے قریب نہ گئی تھی۔ وہ اب بہت چھوٹی سی بچی نہ رہی تھی۔

اس میں شرم اور حیا کا احساس بھرپور طور پر جنم لے چکا تھا۔

"میرے قریب آؤ بیٹی - میں تمہارا چچا ہوں"۔ شہید نے اُسے اپنا اور

اس کا رشتہ بتایا۔

چچا۔ چچا۔ اس کے ابو کا بھائی۔

اس کو سارے رشتوں کے نام آتے تھے۔ لیکن اس کا رشتہ صرف ماں نانی اور بھائی کے ساتھ بندھا تھا۔

چاندنی کا دل ہلکے ہلکے ڈولنے لگا۔ پھر وہ شہید کے کاندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

دونوں ماں بیٹیاں۔ بس آنسوؤں سے ہی غم کی کہانی سنا رہی تھیں۔ شہید چاندنی کو گلے لگا کر خود بھی رونے لگا۔ اُسے دلاسہ دینے لگا۔

اور پھر تارا لرزتی کانپتی چارپائی سے اٹھ بیٹھی۔

"شہید بھیا۔ آپ۔ آپ۔ کہاں سے چلے آئے۔"

اس کے لہجے میں صرف دکھ ہی دکھ تھا۔

شہید۔ کی کہانی مختصر تو نہ تھی۔ وہ تو طویل تھی۔ چند لفظوں میں تارا کو وہ یہ نہ بتا سکتا تھا۔

وہ کہاں سے آیا تھا۔

کہنے لگا۔ میں تمہارے دکھ بانٹنے آیا ہوں۔ بھابی

میرے دکھ بانٹنے۔ تارا کی آنکھوں سے پھر آنسو اُبل پڑے۔ اس کے بکھرے دکھ اب انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ان کو کوئی نہ سمیٹ سکتا تھا۔ چن سکتا تھا۔ بانٹ سکتا تھا۔

"نہ رو بھابی۔ مجھے پتہ ہے۔ تم بہت دکھی ہو۔

ہیں اب اس دکھ کا مداوا کروں گا۔ شہید اس کے جی کے بہلاوے کے طور پر باتیں کرنے لگا۔

تم۔ تم۔

میرے دکھ کا مداوا کیا کروگے۔ میرے دکھ کا مداوا کرنا ہے تو نوید کو ڈھونڈ لاؤ۔ لیکن یہ باتیں اس کا دل کر رہا تھا۔ زبان خاموش تھی۔ آنکھیں رو رہی تھیں۔

شہید نے چاندنی کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔

ارے بھئی۔ ہماری بیٹی روئے جائے گی۔ یا ہم سے باتیں کرے گی۔ شہید نے پھر چاندنی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

وہ اس کی گود سے سر اٹھا کر اپنی آنکھیں رگڑنے لگی۔

بھئی تم نے ہمیں اپنا نام بھی تو نہیں بتایا۔ شہید نے اس کا نام پوچھا۔

"چاندنی" وہ کچھ شرما کر بولی۔

"اوہو۔ تم تو سچ مچ کی چاندنی ہو۔ شہید نے کہا۔

تو چاندنی کچھ اور لجا گئی۔

شہید گھر سے گیا تھا۔ تو تارا ایک بیٹے کی ماں تھی۔ چاندنی تو اس کے جانے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ہاں بھابی۔ ہمارا ایک گڈا بھی ہوا کرتا تھا نا۔

اس نے تارا سے نوید کو پوچھا۔

"جس غم میں آپ مجھے گرفتار دیکھ رہے ہیں — اسی کا تو غم ہے جو مجھے کھائے جا رہا ہے"۔ تارا کب تک صبر کرتی۔

اس کا دل غم کے بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا۔

شہید کو ہمدرد جان کر بوجھ ہلکا کرنے لگی۔

اُسے اپنی کہانی سنانے لگی۔ نوید کی کہانی سنانے لگی۔

اور پھر اس نے اپنے دکھ جیسے۔ شہید کے دل میں منتقل کر دیئے۔

"میں نوید کو ڈھونڈ نکالوں گا"۔

تم بے فکر رہو۔ اُس نے تارا کو اطمینان دلایا۔

لیکن شہید کا دل خود بے سکون سا تھا۔

یہاں آنے کی۔ بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی ساری خوشی جاتی رہی تھی۔

وہ تارا نوید اور چاندنی کے لئے بہت سے تحفے لایا تھا۔

کپڑے۔ کھلونے۔ چاکلیٹ۔ بسکٹ مٹھائیاں۔

بہت کچھ۔

لیکن نہ چاندنی کو ان چیزوں کی خوشی ہوئی تھی اور نہ تارا کو۔ نوید کا خیال ان دونوں کو سکون کا سانس بھی نہ لینے دیتا تھا۔

چاندنی نے سوئی ہوئی اماں کو جھجوڑ کر اپنے چچا کی آمد کی خبر سنا دی تھی۔

محلے کے ڈاکٹر نے نہ جانے اماں کو کیسی دوا دی تھی۔

جو وہ سارا دن غفلت میں ڈوبی رہتی تھیں۔

بمشکل جاگیں۔ چاندنی کی بات سن کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔

تارا۔ شہید کو اماں کی بیماری کے بارے میں بتانے لگی۔

"تم سب گھر والوں نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ سب مریض لگ رہے ہیں۔

اب میں ڈاکٹر بن کر آگیا ہوں۔ سب کا علاج کروں گا۔ شہید نے تارا سے کہا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔"

ہاں اماں کو ضرور آپ کے علاج کی ضرورت ہے۔

وہ بولی۔

اگر تم ٹھیک ہو۔ تو پھر بیمار کس کو کہتے ہیں۔ وہ تارا سے ایسی باتوں میں دیر تک الجھا رہا۔

شام کو شہید گیا تو نوید کی دو تصویریں بھی لیتا گیا۔ اس نے تارا کو دلاسہ دیا تھا۔ کہ وہ یہ تصاویر اخبار میں چھپوا دے گا۔ نوید کی واپسی پر انعام بھی رکھے گا۔

دیکھ لینا۔

تمہارا نوید۔ آج یا کل میں گھر پر ہوگا۔

اور شہید کے اس دلاسے پر۔

تارا کے بیقرار دل کو صبر آگیا۔ وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔

کتنے دن ہو گئے تھے۔ اُسے سلائی کا کام ہاتھ میں لئے۔

وہ مشین لے کر بیٹھ گئی۔

کپڑے سیتے ہوئے بھی اس کا دماغ نوید میں الجھا ہوا تھا۔

نہ جانے کس حالت میں ہوگا۔

کیا کھا رہا ہوگا۔ کہاں سو رہا ہوگا۔

اس پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ سلائی ادھوری چھوڑ کر۔ نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

اب اُسے صرف نماز میں ہی سکون ملا کرتا تھا۔

اشفاق کے یہاں رہ کر نوید کے ٹھاٹ ہی نرالے تھے۔
وہ عمدہ کھاتا تھا۔ عمدہ پہنتا تھا۔ اشفاق نے اس کو ایک دو ریڈی میڈ جوڑے بازار سے منگوا دیئے تھے۔
ائرکنڈیشنڈ کمرے میں سوتا تھا۔ اشفاق کو اللہ میاں نے کوئی اولاد نہ دی تھی۔ بقول اس کے اس نے نوید کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔
پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی۔ نوید پر یہاں پڑھائی کا بھوت بھی سوار نہ تھا۔ کام بھی بس معمولی سا تھا نوید کا۔
ادھر کا سامان اُدھر۔ اور اُدھر کا اِدھر کرنا کون سا مشکل کام تھا۔
اشفاق نوید کو ضرورت کے وقت باہر نکلنے دیتا۔ فلم دیکھنے کا بھی اب نوید کو اشتیاق نہ رہا تھا۔ کیونکہ اشفاق کے پاس ٹیلی ویژن تھا۔ فلم کا ارمان نوید وہی دیکھ کر پورا کر لیا کرتا تھا۔
اشفاق کے گھر رہ کر نوید کو محسوس ہوتا تھا۔
کہ وہ سچ مچ جنت میں آگیا ہے اگر وہ اپنے گھر کے بارے میں سوچتا بھی تو اُسے اپنا گھر جہنم کا نقشہ لئے ہوئے لگتا۔
تنگ و تاریک دو کوٹھری نما کمرے۔ اینٹوں کا صحن۔ رات یہاں کی طرح وہاں

کب۔ جھل مل کرتی ۔ روشنی ہوتی ۔ بے حد کم پاور کے بلب جلائے جاتے ۔
ریڈیو تک نہ تھا گھر میں ۔ ٹیلی وژن تو دور کی بات تھی ۔
روز دال بھجی ۔ جس کو کھا کھا کر ۔ نوید کو کھانے سے نفرت ہو گئی تھی ۔
" اونہہ ۔ بھلا کیا زندگی اسی کو کہتے ہیں "
نوید کی آنکھیں تو اب کھلی تھیں ۔
اسے پیسے کی حقیقت اب معلوم ہو گئی تھی ۔
پیسہ ہے تو جہاں ہے ۔ خوشیاں ہیں ۔
اگر پیسہ نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔
وہ بھی اب پیسے کا دیوانہ تھا ۔ دولت کمانا چاہتا تھا ۔ چاہے بے ایمانی سے کیوں نہیں ۔ وہ سکون چاہتا تھا ۔ راحت چاہتا تھا ۔
دن کے حسین رنگوں میں ڈوبنا چاہتا تھا ۔
دولت کی خواہش اس کے دل میں دن بدن زور پکڑتی جا رہی تھی ۔
اشفاق نے اس کی مٹھی گرم کر کے ۔ اس کو دولت کا متوالا بنا دیا تھا ۔ اور اس کی ہوس دن پر دن بڑھتی جا رہی تھی ۔
صبح کے اخبار میں نوید کی تصویر چھپی تھی ۔
تلاش گم شدہ کے کالم میں ۔
اشفاق روز سویرے پہلے اخبار پڑھتا تھا ۔ صبح کے تازہ اخبار اس کے اٹھنے سے قبل اس کا ملازم ۔ اس کے سرہانے پڑی میز پر سجا جایا کرتا تھا ۔
نوید کی تصویر دیکھ کر چونک پڑا ۔

لکھا تھا۔ نوید کی ماں بہت بیمار ہے اگر نوید خود اُسے پڑھے تو گھر آجائے
اُسے کچھ نہ کہا جائے گا یا اگر نوید کسی کو ملے تو۔ وہ اسے اس پتے پر پہنچا دے۔
لانے والے کو ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔

یہ اشتہار پڑھ کر اشفاق سوچ میں پڑ گیا۔

نوید کو اُس نے اغوا نہ کیا تھا۔ زبردستی نہ رکھا تھا۔ نوید تو اپنی مرضی سے اس کے گھر آیا تھا۔ اور اشفاق نے اُسے پناہ دی تھی۔

لیکن اگر اس اشتہار کو پڑھ کر نوید گھر چلا گیا تو گھر والوں کی پوچھ گچھ سے وہ ضرور اس کا نام بتا دے گا۔

اور اشفاق کسی بات میں اپنا ذرا سا نام بھی نہ لانا چاہتا تھا۔

اشفاق تو چھپا رستم تھا۔

سوسائٹی میں اُسے بڑا مرتبہ اور عزت حاصل تھی۔ اس کے کارناموں کا کسی کو پتہ نہ تھا۔

ویسے بھی اس کا اپنا کاروبار تھا۔ ایکسپورٹ امپورٹ۔ بڑا سا آفس تھا جہاں شیشے کے کمرے میں اشفاق ایک شان سے بیٹھا کرتا تھا۔

لیکن اس کاروبار کے پیچھے جو کالا دھندا تھا۔ ناجائز کمائی تھی۔ اس کا اس کے گروہ کے علاوہ کسی اور کو علم نہ تھا۔

ملک پر ذرا سی آفت آتی۔ تو محب وطن اشفاق ہزاروں کا چیک پیش کر دیتا۔ پریس فوٹوگرافر کے سامنے دوسرے دن اس کی اخباروں میں تصاویر آتیں۔ شہر میں جو بڑی تقاریب ہوتیں۔ ان میں اشفاق کی موجودگی ضروری ہوتی۔

اشفاق تو بڑا نیک نام مشہور تھا۔

وہ تو لوگوں کی نظروں میں پارسا تھا۔ دو تین حج بھی کر چکا تھا۔

پھر بھلا۔ وہ اپنا نام کس طرح لوگوں کے دل میں مشکوک کر سکتا تھا۔

وہ اپنا کام دوسروں کے ذریعے کروانا جانتا تھا۔

جو اس کی بڑھتی دولت سے خود بھی دنیا کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اشفاق نے ہمیشہ ایسے لوگوں کو اپنا ساتھی بنایا تھا۔ جو غریب تھے۔ شکستہ دل تھے۔ زندگی کو عذاب تصور کرتے۔

سچ مچ اشفاق نے ان کو آسمان کی وسعتوں پر لے جا کر بٹھا دیا تھا۔

اشفاق کا تعلق۔ بین الاقوامی اسمگلروں کے گروہ سے تھا۔

اس کے یہاں۔ ہر نسل کے لوگوں کا آنا جانا تھا۔ اس کے پاس افریقی بھی آتے۔ امریکی بھی گورے بھی کالے بھی اس کا گھر بہت بڑا تھا۔

ہر کوئی آسانی سے اس میں سما سکتا تھا۔

اشفاق کے یہاں ہر رات جشن کی رات ہوتی۔ وہ شرابی تھا۔ بدمعاش تھا۔ وہ ہنستے بستے محلوں میں رہنے کا اہل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی اس نے شہر کے ویرانے میں یہ محل کھڑا کیا تھا۔ جہاں اُس کی خبر رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اور جو تھے اُس کے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے۔

کراچی۔ لاہور۔ پشاور۔ کابل۔ ایران۔ ہانگ کانگ۔ کینیڈا غرض ہر جگہ اس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔

جو ایک دفعہ اشفاق کا وفادار ہوتا۔ تا عمر اُس کا وفادار ہی رہتا۔

اگر وہ گرفتار بھی ہو جاتا۔ تو اشفاق کا کچھ نہ بگڑتا۔ اور پولیس تک کو شک نہ ہوتا۔ یہ اشفاق کا ساتھی ہے۔

اشفاق نے اخبار تہہ کر کے واپس میز پر رکھ دیئے۔

اُسے معلوم تھا۔ کہ نوید خود اخبار پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ لیکن اُس کو یہ دھڑکا لگا کہ کوئی دوسرا نوید کو نہ بتا دے۔

اس کا خیال پہلے عابد کی طرف گیا۔

کہیں ہزار روپلے کا لالچ اُسے رسوا نہ کر دے۔ پھر اشفاق کا خیال درست نکلا۔

عابد آیا تو یہی خیال دل میں لے کر۔ کہ وہ نوید کو بتائے گا کہ اس کی ماں اس کے لئے کس قدر پریشان ہے۔

صبح کے اخبار میں اس کے گھر والوں نے نوید کی تصویر دیکھی تھی۔ ناشتے پر نوید کا چرچا رہا۔

جو اپنی بیوہ ماں کو دکھ دے کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

وہ کہاں تھا۔ عابد کو اچھی طرح خبر تھی۔ اس کا ناشتہ کرنے میں جی نہ لگا۔ سیدھا وہ اشفاق کی کوٹھی پر پہنچا۔

لیکن نوید سے پہلے اس کی مڈبھیڑ اشفاق سے ہوئی۔

خبردار جو تم نے نوید کو کچھ بتایا۔ اشفاق نے عابد کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ عابد سہم گیا۔ ایک ہزار روپے کا نشہ ہرن ہو گیا۔

"نوید اب ایک بار جو یہاں آگیا ہے۔ تو سمجھو ہمیشہ کے لئے آگیا۔"

وہ اپنی ماں کے لئے ہمیشہ کے لئے مر گیا۔

اشفاق سنگدلی سے بولا۔

عابد نوید سے ملے بغیر چلا گیا

نوید کو اشفاق نے ہفتہ بھر گھر سے نکلنے نہ دیا

نوید ہفتے بھر مزے سے گھر پر آرام کرتا رہا۔ تقریباً ایک ہفتے بعد اشفاق نے اس کو بلایا۔

نوید کراچی میں ایک ضروری کام ہے۔ تم میرا کچھ سامان لے کر کراچی چلے جاؤ۔ میں نے کل جہاز کے لئے تمہاری سیٹ بک کرا دی ہے۔

جہاز میں سفر کرنے کا سن کر۔ نوید تو ابھی سے ہواؤں کے دوش پر اڑنے لگا۔ جاگتے میں سپنا دیکھنے لگا۔

اشفاق اس کو یہ خبر سنا کر ایک دوسری کیفیت میں مبتلا کر کے چلتا بنا۔ اور نوید کے دل میں اچانک خوشی کا احساس بجھ گیا۔

دوسرے پل اُسے اپنی امی یاد آنے لگیں۔

امی۔ جن سے بچھڑے اُسے ایک ہفتے سے زائد ہو چکا تھا۔ لیکن نوید کو محسوس ہوتا۔ یہ ایک ہفتہ ایک صدی میں پھیل چکا تھا۔

اس کا دل ماں سے ملنے کو تڑپنے لگا۔

لیکن اب وہ مجبور تھا۔ اشفاق کے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔ اس کی ماں اس سے ہمیشہ کے لئے جیسے بچھڑ چکی تھی۔

دوسرے دن اشفاق نے اُسے صبح صبح تیار ہونے کی ہدایت کی۔ اس کے

کپڑے بھی اشفاق نے نئے سلوائے تھے۔

نئے سوٹ میں وہ بالکل نوابزادہ لگ رہا تھا۔

پھر اشفاق کی کار میں بیٹھ کر وہ ائرپورٹ چلا گیا۔ اس کے پاس جو سامان تھا۔ اس میں کیا تھا۔ یہ بھی نوید کو نہ معلوم تھا۔

اشفاق نے اُسے ہدایت کر دی تھی۔ کراچی ائرپورٹ پر تمہیں لینے اُس کا دوست آجائے گا۔ اشفاق نے اُسے نوید کی تصویر پہلے سے بھیج دی تھی۔ تاکہ اس کو نوید کے پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔

نوید نے وہ شہر چھوڑا۔ تو اس کا دل سچ مچ رو رہا تھا۔

کراچی دیکھنے اور جہاز میں بیٹھنے کی خوشی جاتی رہی تھی۔

اشتہار چھپے مہینہ بھر ہو گیا۔ لیکن نوید نہ آیا۔

تارا کی آنکھیں سچ مچ اس کا انتظار کرتے کرتے پتھرا گئی تھیں۔

اب تو اس کے دل کی امید جاتی رہی تھی۔

کہ پھر جیتے جی وہ نوید کو دیکھ بھی سکے گی یا نہیں۔ اس کے دل نے یہ دکھ بھی دکھوں میں سمو لیا۔

اگر شہید سہارا بن کر نہ آجاتا۔ تو تارا سچ مچ مر چکی ہوتی۔

شہید تقریباً اب روز آنے لگا تھا۔ وہ اماں اور تارا کا معالج بنا ہوا تھا۔

تارا نوید کے صدمے سے اتنی نڈھال تھی۔ کہ اُس سے بستر سے اٹھا بھی نہ جاتا۔

شہید اس کے لئے طاقتور دوائیں۔ فروٹ۔ انجکشنز نہ جانے کیا کیا لے آیا تھا۔

زبردستی اس نے تارا کو دو گلوکوز کی بوتلیں بھی چڑھائی تھیں۔

ڈرالیں لگنے سے تارا میں ذرا سی جان آئی تھی۔ ان دنوں اس نے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا تھا۔

نوید کا صدمہ ناقابل برداشت تھا۔

کبھی دکھ کی ایک لہر دل میں جو اٹھتی تو تارا درد سے بے چین ہو جاتی ۔

مجھے مرنے دیں. شہید بھیا ۔ مجھے مرنے دیں ۔

وہ شہید سے التجا کرتی ۔ تارا بھابی چاندنی کی طرف دیکھو اس کا کچھ خیال کرو ۔ تم نے اس کے لئے جینا ہے ۔

چاندنی ۔ اس کی معصوم بچی ۔ جو کھلنے سے پہلے مرجھا رہی تھی ۔

"ہاں مجھے جینا ہوگا ۔"

چاندنی کے لئے ۔ میں نہیں مروں گی ۔ اس کو کس کے سہارے چھوڑوں گی دنیا میں ۔ اماں تو خود چراغ سحری ہیں ۔

"پھر بھری دنیا میں میری چاندنی کس طرح رہے گی :"

تارا یوں ڈرنے لگتی ۔ سہمنے لگتی ۔ جیسے سچ مچ موت اس کے سرہانے کھڑی ہو

وہ شہید کے ہاتھ سے گولیاں لے کر نگل لیتی ۔ انجکشن لگوا لیتی ۔

اور پھر چپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتی ۔

اس کی بند بند آنکھوں سے کبھی پانی کا کوئی قطرہ پھیل کر باہر آجاتا ۔ اور شہید اس کے یہ آنسو دیکھ لیتا ۔

دکھ سے ۔ وہ تارا کی بجھی بجھی صورت تکنے لگتا ۔

حالات نے تارا کو لوٹ لیا تھا ۔

اس کی خوبصورتی کو ۔ اس کی رنگت کو ۔ اس کی خوشیوں کو ۔

لیکن تارا اب بھی اپنے اندر ایک سحر رکھتی تھی ۔

وہ بھی اچھی لگتی تھی ۔

بجھی بجھی۔ اداس اداس۔ اجڑی اجڑی تارا۔

لیکن شہید تو ڈوب رہا تھا۔ اُس کے دکھوں کے سمندر میں۔ تارا کے چاروں طرف جو دکھوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ شہید اس سمندر میں ڈوبتی ڈولتی۔ تارا کو مانجھی بن کر نکالنا چاہتا تھا۔

اُسے ساحل پر لانا چاہتا تھا۔ ایسے ساحل پر جہاں دکھ نہ ہوں۔ پیاس نہ ہو، دکھوں کی پھوار شہید کے دل میں بھی برسنے لگی۔

وہ خود دکھوں کا مارا تھا۔ غموں سے آشنا تھا۔

شہید تارا کو۔ گرداب سے نکالنا چاہتا تھا۔

لیکن کیسے۔ کس طرح۔

اس کی خبر شہید کے دل کو بھی نہ تھی۔

تارا کی زندگی میں کوئی دکھ تو نہ تھا۔

لیکن اس وقت تمام دکھوں پر بھاری۔ نوید کی جدائی کا دکھ تھا۔

اور نوید کے بغیر تارا دکھوں کی اس دنیا سے ہرگز بھی نہ نکل سکتی تھی اس کا شہید کو بھرپور احساس تھا۔

لیکن وہ بھی کیا کرتا۔

اور نوید کی تلاش میں شہید ناکامیاب ہو چکا تھا۔

اب خود شہید کا دل کہنے لگا تھا۔ نوید اب کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا کبھی کبھی بھی نہیں۔

لیکن نوید نہ پلٹ کر نہ آیا۔

کراچی سے اس کا خط آگیا۔ اور تارا کو محسوس ہوا۔
گھپ اندھیرے میں جیسے روشنی کی شعاعیں بکھر گئیں۔
نوید نے لکھا تھا۔
"امی مجھے کراچی میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی ہے۔"
اس نے اپنی خوشحالی کا ذکر کیا تھا۔
کسی نعیم چچا کا ذکر کیا تھا۔ جنہوں نے اُسے بیٹا بنا کر رکھا ہوا تھا۔
"میری فکر مت کیجئے گا۔ امی۔ میں بہت خوش ہوں۔
اور امی آپ کو میں پانچ سو روپے کا منی آرڈر کروا رہا ہوں۔
اس خط کے ساتھ نوید کا کوئی پتہ نہ لکھا تھا۔ وہ کہاں رہ رہا تھا۔ کیا کر رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا خط میں۔
چند خیریت کے بول۔ خوشی کا اظہار۔
نوید زندہ تھا۔ خوش تھا۔ یہی بہت کچھ تھا۔ تارا کے لئے۔
وہ کتنے عرصے بعد خوش ہو گئی۔
اترے اترے چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا۔
اس کا نوید ملازمت کرنے لگا تھا۔
اور تنخواہ بھی اس کی شاید بہت زیادہ تھی۔ جب ہی تو وہ اُسے پانچ سو روپے بھیج رہا تھا۔
لیکن نوید کو ملازمت مل کس طرح گئی۔
اُسے تو کچھ بھی نہ آتا تھا۔ وہ کس قابل تھا۔

تارا سوچ میں پڑ گئی۔

شاید۔ اللہ میاں کو میری حالت پر رحم آگیا ہو۔ اُس نے یہ راہ نکال لی ہو۔

وہ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

چاندنی اسکول سے آئی تو وہ بھی بے حد خوش ہو گئی۔

فوراً وضو کر کے نماز اور نفل پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

امی میں کل روزہ رکھوں گی۔ میں نے منت مانی تھی۔ اگر بھیا کی خبر آئے گی تو میں روزہ رکھوں گی۔

کتنی ہمدرد تھی۔ وفادار تھی۔ چاندنی۔ لڑکیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ محبت کرنے والی۔ اپنوں پر مرنے والی۔ سچ اگر بیٹی نہ ہو۔ تو مرے ہوئے ماں باپ کو دنیا میں کوئی رونے والا بھی نہ ہو۔

تارا سوچ میں پڑ گئی۔

زبید کے خط سے تارا کا غم آپ ہی آپ دور ہو گیا تھا۔

کتنے دن سے اس نے مشین نہ چلائی تھی۔ اگر شہید اُسے زبردستی پانچ سو روپے نہ دے دیتا تو۔ سچ مچ تارا کے گھر میں فاقے ہونے لگتے۔

لیکن تارا بڑی خوددار تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ وہ شہید کے یہ روپے لوٹا دے گی۔ اب تو اس کے لئے آسانی ہو گئی تھی۔

اس کا زبید جو کمانے لگا تھا۔

دوپہر جو تارا مشین لے کر بیٹھی۔ تو رات ہو گئی اُسے کپڑے سیتے سیتے شہید آیا۔ تو وہ چہرے پر تھکن لئے۔ یہ کام کرنے میں مصروف تھی۔

شہید ڈاکٹر تھا۔ تارا کی حالت جانتا تھا۔ اُسے صرف آرام کی ضرورت تھی۔ تارا کو کام کرتے دیکھا تو الجھ گیا۔

تم اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو تارا بھابی۔

وہ مسکرانے لگی۔ زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت ہی پڑتی ہے۔ شہید بھیا۔ تارا کے ارد گرد سلے اور بغیر سلے کپڑوں کا ایک انبار تھا۔

شہید کو نہیں معلوم تھا۔ وہ دوسروں کے کپڑے سیتی ہے۔

اس کو اب اندازہ ہو گیا۔ ایک گھونسہ سا پڑا جیسے دل پر۔

کیا تم دوسروں کے کپڑے سیتی ہو بھابی۔؟ اس نے فوراً سوال کر ڈالا۔

اور تارا اُسے بتانے لگی۔ یہ مشین میرے بڑے کام آئی۔

اس نے میرے بچوں کو پروان چڑھایا۔ نہیں وہ وقت روٹی اس مشین نے مہیا کی۔ تارا نے سچ ہی کہا تھا۔

نہیں۔ نہیں۔ تارا بھابی۔ اب میں تم کو یہ کام نہ کرنے دوں گا۔ تم دوسروں کے کپڑے نہیں سیو گی۔

شہید نے اس کے آگے سے سچ مچ کپڑوں کا ڈھیر سمیٹ لیا۔

تارا کی آنکھوں میں بیچارگی اتر آئی۔

شہید بھیا میرے ہاتھ تو نہ کاٹیں اس طرح۔

نہیں تارا بھابی۔ اب تم یہ کرو گی تو مجھے دکھ ہوگا۔ میں جو آگیا ہوں۔ شہید نے پھر اُسے اپنے آنے کا احساس دلایا۔

" آپ۔ آپ۔ وہ آنکھوں میں تیرگی لا دا سی لئے شہید کو تکنے لگی۔ پھر

شہید اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا۔
چہرے پر کیا تھا۔

تارا کی نظریں جھک گئیں۔ آپ کے بھی تو الگ مسائل ہوں گے۔
آپ کیوں ہماری وجہ سے دل خراب کرتے ہیں۔

"میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تنہا ہوں۔ تنہا"

تنہا۔ تو پھر شہید بھیا یہ تنہائیاں دور کیوں نہیں کر لیتے۔

وہ اچانک اس سے پوچھنے لگی۔

ہو تو گئیں۔ تمہارے پاس آ کر چاندنی کے پاس آ کر۔

شہید نے عجیب سی بات کہی تھی۔

تارا چپ ہو گئی۔ کچھ اور بولنے کی اس میں ہمت نہ رہی۔

شہید نے آتے ہی اس کو دوسری باتوں میں ایسا الجھایا تھا کہ تارا کو نوید کے خط کا بتانے کی مہلت نہ ملی۔ مشین کے ٹیبل کی دراز سے نوید کا خط نکالتے ہوئے بولی ——

آج میرے نوید کا خط آیا ہے۔

اچھا۔ شہید چونک پڑا۔ کہاں سے۔ کہاں ہے وہ۔ اچانک اس نے یہ سوال کر ڈالے۔ جواب میں تارا نے نوید کا خط اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

لیکن نوید نے اپنا کوئی پتہ نہیں لکھا کیا؟ شہید نے خط پڑھ کر تارا سے سوال کیا۔

انکار میں تارا گردن ہلانے لگی۔

شہید سوچ میں پڑ گیا۔

کہیں نوید غلط ہاتھوں میں تو نہیں پڑ گیا۔

چودہ پندرہ سال کا لڑکا۔ ساتویں جماعت بھی جس نے پاس نہ کی تھی۔ چھ ماہ میں اتنا کچھ کمانے لگا۔ کہ وہ ماں کو بھی پانچ سو روپے بھیج رہا تھا۔

اگر نوید کوئی پتہ لکھتا تو شہید خود جا کر اُسے وہاں سے لے آتا۔ لیکن نوید نے تو بڑی رازداری سے کام لیا تھا۔

شہید نے اپنے خیالات۔ تارا پر ظاہر نہ کئے۔

آج ایک مدت کے بعد۔ اس نے تارا کے اجڑے اجڑے چہرے پر اطمینان کی لہر اترتے دیکھی تھی۔

اگر وہ کچھ کہتا۔ تو تارا پریشان ہو جاتی۔

کچھ سوچ کر اس نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ مٹھائی کھلاؤ پھر تو بھابی۔ تارا مسکرانے لگی۔

اداس اداس چہرے پر یہ مسکراہٹ بے حد پیاری لگنے لگی۔ اور تارا کو کچھ اور خوش کرنے کے لئے۔

شہید اٹھا۔ چاندنی کو بھی ساتھ لیتا گیا۔

وہ جب واپس آیا۔ تو چاندنی کے ہاتھوں میں مٹھائی کے ڈبے تھے۔ شہید کے ہاتھوں میں پھلوں کے لفافے۔ بسکٹ کے پیکٹ۔

نہ جانے کیا تھا۔ وہ گاہے گاہے کچھ اس طرح تو تارا پر احسان کیا کرتا تھا۔

"اللہ شہید بھیا۔ اتنا تکلف کرتے ہیں آپ۔ اور ساتھ ساتھ فضول خرچی

بھی۔ بری بات ہے۔ یہ۔ وہ نصیحت کے موڈ میں آگئی۔

"تو بتلاؤ تارا — میں کنجوسی کس کے لئے کروں۔ بچت کس کے لئے کروں۔ وہ تارا سے پوچھنے لگا۔

اور تارا اچانک اس سے کہنے لگی۔

آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر کیوں نہیں بسا لیتے۔

وہ ہنسنے لگا زور زور سے۔

" اب - اس عمر میں - تارا بھابی - میں تو بوڑھا ہو رہا ہوں۔ اُس نے اپنے سفید ہوتے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔

بال تو آج کل نو عمری میں سفید ہو جاتے ہیں۔ صحت اور چہرے سے تو آپ بوڑھے نہیں لگتے۔ تارا نے کہا۔

وہ سنجیدگی سے مسکرانے لگا۔

کون کرے گا مجھ سے شادی۔ ؟۔ اس نے پھر تارا سے سوال کیا۔ ہزاروں لڑکیاں ہیں اس دنیا میں۔ پھر آپ میں کمی کیا ہے۔ قابل ہیں لائق ہیں۔ دولت ہے آپ کے پاس۔ جس کو گھر لائیں گے نا۔ وہ فخر کرے گی اپنے آپ پر۔

تارا آج شہید کی تعریف کرنے کے موڈ میں تھی۔

اچھا۔ اچھا۔ وہ برابر ہنسنے لگا، تمہاری نظروں میں اتنی خوبیوں کا مالک ہوں میں بھی مجھے کیا۔ ہزاروں لڑکیوں سے۔

فقط اگر بیاہ رچانا ہے بھی تو ایک عدد کافی رہے گی۔ وہ شوخ سا ہو گیا۔ اگر میں جسے چاہوں۔ وہ آمادہ نہ ہو تو۔ وہ تارا سے پوچھنے لگا۔

تو بیوقوفی کرے گی، نادانی کرے گی وہ۔ تارا کہنے لگی۔

"اچھا۔" وہ پھر مسکرانے لگا۔

تو میرے بارے میں تم یہ کہتی ہو۔

ہاں۔ ہاں۔ تارا اب شہید کی باتوں اور اس کے انداز پہ گھبرا گئی۔

شہید کی موجودگی میں وہ کام تو کر سکتی نہیں تھی۔

بکھرے کپڑے سمیٹ کر مشین بند کرنے لگی۔

شہید۔ جا کر اماں کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ روز اپنا بیگ ساتھ لایا کرتا تھا۔ لاکھ علاج معالجے سے بھی اماں کی حالت تسلی بخش نہ تھی

دن دن بھر وہ سادہ چارپائی پہ پڑی رہا کرتی تھیں۔

شہید آتا تو اسے جی بھر کے دعائیں دیا کرتی تھیں۔ اس مشکل اور کڑے وقت میں اللہ میاں نے شہید کو رحمت کا فرشتہ بنا کر ان کی مدد کرنے کے لئے اس گھر میں بھیجا تھا۔

وہ آتا تو سونے سونے گھر میں رونق کا احساس ہونے لگتا۔ اماں خوش ہو جاتیں۔ تارا تھوڑی دیر کو غم بھول جاتی۔ اور چاندنی چچا سے باتیں کر کے۔ اُس کی پیار کی شدت محسوس کر کے۔ باپ کی سی شفقت پا لیتی۔ اس کے دل سے باپ کی کمی کا احساس جاتا رہتا۔ جس طرح باپ اپنی اپنی اولاد کو چاہتے ہیں۔

شہید بھی اسی طرح چاندنی کو چاہتا تھا۔ اکثر شام کو اُسے اپنی چھوٹی سی کار میں بٹھا کر سیر کرانے لے جاتا۔

چاندنی نے کب اس طرح موٹر میں بیٹھ کر سیر کی تھی۔

اس وقت چاندنی کی خوشی قابل دید ہوتی۔ شہید اُسے پارک لے جاتا۔ سمندر کے کنارے کی سیر کو لے جاتا۔ بازار لے جاتا۔ ڈھیروں چیزیں دلوا دیتا۔

چاندنی۔ نہ نہ کرتی رہتی۔ تکلف کرتی رہتی۔ لیکن شہید کب اس کی سنتا تھا۔

جب سے شہید آیا تھا۔ چاندنی اچھا پہننے لگی تھی۔

بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ چاندنی میں بھی۔ فطرت کے مطابق پہننے اور بننے سنورنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

لیکن اُسے گھر کے حالات معلوم تھے۔ وہ ہر خواہش کا گلا بخوبی گھونٹ لیتی۔ اُس نے کبھی کوئی ضد یا بے جا خواہش کا اظہار کر کے ماں کو پریشان نہ کیا تھا۔

لیکن اب اس کی امیدوں اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے شہید آگیا تھا۔ اس کی آمد پر چاندنی بے حد خوش تھی کہ وہ اس کا اظہار نہ کر سکتی تھی۔ وہ کتنا چاہنے لگی تھی اپنے چچا کو۔ بس صرف اس کا دل جانتا تھا۔

جس دن شام کو شہید کسی ضرورت کے تحت نہ آتا۔ تو وہ شام چاندنی کی بے حد اداس گزرتی۔

اور پھر گاہے گاہے نوید کے خط آنے لگے۔

ہر خط میں۔ وہ اپنی بے پناہ مسرت اور شادمانی کا تذکرہ کرتا۔

امی کو ہدایت کرتا۔

آپ میری یاد میں کبھی رنجیدہ نہ ہوا کیجئے میں بہت خوش ہوں۔ عنقریب آپ سے ملنے آؤنگا۔

ہر دوسرے تیسرے ماہ نوید کا منی آرڈر بھی آجاتا۔ پانچ سو روپے کا۔

لیکن نوید رہتا کہاں تھا۔

کراچی میں اس کا کونسا ٹھکانہ تھا۔ اس کا کھوج ڈھونڈے نہ ملا۔ تارا کے لئے یہی بہت کچھ تھا۔

اس کا نوید خوش تو ہے۔

وہ جدائی کا زخم اس کو بخش گیا تو کیا ہوا۔ ان زخموں کا تو اس کا دل عادی تھا وہ اسے حیرت تھی اس دل پہ۔ جو سچ مچ کتنا وسیع ہو گیا تھا کہ آسانی سے ہر دکھ اپنے میں سمو لیتا تھا۔

تارا اب ابھر رہی تھی

شہید کی باتوں پہ۔ اشاروں کنایوں میں وہ اس سے کیسی باتیں کرتے

لگا تھا. تارا گھبرا جاتی تھی۔ فق ہو جاتی تھی۔

اب تو شہید نے اُسے بھابی بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔

تارا کو اس کا یہ انداز بے حد بُرا لگا تھا۔

کتنی بار اس نے شہید کو ٹوکا تھا۔

آپ نے مجھے بھابی کہنا کیوں چھوڑ دیا۔

بھابی — یہ لفظ اسے کتنا بھاتا تھا۔

کتنی اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ اس لفظ میں۔

لیکن اب شہید کے منہ سے اُس کے لئے بھابی کا لفظ نکلتا ہی نہ تھا۔

"شہید بھیا — میں کبھی آپ کے مرحوم بھائی کی بیوی ہوا کرتی تھی۔ وہ مر کر آپ کا بھائی نہ رہا نا جو آپ نے وہ رشتہ فراموش کر ڈالا"۔

اُسے شہید پر غصہ آنے لگتا۔

"لوگ تو جیتے جی فراموش کر ڈالتے ہیں۔ تارا۔ کیا رکھا ہے رشتوں میں۔ اور پھر تم مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی ہو۔

تمہارا احترام کرتے ہوئے میں اچھا نہیں لگتا"۔

شہید کب تارا کی باتوں پر کان دھرتا تھا۔

وہی کرتا تھا جو اس کا من چاہتا تھا۔

اور کبھی تارا اُسے ماضی کی طرف لوٹانا چاہتی۔ اُسے یہ احساس دلانا چاہتی۔ شہید کبھی تو تم مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ میری ہنسی سے تمہیں الجھن ہوتی تھی۔ میری ہنسی کو نظر لگ گئی۔

شاید تمہاری۔ تمہاری۔

اس کا دل عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو جاتا۔

شہید تو اس وقت اس سے بات بھی نہ کرتا تھا۔ جب فریدہ کی دلہن بن کر اس نے اس کا گھر آباد کیا تھا اس کی وجہ سے شہید ہوسٹل چلا گیا۔

اب وہی شہید اتنا بدل چکا تھا۔

کیوں۔۔؟ صرف مجھ پر ترس کھا رہا ہے۔ میں ہوں بھی تو لوگوں کی ہمدردی کی مستحق۔ اور ایک بار اس نے شہید کو اس بات کا احساس دلایا۔

"آپ اتنے کس طرح بدل گئے۔ شہید بھیا"۔

کبھی تو میں آپ کو بہت بُری لگتی تھی نا۔

تارا کے چہرے پر عجیب سا رنگ تھا۔ اور شہید کچھ نادم سا ہو گیا۔ اُسے اپنے پچھلے رویے کا شدت سے احساس تھا۔ جب وہ جنون کی کیفیت میں رہا کرتا تھا۔

کتنا ناسمجھ تھا۔ نادان تھا وہ۔

اب تارا نے اس سے سوال کیا تھا۔ جواب دینا ضروری تھا۔

تارا — میں ان باتوں کی اب تلافی چاہتا ہوں۔ بھول جاؤ۔ تارا ان باتوں کو ورنہ مجھے اب بھی دکھ ہو گا۔

تارا۔ تارا۔ تارا۔

کتنی اپنائیت تھی شہید کی زبان میں۔ چاہت تھی۔ تارا کا دل عجیب سا ہونے لگا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

چپ چاپ شہید کے پاس سے اٹھ گئی۔

چھٹی کا پورا دن۔ شہید تارا کے گھر گذارا کرتا۔ اس سے فرمائش کر کے کھانے پکواتا۔ سودا سلف، وہی خرید کر لاتا۔

خوب عمدہ عمدہ کھانے۔ کبھی شامی کباب۔ کوفتے۔ مرغ پلاؤ۔ پراٹھے اور تارا کو پھر بھولے بسرے دن یاد آنے لگتے۔

کبھی فرید کے لئے اس کی فرمائش پر وہ یہ سب پکایا کرتی تھی۔ اس طرح ہی چھٹی کے دن۔ وہ۔ سودا خرید کر لاتا تھا۔

فرید کے بعد اس کی زندگی کتنے سپاٹ راستے پر گذری تھی۔ نہ اس نے اچھا کھایا تھا اور نہ اچھا پہنا تھا:

اب شہید کچھ انجانی سی ہلچل لے کر پھر آگیا تھا۔ تارا دل کی اس ہلچل پر اپنے آپ سے ڈرنے لگی تھی۔

تارا کھانا تیار کر لیتی۔ تو پھر دسترخوان بچھتا۔

لیکن تارا کے حلق میں نوالے اٹک اٹک جاتے۔

اسے نوید یاد آنے لگتا۔ نہ جانے کیا کھا رہا ہو گا۔ کہاں سو رہا ہو گا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو کوئی خوشی نہ دی تھی۔

کبھی اچھا کھلایا بھی نہ تھا۔ کیا کرتی وہ۔۔ اس کی حیثیت اتنی کہاں تھی۔ روز دال کھا کھا کر۔ نوید بور ہو گیا تھا۔

کھانا وہ سامنے رکھتی۔ تو منہ بسورنے لگتا۔ روز دال۔ کبھی وہ غصے کا اظہار کر ڈالتا اور تارا جھنجھلا جاتی۔

شکر کرو۔ جو دو وقت پیٹ بھرنے کو روٹی مل جاتی ہے۔ وہ سنگدلی سے کہتی۔

اب تارا کو احساس ہوتا۔

اس نے سچ مچ نوید کو دکھ دیئے تھے۔ اس پر ظلم کیا تھا۔ اب وہ اس کے لئے ترس رہی تھی۔

بیٹے کو پیار سے گلے لگا کر اب اس کی تلافی چاہتی تھی۔

نوید کا خیال آتے ہی تارا کی بھوک پیاس سب کچھ ختم ہو گئی۔

شہید کے لاکھ اصرار پر بھی وہ کچھ نہ کھا سکی۔

شام کو شہید نے سیر کا پروگرام بنایا۔

چاندنی کو تو وہ اکثر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ سیر تفریح کو۔

لیکن تارا نے کبھی اس کا ساتھ نہ دیا تھا۔

لاکھ بہانے ہوتے اس کے پاس۔

مجھے کام ہے۔ بھئی میں کیا کروں گی۔ جا کر

دل بہل جائے گا۔ شہید کہتا۔

اُف او۔ گھبرا کب رہا ہے میرا دل۔ وہ شہید کو لاجواب سا کر دیتی۔

شہید کی نہ جانے سب سے بڑی آرزو یہ کیوں تھی۔ کہ تارا اس کے ساتھ باہر چلے۔ موقع پا کر وہ یہی فرمائش کرتا۔

لیکن تارا کو بھی لاکھ بہانے آتے تھے۔

کبھی اماں کی تنہائی کا بہانہ کر دیتی۔ نہ چلا بھی جاتا۔ اماں کی یہ حالت تو نہ تھی

کر ان کو تنہا چھوڑا جاتا۔

لیکن آج اماں کے پاس اتفاق سے رشیدہ آ گئی تھیں۔

رشیدہ کی صورت اب تارا کو زہر لگنے لگی تھی۔

وہ اماں کو اس کے خلاف بھڑکا جو جاتی تھی۔

شہید کی خواہش پر آج وہ باہر جانے پر آمادہ ہو گئی۔

چلو تو پھر فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ شہید خوش ہو گیا۔

تارا نے اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔

میلا سا لباس۔ بکھرے بال۔ عجیب سا حلیہ ہو رہا تھا۔

وہ تو بس ایسے ہی حلیے میں رہتی تھی۔

کب بنتی سنورتی تھی وہ۔ اس نے تو کب سے کسی آرائش کی چیز کو چھوا بھی نہ تھا۔

اس کی سوچ کے مطابق قسمت نے تو اس سے اس کا یہ حق چھین لیا تھا۔ بیوگی کا داغ بخش کر۔

اندر آ کر تارا اپنی الماری الٹنے پلٹنے لگی۔

اب اس کے پاس کوئی اچھا کپڑا نہ رہا تھا۔ اس نے کب سے نیلے پیلے گلابی سرخ رنگ کے کپڑے پہننے چھوڑ دیئے تھے۔ اس کے پاس جو جھل مل کرتے جوڑے تھے۔ اس کے جہیز کے بری کے۔ وہ اس نے بڑے صندوق میں بڑی احتیاط سے پیک کر رکھے تھے۔ اپنی چاندنی کے لئے۔

چاندنی اب بڑی ہو رہی تھی۔ چند قدم اور چل کر وہ جوانی کی منزل

پر قدم رکھنے والی ننھی چاندنی کو بیاہ دینے کے دن قریب تھے۔

ہر ماں کی طرح تارا کو بھی ابھی سے چاندنی کی فکر تھی۔ اس کے جوڑوں کی۔ جہیز کی۔ اچھے رشتے کی۔

وہ عادت کے مطابق پھر الٹی سیدھی سوچوں میں بھٹک گئی۔ کہ چاندنی نے اسے چونکا دیا۔ وہ اپنا سب سے اچھا۔ گلابی سوٹ پہن کر گڑیا سی لگ رہی تھی۔ تارا کی نظریں۔

بیٹی کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ اس کی چاندنی۔

دن بہ دن پیاری ہو رہی تھی۔ دن بہ دن نکھر رہی تھی۔

اس کے گلابی چہرے پر شفق اترنے لگی تھی۔ بھوری بھوری بڑی بڑی آنکھوں میں سحر جاگنے لگا تھا۔ اس کا جسم جوانی کی کشش اختیار کرنے لگا تھا۔

"میں بھی تو کبھی ایسی تھی"

تارا کا ڈوبتا عکس۔ چاندنی میں ابھر رہا تھا۔

"اللہ امی۔ آپ تو بہت دیر لگا رہی ہیں" چاندنی نے پھر اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ ڈالا۔

وہ جلدی جلدی کپڑے ٹٹولنے لگی۔ کسی کی شلوار تھی تو دوپٹہ غائب۔ دوپٹہ تھا تو شلوار نہیں تھی۔ وہ گھر میں کب کپڑے میچ کر کے پہنتی تھی۔ کونے میں پڑی کالی شیفون کی ساڑھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔

بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی موجود تھا۔ لاتعداد شکنوں والی وہ ساڑھی اتنے برسوں سے یوں پڑی پڑی پرانی سی لگنے لگی تھی۔

اس میں دور دور پڑی کامدانی سیاہ ہو چکی تھی۔

"چاندنی جلدی سے اس میں استری پھیر دے"۔ اس نے چاندنی کے حوالے وہ ساڑھی کی۔ خود ہاتھ منہ دھونے چل دی۔

کالی ساڑھی میں اس کی دبتی رنگت پھر سفید لگنے لگی۔ ساڑھی میں لپٹی لپٹائی وہ پھر بے حد اچھی لگنے لگی۔

شہید باہر کار میں بیٹھا تھا۔ ہارن پر ہارن بجا رہا تھا۔ تارا اماں کو باہر جانے کا کہہ کر۔ دہلیز پر آئی۔ تو رشیدہ کی طنز میں ڈوبی آواز تارا کے کانوں سے ٹکرائی:۔

چلو۔ دیور کے آنے سے۔ تارا کا جی تو بہل گیا۔ سیر سپاٹے بھی کرنے لگیں۔

اف۔ تارا کا جی لرزنے لگا۔

کیا سیر سپاٹا کرنا گناہ تھا۔ اس کا موڈ بُری طرح خراب ہو گیا۔ جی چاہا — واپس چلی جائے۔

لیکن شہید اسے دیکھ کر پکار رہا تھا۔

بھئی تارا جی آ جاؤ نا۔

وہ کار کے قریب چلی آئی۔

اس نے دیکھا۔ چاندنی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اور تارا کے لئے شہید نے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

وہ شہید کے اتنے قریب بیٹھنے سے کترانے لگی۔

میں پیچھے بیٹھوں گی۔ شہید بھیا۔

"تو پھر میں گاڑی نہیں چلاؤں گا"۔ شہید نے دھمکی دے دی۔

عجیب فطرت کا انسان تھا وہ بھی۔

تارا مجبوراً اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اور پھر تارا نے دیکھا۔ احمد چچا اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تارا کو شہید کے ساتھ جاتے دیکھ کر عجیب سی نظروں سے اُسے گھور رہے ہیں۔

اُدھر کھلے دروازے سے اُسے چچی کی جھلک بھی نظر آگئی۔

دوسری طرف جھروکے پر فاروق کی ماں کھڑی تھی۔

اللہ۔ جیسے ہزاروں نظروں کے تیر تارا پر برس رہے تھے۔

تارا کا دل عجیب سا ہونے لگا۔

جیسے وہ کوئی گناہ کرنے جا رہی ہو۔

لیکن اس کے برعکس۔ شہید بے حد مسرور تھا۔ دھیمے دھیمے گنگناتے ہوئے اس نے کار فل اسپیڈ پر سڑک پر چھوڑ دی۔

وہ تارا سے مخاطب تھا۔ بہت کچھ بول رہا تھا۔

لیکن تارا گم صم تھی۔ جیسے اس کی کوئی بات سن ہی نہ رہی ہو۔

شہید کی ایک بات کا بھی تو اس نے جواب نہ دیا تھا۔

شہید سمجھ گیا۔ تارا اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہے۔

وہ اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔

وہ بھی چپ ہو رہا۔

مختلف راستوں سے ہوتا۔ مختلف سڑکوں سے کار گھماتا ہوا شہید کار

سمندر کے کنارے لے آیا۔

آج بھی چھٹی کا دن تھا۔

اس وجہ سے بے پناہ رش تھا۔

تارا کی نظروں کے سامنے۔ آج ایک طویل عرصے بعد۔ وسیع سمندر۔ تھا۔ مچلتا۔ تڑپتا۔ سمندر اور پھر جیسے وہ سمندر سسکنے لگا۔

پورے کا پورا تارا کی آنکھوں میں سما گیا۔

اس سمندر نے اس کے فرید کی زندگی کو نگلا تھا۔

فرید۔ فرید۔ فرید۔

آج کتنے دن بعد۔ اس کا دل اس طرح فرید کو بے آواز صدائیں دے رہا تھا۔

اُسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ آج کی بات ہو۔ وہ فرید کے ہمراہ آئی ہو۔ ابھی ابھی فرید اُس کے پاس سے اُٹھ کر اس مجمع میں غائب ہو گیا ہو۔

اس کا دل عجیب سا ہونے لگا۔

کار سے اتری بھی تو۔ بے حس مجسمہ بنی بیٹھی دور سمندر کو تکتی رہی۔ عجیب سی وحشت لئے آنکھوں میں۔

'آؤ تارا اترو نا۔ شہید اُسے اس کیفیت سے جگانا چاہتا تھا۔

"تم۔ تم۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ اس قاتل سمندر کے قریب جس نے فرید کی جان لی تھی۔

شہید بھیا۔ تم جانتے تھے۔ تم جانتے تھے۔ تم نے مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا"۔
سمندر کا پانی اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ڈوبنے لگا۔ لہریں مارنے لگا۔
اور پھر شہید کو بھی اچانک اندازہ ہوگیا ـــــ واقعی غلطی اس نے کی تھی۔ اُسے تارا کو یہاں نہ لانا چاہیئے تھا۔

تارا کی طبیعت بگڑنے لگی۔

شہید گھبرا گیا۔ واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ کر۔ گاڑی وہاں سے نکال لے گیا۔
اور سارے راستے۔ تارا کار کی کھڑکی سے سر ٹیک کر روتی رہی۔ ہچکیوں سے سسکیوں سے۔ اور شہید تسلّی کا ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

شہید۔ تارا سے رخصت ہو کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچا۔ تو بے حد دکھی تھا۔ تارا کی کیفیت پر۔

اس کا دل خود بے حد پریشان تھا۔

تارا فرید کو اب تک نہ بھولی تھی۔

عورت کا یہ روپ۔ اُس کی نظروں میں کتنا عظیم تھا۔ کتنا باوفا تھا۔

عورت محبت کرتی ہے تو۔ محبت کے ساتھ خود بھی مرمٹتی ہے۔

وہ محبت نہ تھی جو عالیہ نے اس کے ساتھ کی تھی۔ وہ تو صرف ایک کھیل کھیلا تھا۔ عالیہ نے۔ جی کے بہلاوے کے لئے۔

محبت تو اس کو کہتے ہیں۔

جیسی تارا نے فرید سے کی تھی۔

وہ مر گیا تھا۔

بظاہر تارا بھی مر گئی تھی۔

خوشیاں۔ سکون۔ پہنیا اوڑھنا۔

گھومنا پھرنا۔ سب اُس نے قربان کر ڈالا تھا۔

جی رہی تھی۔ اُس کی یاد کے سہارے۔

شہید سوچوں کے ایک بھنور میں ڈوب گیا۔
دن بھر کی تھکن کے بعد سونے بستر پہ لیٹا تو۔ نیند دور پرے تھی اسکے لئے۔
وہ تو عجیب سی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔
شہید خود دکھی تھا:
تارا کے دکھ۔ اپنے دل میں سمونا چاہتا تھا۔
کیسی۔ انجان سی راہوں پر وہ آپ ہی آپ آکھڑا ہوا تھا۔
اس کا دل۔ اُس سے کہہ رہا تھا۔
ایک انہونی سی بات۔
اس کے جذبات اور خیالات۔ پھر اُس طرح بہک رہے تھے۔ جیسے نوعمری
میں : عالیہ کے لئے بہکے تھے۔
شہید۔ خود پر جھنجھلانے لگا۔
تارا ایک نیا احساس ایک نیا روپ لے کر ذہن کے پردوں پر جاگ رہی تھی۔
وہ تارا کی کسی بات پر۔ متاثر ہوا تھا۔
اس کی صورت سے؟ دل میں سوال ابھرا۔
نہیں۔
تارا کے حسن کا چاند ڈوب چکا تھا۔
وہ ڈھلتی ہوئی عمر کی دو جوان ہوتے بچوں کی ماں تھی۔
حوادث کی آندھی نے۔ جلد اس سے اس کا رنگ روپ لوٹ لیا تھا۔
تارا اب ایک ایسی شکستہ عمارت کی مانند تھی۔

جس کی بنیادیں۔ بتاتی تھیں۔ کبھی یہ عمارت۔ ایک شاہکار ہو گی۔

بجھتی آنکھوں کی قندیلیں۔ سحر کھوتی جا رہی تھیں۔

بالوں میں۔ چاندی کا رنگ اترنے لگا تھا۔

کیا رہا تھا۔ تارا میں۔

رنگ روپ اُس کا اجڑ چکا تھا۔

وہ دکھوں کی دنیا کی باسی تھی۔

اور شہید کو لوٹ لیا تھا۔ اس کے اس دکھوں نے۔

شہید جانتا تھا۔ دکھ۔ کتنا برا احساس ہوتا ہے۔

جو انسانوں سے۔ جینے کی تمنا چھین لیتا ہے۔

کبھی۔ شہید نے سوچا تھا۔ دکھوں کی یاس میں ڈوب کر۔ اگر زندگی میں۔ میں کسی سے متاثر ہوا بھی۔ تو وہ ایسی لڑکی ہو گی۔ جسے زمانے نے بہت دکھ دیئے ہوں۔ بے حد دکھی۔ بے سہارا۔

چاہے۔ وہ جیسی بھی کیوں نہ ہو۔

بدصورت۔ بدنام۔

میں اُسے اپنا لوں گا۔

لیکن ایسی کوئی لڑکی اس کی راہ میں نہ آئی۔

وہ ٹکرایا بھی تو۔ صرف تارا سے۔

تارا۔ وہی روپ لئے تھی۔ جو اس کے ذہن میں تھا۔

وہ ایک نئے انداز سے تارا سے متاثر ہو گیا۔

کتنے دن جھنجلایا۔ خود سے لڑا۔ آخر تھک گیا۔

اس کا جیون بے حد کٹھن گذرا تھا۔

اس کا ہر سپنا اُسے رلا کر گیا تھا

لیکن اب۔ جاگتی آنکھیں یہ کیسا سپنا دیکھنے لگی تھیں۔

شہید کو محسوس ہوتا۔

اس کی تعبیر۔ بے حد خوفناک ہو گی۔

تارا کب مانے گی۔ وہ ہرگز نہیں مانے گی۔

وہ بالکل صحیح سوچتا۔

لیکن ایسا کرنے میں کیا ہے۔

قانون۔ مذہب۔ سب اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔

تو پھر۔ تو پھر۔ میں تارا کو منا لوں گا۔

لیکن کس طرح۔؟

دل یہ بھی تو پوچھتا۔ اور دل کے اس سوال کا جواب دینا شہید کو نہ آتا۔

تارا سے اس موضوع پر بات کرتے وہ سچ مچ ڈرتا تھا۔

"لیکن دوسرے پل اس کا دل پھر تارا میں الجھ جاتا۔ میں اسے نکالوں گا۔

اس گرداب سے۔ اس کے نوید کو ڈھونڈ لاؤں گا۔

یہ سب میں بڑا غم تارا کا دور کروں گا۔ پھر ان بچوں کو بے سہارا کبھی نہ چھوڑوں گا۔

تارا کو راضی ہونا پڑے گا۔ بچوں کی خاطر۔ میری خاطر۔

وہ باشعور عقل مند انسان۔ اس وقت جذبات کے ہاتھوں مجبور رہتا۔
بالکل ناسمجھ بن جاتا۔

وہ سوچتا۔ اس نے کبھی تارا کو دکھ دیئے تھے۔ اس وقت اس دور میں
جب وہ چاند سی بھابی بن کر اس کے آنگن میں اتری تھی
اس زمانے میں۔ وہ کس قدر سر پھرا تھا۔ کہ تارا کا ہنسنا اسے ناگوار لگتا اور
اب۔ اب تو۔ تارا ہنسنا کیا۔ مسکرانا تک بھول گئی تھی۔

شہید محسوس کرتا۔ اس کی ہنسی کو اس کی نظر لگ گئی ہے۔

وہ اب اس قصور کی تلافی چاہتا تھا۔

تارا کی بے رنگ پھیکی زندگی میں۔ دھنک کے سانولی رنگ بھرنا چاہتا
تھا۔ لیکن اسے پتہ تھا نا۔

یہ صرف اس کی احمقانہ سوچ ہے۔

لیکن وہ بھی اب اکیلا چلتے چلتے تھک گیا تھا۔

ان دیکھے آبلے اسے اپنے پیروں میں محسوس ہوا کرتے۔ اس کے دل کو
گھر کو۔ اب ایک جیون ساتھی کی ضرورت تھی۔

ہمسفر کی ضرورت تھی۔

اب شہید کی عمر بھی وہ نہ رہی تھی۔ کسی نو عمر۔ نوجوان لڑکی کو بیوی بناتا۔
وہ تو اب ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا۔

اسے تارا سے پہلے پاک محبت تھی۔ جس میں جذبات اور احساسات کو
کوئی دخل نہ تھا۔

لیکن اب ۔ نہ جانے اس کا دل دوسری روش کیوں اختیار کرتا جا رہا تھا۔
کبھی چھپے چھپے لفظوں میں ۔ وہ تارا کے احساسات بھی بھڑکا دینا چاہتا۔
ایک بار اس نے تارا سے کہا تھا۔ تارا لوگ تنہائیوں سے گھبرا نہیں جاتے
کیا ۔ ؟

جیسے میں ۔

تم بھی ضرور اکتا گئی ہو گی ۔

اور تارا ۔ چونک پڑی ۔

گھبرا کر بولی ۔ میں کب تنہا ہوں ۔ میرے پاس میری بچی ہے ۔ نوید بھی کبھی نہ
کبھی آجائے گا ۔ اماں ہیں ۔

پھر تنہائی کا سوال کس طرح پیدا ہوا ۔

اس نے شہید کو لاجواب سا کر دیا ۔

شہید تو اس سے دل کی تنہائیوں کی بات کرنا چاہتا تھا ۔

پھر کتنی بار ۔ اس نے تارا پر اپنی والہانگی کا اظہار کیا ۔

جب بھی اُسے دوسروں کے کپڑے سیتے دیکھتا ۔ ٹوک دیتا ۔

مجھے تکلیف ہوتی ہے تارا ۔ اور تارا کے چہرے پر بیزاری پھیل جاتی ۔

وہ اس کے آگے سے کپڑے سمیٹ لیتا ۔

اف ۔ اس طرح میرے ہاتھ تو مت کاٹیں ۔ شہید بھیا ۔ وہ بے بس ہو جاتی ۔

میں جو ہوں ۔ تارا ۔

مجھ پر بھروسہ نہیں کیا ۔

وہ ہمیشہ اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کرتا۔ تارا نے کبھی اس سے نقد روپے نہ لیئے۔

وہ اگر دیتا بھی تو۔ تارا کی آنکھوں میں آنسو چمک چمک آتے۔

واپس دے دیتی۔ مجھ پر اتنا بار نہ ڈالیں۔ اتنا شرمندہ نہ کریں۔

اور پھر۔ وہ گھر کا سامان خرید کر لانے لگا۔

لیکن یہ بھی تارا کو برا لگتا تھا۔

لیکن اُسے بولنے کا موقع نہ دیتا۔

وہ تارا کو بیچ بیچ اپنے حصار میں جکڑنا چاہتا تھا۔

مہربانیوں سے عنایتوں سے۔

لیکن۔

اب وہ سب باتیں۔ شہید کو فضول سی لگ رہی تھیں۔ اُسے احساس ہو گیا تھا۔ تارا کو اپنی طرف راغب کرنا آسان نہ تھا۔ یہ تو بڑا کٹھن کام تھا۔

عید قریب تھی۔

اس بار شہید۔ چاندنی کے لئے۔ بے حد خوبصورت جوڑا خرید لایا تھا۔
زندگی میں پہلی بار عید پر چاندنی کے اچھے کپڑے بنے تھے۔

ورنہ اس کے ہوش میں کتنی عیدیں آئی تھیں اور گذر گئی تھیں:
عید کا دن تو ان کے یہاں کچھ اور سوگواری لے کر آتا تھا۔ تارا بے حد اداس ہو جاتی تھی۔ فرید کے بعد اس نے کب عید منائی تھی۔

اس کی عیدیں پہلے اس قدر خوشی لے کر آتی تھیں۔
جب اس وقت۔ وہ ایک الہڑ سی لڑکی تھی۔ اماں اس کے گوٹے کناری والے کپڑے بناتی تھیں۔ وہ ہاتھ بھر بھر چوڑیاں پہنتی تھی۔

لال نیلی پیلی ہری۔ کانچ کی۔ کھن کھن چھن چھن کرتی چوڑیاں۔
پھر رات عید کا چاند دیکھ کر وہ ہاتھوں میں مہندی رچاتی تھی۔
دوسرے دن۔ سرخ سرخ ہاتھوں بھری چوڑیاں۔ جھل مل کرتے کپڑے پہن کر۔ وہ سکھیوں کے ساتھ مگن رہتی۔

اماں گھر میں عمدہ عمدہ کھانے پکاتی تھیں۔
عیدی ملتی تھی۔ پھر عید کا دن یوں پر لگا کر اتنی جلدی سے اڑ جاتا۔

لیکن نارا کی عید بھی تو تین دن کی ہوتی تھی ۔

عید ۔ باسی ۔ پھر ٹرد ۔

اس کے بعد جا کر عید رخصت ہوتی ۔

شادی کے بعد ۔ اُس کی تین عیدیں فرید کے ساتھ گزریں ۔ بے حد ہنسی خوشی ۔ فرید عید کی رات کو اس کے لئے چوڑیاں ضرور خرید کر لاتا ۔

لال ۔ ہری ۔ چوڑیاں ۔

فرید گیا ۔ تو پھر نہ عید آئی نہ بقر عید ۔ اس کی زندگی میں خاک اڑنے لگی ۔

جب سے وہ فکر معاش میں مبتلا ہوئی تھی ۔

حالات نے اس کو اجازت نہ دی تھی ۔ کہ وہ بچوں کو اچھا پہنا سکے ۔

وہ چاندنی کے کپڑے ضرور بناتی تھی ۔

لیکن چاندنی کو وہ کپڑے پسند نہ آتے تھے ۔

اس کی سکھیوں کے کپڑے اس کے مقابلے میں اچھے ہوتے ۔

چاندنی کی ساری سہیلیاں متمول گھرانوں کی تھیں ۔

اور چاندنی کے گھر میں غریب بلا کری تھی ۔

چاندنی چھوٹی تھی ۔ جب رویا بھی کرتی تھی ۔ منہ بھی بسورا کرتی تھی ۔

لیکن شعور آنے پر ۔ وہ گھر کی حالت سمجھ گئی ۔ صبر کر لیا اس نے اپنی ہر خواہش پر ماں کو کبھی تنگ نہ کیا ۔

لیکن اللہ میاں صبر کا پھل اچھا دیتا ہے نا ۔

اور یہ صبر کا پھل بن کر ۔ شہید چچا ۔ چاندنی کی زندگی میں خوشیاں لے کر آئے ۔

چاندنی کو سب کچھ مل گیا۔

محبت۔ چاہت۔

اور پھر شہید اس کے لئے ہر ماہ کچھ نہ کچھ خرید لاتا تھا۔

اس بار عید کا جوڑا بھی۔ خرید لایا تھا۔ چاندنی کی فرمائش کے بغیر ہی۔ ایسا جھلمل ایسا خوب صورت تھا۔ کہ چاندنی کو ابھی سے عید کی خوشی ہو رہی تھی۔ لیکن اس خوشی کی برسات میں کبھی دل پہ غموں کے بادل بھی تو چھا جاتے تھے۔

نوید۔ یاد آجاتا۔

نوید بھیا۔ اس کا اکلوتا پیارا سا بھائی۔ نہ جانے کہاں ہوگا وہ۔

خط اس کے آتے تھے۔ لیکن کیا مصلحت تھی اس میں۔ کہ وہ پتہ نہ لکھتا تھا۔ اور چاندنی کا دل بھی تو اس سے باتیں کرنے۔

اُسے بہت کچھ سنانے کا کرتا تھا۔

جب سے شہید نے تارا کے گھر آنا شروع کیا تھا۔ محلے کی عورتوں میں ایک بے چینی سی پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے پہل جب شہید کی موٹر تارا کے گھر کے دروازے پر آکر ٹھہرتی تو۔ پڑوس کی چچی کے کان اور آنکھیں دونوں ہی تارا کے گھر کی طرف لگ جاتے۔ آخر یہ ہے کون ان کا ہمدرد۔ ؟ جو روز ہی سرِ شام چلا آتا ہے۔ پہلے تو کبھی نہ دیکھا تھا اُسے۔ طرح طرح کے وہم اور خیالات ان کو آپ ستانے لگتے۔ آخر اُن سے صبر نہ ہو سکا۔ ایک روز اماں کی خیر خبر لینے کے بہانے تارا کے یہاں چلی آئیں۔ ورنہ صحیح معنوں میں اتنے قریب رہتے ہوئے بھی وہ مہینوں تارا کے گھر آکر نہ جھانکتی تھیں۔ تارا کے لبوں پر کبھی شکایت آبھی جاتی تو ان کے پاس کاموں اور مصروفیات کی ایک لمبی فہرست نکل آتی۔ اکثر تارا ہی ان کے پاس ہو آتی تھی۔ اب وہ اس کے گھر آئیں۔ تو تارا نے بے حد خوشی سے اُن کا استقبال کیا۔ وہ اماں کے پاس ہی جا بیٹھیں۔ باتوں ہی باتوں میں چچی نے اپنی الجھن دور کرنے کے لئے اماں سے پوچھ ہی ڈالا۔

کون آتا ہے روز تمہارے یہاں نیلی موٹر میں؟

وہ اماں سے مخاطب تھیں۔ لیکن تارا بھی وہاں موجود تھی۔ چچی کا انداز کچھ ایسا تھا کہ تارا چونک سی پڑی

شہید آتا ہے۔ ڈاکٹر ہے نا وہ۔ میرا زبردستی علاج کرتا ہے۔ اس کا علاج سے تو اب میری کچھ ہمت بندھی ہے۔ اماں شہید کی تعریفیں کرنے لگیں۔ کیا کوئی رشتہ دار ہے تمہارا! ان کو نہ جانے اس سے اتنی دلچسپی کیوں تھی جو اتنی معلومات حاصل کر رہی تھیں۔ تارا کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگ رہا تھا۔ لیکن بظاہر وہ چپ تھی۔ بڑوں کی باتوں میں اُسے دخل دینا اچھا نہ لگ رہا تھا۔

"تارا کا دیور ہے۔ برسوں بعد امریکہ سے آیا ہے بہت بڑا ڈاکٹر بن کر۔ یہاں اکیلا ہے نا اسی وجہ سے روز اسی طرف آجاتا ہے۔ اماں نے ساری تفصیل بتا ڈالی۔

لیکن ان کا انٹرویو بھی مکمل نہ ہوا تھا۔ کیا بیوی بچے نہیں اس کے۔ ان کو جستجو ہوئی۔

"اس نے شادی ہی نہیں کی۔ اماں نے مختصر سا جواب دیا۔ کیوں۔؟ یہ چچی نے پھر بے چینی سے سوال کیا۔ ہو گی کوئی بات۔ کبھی اس قسم کا ذکر نہیں چھیڑا میں نے اس سے اماں بولیں۔

چلو یہاں آکر ہی اس کا جی بہل جاتا ہو گا۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے تارا کو گھورا۔ کیا کچھ نہ تھا ان کی آنکھوں میں۔ تارا نا سمجھ نہ تھی۔ ان کی آنکھوں کو پڑھ کر سہم گئی۔ رنگ فق ہو گیا۔ اُسے احساس ہونے لگا شہید کا روز اسی طرح آنا جانا اب محلے والوں کی نظروں میں کوئی اور رنگ اختیار کرنے لگا ہے۔

اُسے خود کب شہید کا آنا پسند تھا۔ لیکن وہ شہید کو منع بھی کس طرح کر سکتی تھی وہ کسی لالچ کے تحت تھوڑی آتا ہے۔ وہ تو ان کے دکھ بٹانے آتا تھا۔ جب سے وہ آیا تھا۔ تارا کے دل کو اماں کی طرف سے کتنی تسلی ہو گئی تھی۔ اماں پھر سے صحت کی طرف لوٹ رہی تھیں۔

بچی نے حالانکہ منہ سے کچھ نہ کہا تھا۔ لیکن آنکھیں جو کچھ کہہ گئی تھیں اُس کے خوف سے تارا رات بے چینی کی نیند سوئی۔

پھر نہ جانے دن پر دن وہ اتنی حساس کیوں ہوتی چلی جارہی تھی۔ معمولی معمولی بات کو دل پر نقش کر لیتی تھی —— اُس دن وہ کچھ اور زیادہ کوفت میں مبتلا ہوئی۔ جب فاروق کی ماں بھی صرف شہید کا معلوم کرنے آئیں۔ دو تین گھر چھوڑ کر شہاب کا گھر تھا۔ اُس کی بیوی نے بھی براہِ راست تارا سے یہ ذرا سے شوخ لہجے میں سوال کیا۔ آخر ٹھاٹ باٹھ سے روز موٹر میں کون تمہارے گھر آتا ہے تارا؟

اگر فرید زندہ ہوتا تو شہید کے ساتھ اُس کا رشتہ کتنا مقدس سا تھا۔ لیکن اب فرید نہ تھا لیکن اُس کے رشتے اب بھی تارا کو مقدس محسوس ہوتے لیکن دنیا والوں کا بار بار شہید کا تذکرہ کرنا اس کے دل کو ہلانے لگتا تھا —— تارا تنگ سی آگئی تھی۔ جو بھی آتا تھا شہید کا ضرور پوچھتا تھا —— اُسے نہ جانے سب اتنی مشکوک نگاہوں سے کیوں دیکھنے لگی تھیں —— تارا کوئی گناہ کیئے بغیر ہی گناہگار بن گئی تھی —— اور فاروق کی ماں نے تو غضب ہی کر ڈالا۔

وہ بے حد جاہل اور بدزبان عورت تھی۔ رمضان تھے۔ تارا کا پورا مہینہ مشین چلاتے گذرا تھا —— اور اب تو عید قریب تھی۔

صبح صبح فاروق کی اماں اپنے چند ادھ سلے کپڑے سمیٹ تارا کے پاس آئی۔ وہ تارا سے ہمیشہ ایک آدھ کام یوں ہی کروا لیا کرتی تھی۔ کبھی اپنی شلوار کے پائنچے بنوا لیے۔ کبھی بچوں کے کپڑے سلوا لیے —— کبھی دوپٹہ پر فیتا لگوا لیا۔ مروّت میں تارا کبھی انکار نہ کرتی تھی —— اس وقت وہ بچوں کے کپڑے لے کر آئی تھی —— تارا میری اچھی بہن یہ فاروق کا کرتا پورا کر دو —— اگر کل چاند

ہو گیا تو پرسوں عید پر وہ پہن لے گا۔ تارا نے کُرتا اُس سے لے لیا۔

• فاروق کی اماں — وہیں بیٹھ گئیں — تارا کی مشین بند پڑی تھی۔ ورنہ پہلے اکثر ایسا ہوتا جب بھی وہ آتیں تارا مشین چلانے میں مصروف ہوتی تھی۔ لیکن آج کل تو وہ ہمیشہ فارغ نظر آتی تھی — پھر فاروق کی ماں کی جہاندیدہ نظروں نے تارا میں کافی تبدیلی بھی محسوس کرلی پہلے وہ خود سے لاپرواہ سی رہتی، کپڑے بھی دنوں تک نہ بدلتی کنگھی چوٹی تک کا ہوش نہ ہوتا تھا اُسے — لیکن اب وہ اچھے کپڑوں میں نظر آتی تھی — صحت بھی اس کی پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی —" فاروق کی ماں کو دل کی بات دل میں رکھنی آتی نہ تھی۔

کیا تم نے باہر کا کام کرنا چھوڑ دیا تارا — ؟ — انہوں نے پوچھ ہی ڈالا —

نہیں تو تارا نے کہا — لیکن اب میں باہر سے سلائی کا کام کم ہی لیتی ہوں —

کیوں ؟ — کیا تمہارے شہید بھائی نے منع کر دیا کیا ؟ — فاروق کی ماں کا لہجہ عجیب سا تھا —

نہیں تو — تارا نے ناگواری سے جواب دیا — میں اپنی مرضی کی مالک ہوں کسی کو اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں —

بڑا خیر خواہ ہے وہ تو تمہارا — پھر اتنا بڑا ڈاکٹر ہے — خوب کماتا ہوگا — تمہارے گھر کا خرچہ آسانی سے چلا سکتا ہے — پھر بیکار تم کیوں محنت کرتی ہو — انہوں نے ایک طرح سے تارا سے ہمدردی جتائی —

"میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ تارا کا لہجہ بگڑا بگڑا تھا —

پھر اور کون بیٹھا ہے اُس کا — بال سفید ہو گئے گھر نہیں بسایا اُس نے — تارا تم کیوں نہیں کرواتیں اُس کی شادی — تارا جتنا شہید کے ذکر سے گھبرا رہی تھی۔ فاروق کی ماں اُس کے

ذکر کو اور طول دے رہی تھی۔

میں نے اس موضوع پر کبھی اُن سے بات نہیں کی۔ تارا نے بات ختم کرنے کی کوشش کی لیکن فاروق کی ماں کو جیسے مزا آ رہا تھا۔ تارا کو دق کرنے میں ــــ پتہ نہیں انسان اکیلے کیسے رہ لیتے ہیں ــــ ایمان سے تارا میرا خیال تو یہ تھا ــــ کہ تم نے بھی دوسرا نکاح کر لینا تھا بڑی نادانی کر رہی ہو تم ــــ اب بھی وقت ہے ــــ نہ جانے اُن کی زبان کچھ اور زہر اُگلتی کہ تارا سے برداشت نہ ہو سکا ــــ فاروق کی ماں کیسی کیچڑ اُچھال رہی تھی اُس پر ــــ شہید کی شادی کا تذکرہ کر کے اُس کو بھی نکاح کا مشورہ دے رہی تھی ــ آخر آپ کو کیا حق پہنچتا ہے میرے بارے میں اس طرح کہنے کا ــــ

یہ کہہ کر میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا ــــ تمہاری بھلائی کو کہہ رہی تھی۔ ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ خاوند کے بعد اُس کے بھائی سے نکاح کر لیا۔ پھر یہ جائز بھی تو ہے۔ وہ بے حیائی پہ اُتر آئی صاف صاف حملے کرنے لگی اُس کی ذات پر ــــ

اُف ــ تارا چیخ پڑی ــــ یہ دنیا والے کتنے تنگ نظر ہوتے ہیں ــــ کتنے چھوٹے دل کے مالک ہوتے ہیں ــ شہید کی ہمدردی کو کتنا غلط رنگ دے رہے تھے ــ آپ کتنے بُرے خیالات کی ہیں ــ آپ رشتوں کے تقدس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ وہ بلند آواز میں بولی ــ دلی جذبات سے اُس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا ــ آنکھیں بُری طرح آنسو بہا رہی تھیں ــــ

فاروق کی اماں اپنی توہین پر تلملا ہی گئیں اور غصہ بھی ضبط نہ کر سکیں ـ غصے میں بھرے کپڑے سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن جاتے جاتے اس پر ایک وار اور کر تی گئی ــ کس کس کی زبان کو بند کرو گی تارا ــــ میں کیا سارا محلہ یہی کہتا ہے ــــ وہ اُس کے

کے دل میں آگ لگا کر خود تو چلی گئیں — اور تارا ان بھڑکتے شعلوں کو آنسوؤں کے سیلاب سے بجھانے کی کوشش ناکام کرنے لگی — روتے روتے اُس کی حالت غیر ہوگئی آج اُسے اس بات کا بھرپور احساس ہو چکا تھا — کہ شہید کا روز آنا — اُس کے لیے بدنامی کا باعث بن چکا ہے — اُس کا بے داغ کردار داغ دار بنایا جا رہا ہے — دنیا کے سنگدل لوگ اُس پر تہمتیں دھر رہے تھے — اُس نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا — جو دنیا سوچ رہی تھی شہید سوچ رہا تھا — اُسے شہید کی سوچ اور جذبے کی کیا خبر تھی — اگر اُس کو شہید کے دل کا ذرا سا بھید معلوم ہوتا تو وہ اپنے گھر کے دروازے عمر بھر کو شہید کے لیے مقفل کر لیتی — لیکن اُسے شہید کے دل کا حال معلوم نہ تھا — وہ اُن کا مخلص تھا — اپنا سا تھا — کس طرح وہ اسے اپنے گھر آنے کو منع کر سکتی تھی — اُسے یہ صدمہ چپ چاپ سہنا تھا — لیکن اس وقت اُس کا جی اتنا بُرا ہو رہا تھا کہ اوندھے منہ بستر پر جا لیٹی — آنسو بہا بہا کر اُس نے اپنا تکیہ بھگو ڈالا —

چاندنی کے اسکول کی چھٹی تھی — وہ گھر پر ہی تھی — اس بار اُسے آنے والی عید کی بے حد خوشی تھی — لیکن اب امّی کی یہ کیفیت اپنے معصوم دل میں محسوس کر کے وہ بھی مغموم ہو گئی — اکثر قریب آنے والی خوشی کے موقع پر بیتے دنوں کی یاد میں گم کر تارا سب سے فراموش ہو جاتی — خوشی کی حس کب دل میں اُجاگر ہوتی تھی — غم کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کچھ اور دل اور دماغ میں گھور گھور اندھیرے پھیلا دیتے — لیکن آج — آج — تو تارا ایک دوسری قیامت سے ہمکنار تھی — بدنامی رسوائی کا خوف جو لاحق تھا اُسے — روتے روتے اُس کی آنکھیں متورم ہو گئی تھیں — رنگت دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گئی تھی — شام شہید آیا تب بھی وہ کمرے سے باہر نہ نکلی — اندھیرے اندھیرے کمرے میں پلنگ پر لیٹی رہی —

شہید فوراً اُس کے قریب چلا آیا بتی جلا کر اُس پر نظر ڈالی تو اُس نے پھر اپنا چہرہ چھپا لیا —— صورت سے اچانک وہ بیمار لگنے لگی تھی —— کیا ہوا تمہیں —— ؟ شہید فکر مند ہو گیا ——

کچھ بھی تو نہیں —— بس روزوں کی نقاہت ہے —— اُس نے جھوٹ بولا ——

ویسے بھی اب افطار کا وقت ہو رہا تھا اس وجہ سے اُسے بستر سے اُٹھنا ہی تھا —— شہید نے برسوں بعد اس سال روزے رکھے تھے —— افطار وہ یہاں سب میں مل کر ہی کیا کرتا تھا فرمائش کر کر کے تارا سے خوب چٹ پٹی چیزیں بنوایا کرتا تھا —— لیکن آج تو تارا اپنے ہوشوں میں نہ تھی —— اُس نے کچھ پکایا بھی نہ تھا —— اماں اور چاندنی نے مل کر کھانا تیار کر لیا تھا۔ شہید کبھی خالی ہاتھ تھوڑی آتا تھا —— روز ہی دستر خوان وسیع ہو جایا کرتا تھا —— لیکن آج تو تارا کا ایک نوالہ بھی کھانے کو دل نہ کر رہا تھا ——

آخر تم کو اتنی زبردست ڈائٹنگ کا شوق کیوں ہو گیا ہے۔ شہید بار بار اُسے ٹوک رہا تھا —— سیدھی طرح کھاؤ —— بے تکلفی سے شہید نے بڑا سا نوالہ بنا کر اُس کے منہ میں دینا چاہا —— اور تارا کانپ گئی —— اُسے محسوس ہوا —— اس وقت بھی کتنی ان دیکھی آنکھیں اُسے دیوار سے جھانکنے لگی ہوں —— چاہتے ہوئے بھی وہ اس رات اپنا موڈ ٹھیک نہ کر سکی —— مضمحل مضمحل سی اداس اداس اپنی سوچوں میں گم رہی ——

دوسری شام چاند نکل آیا —— کل عید تھی —— نہ جانے کتنے دلوں کے لیے عید کا چاند خوشیوں کے اتھاہ خزانے لے کر آیا تھا —— لیکن تارا کے دل پہ تو محرم سا چھایا ہوا تھا —— نہ جانے اس کے دل پہ کیا بیت رہی تھی —— نوید کے بغیر پہلی پہلی عید کیا خوشی لا سکتی تھی آنسو چھپانے کے لیے اُس نے اپنی خوبصورت آنکھیں کتنی بار موندیں —— لیکن یہ آنسو چھپائے نہ چھپے —— چاندنی بھی بے حد مغموم لگی —— ایسے موقعوں پر ماضی کے جھروکے

آپ ہی آپ وا ہو جاتے ہیں کون کون یاد آنے لگتا ہے ـــــ تارا بھی ایسے جھروکوں میں جا بھٹکی تھی ـــ کون کون نہ اُبھر اتھا ـ ذہن کی سطح پر ـــــــ

فرید ـــ آپا! ـــ نوید ـــــ اُس کا چہرہ غم کی کتاب بن گیا ـــ ایسی کھُلی کتاب جس کو ہر کوئی پڑھ سکتا تھا ــــ

لیکن ـــ شہید تو آج خوش تھا ـ بظاہر کہہ رہا تھا کہ وہ خوش ہے ـ تارا عید کی رات کو خریداری کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے ـ اور اپنی تو اس ملک میں برسوں بعد عید آئی ہے اور ہم اس عید کو روایتی طور پر شایانِ شان منانا چاہتے ہیں ـ اُس نے مگن سے لہجے میں کہا ـــ لیکن تارا تو بے حس مورت کے مانند بیٹھی ہوئی تھی ـــ چلو جلدی سے بازار چلنے کو تیار ہو جاؤ ـ شہید نے اُس کا کاندھا ہلاتے ہُوئے کہا ـــــ

نہیں میں نہیں جاؤں گی اُس نے زبان کے ساتھ ساتھ گردن کو ہلا کر بھی انکار کیا ـــــ لیکن شہید پر اس کے انکار کا بالکل اثر نہ ہُوا ـــ وہ اس بات کا عادی تھا ـ پہلے پہل تارا ہر بات میں انکار جو کرتی تھی ـــــــ

"تمہاری ہر بات میں نہیں مجھے بہت بُری لگتی ہے ـــ اُس نے منہ بسور کر کہا ـ دل ٹوٹ جاتا ہے میرا ـــــ

"شہید بھیا پلیز اُس نے عجیب سے لہجے میں التجا کی ـ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں ـــ مت رحم کھائیں مجھ پر ـــــ

شہید اُس کے اس انداز پر گم سم سا ہو گیا ـ لیکن فوراً اپنی ہار بھی مان گیا ـ بہت بور کرتی ہو تم ـــ میں اپنی چاندنی بیٹی کو ہی لے جاتا ہوں ـــ چاندنی خوشی خوشی کپڑے بدلنے بھاگ گئی ـــ وہ تارا سے الجھ گیا ـ کل عید ہے نا ـ بڑا اہتمام کرنا

پڑے گا تارا تمہیں ___ میں جو ہوں، کھانے پینے کا بے حد شوقین ہوں ___ اور پھر تمہارے ہاتھ کے کھانے ___ سبحان اللہ ___ وہ تارا کا سکوت توڑنے کے لیے اُس کی تعریف کرنے لگا ___ لیکن تارا کے چہرے کے بگڑے زاویے تب بھی نہ بدلے ___ بس خالی خالی نظروں سے اُس کو گھورتی رہی ___

تارا میں ساری خرید و فروخت کر کے لاؤں گا کام چوری مت کرنا ___ وہ اپنی پسند کی ڈشز کے نام گنوانے لگا ___ لیکن تارا پھر بھی خاموشی سے سنتی رہی ___ اُس کی اداسی اور خاموشی آج ٹوٹنے کا نام نہ لے رہی تھی ___ وہ بیچ بیچ الجھی ہوئی تھی ___ صرف نوید کی ذات میں ___ اور بچھڑے ساتھی تو ایک انجانی دنیا میں جا بسے تھے۔ جہاں نہ عید آتی ہے اور نہ کوئی اور تہوار ___ لیکن اُس کا نوید تو اسی دنیا میں تھا ___ نہ جانے اُس کے عید کے کپڑے بھی بنے ہوں گے یا نہیں ___ اُسے اُس وقت کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا ___ شہید اتنے قریب بیٹھ کر مسلسل بول رہا تھا ___ لیکن تارا کو اُس کی آواز کہیں دُور پرے سے آتی محسوس ہو رہی تھی ___ چاندنی لباس تبدیل کر کے آگئی ___ شہید اُسے بازار لیتا آیا ___ چاندنی اس سے قبل کب آئی تھی عید کی خرید و فروخت کرنے ___ اُسے یہ دنیا اجنبی اجنبی محسوس ہو رہی تھی ___ کتنی ہلچل کتنی گہما گہمی تھی سڑکوں پر کار کو بھی آگے بڑھنے کا مشکل سے راستہ مل رہا تھا ___ بازار کتنے سجے تھے ___ ہر طرف روشنی بکھری ہوئی تھی ___ دکانیں جگ مگ جگمگ کر رہی تھیں ___ لوگوں کا ایک ہجوم تھا کہ کار سے اتر کر چچا کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اُسے زبردست گھبراہٹ ہو رہی تھی ___ اُس نے شہید کا بڑا سا ہاتھ اپنے ننھے منے سے ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما ہوا تھا ___ اُسے یہ خوف جو لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں وہ اس بھرے بازار میں گم ہی نہ ہو جائے ___ شہید اُسے ایک

بڑے سے اسٹور میں لے آیا -- جہاں ضرورت کی ہر چیز خوبصورتی اور قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ میک اپ کا رنگ برنگا سامان۔ کپڑے جوتے، ہار، چوڑیاں۔ غرض سب کچھ موجود تھا وہاں ——

”شہید آج بہت شاہ خرچی کے موڈ میں تھا — چاندنی جو تمہارا جی چاہے تم خرید لو — اُس نے یہ کہہ کر چاندنی کو حیرت اور خوشی میں مبتلا کر دیا تھا — اس سے قبل اُس نے اپنی مرضی سے کبھی کچھ نہ خریدا تھا — آج آج وہ بہت کچھ خرید سکتی تھی — وہ آگے بڑھ کر شوکیس میں سجی چیزوں کا جائزہ لینے لگی — پھر اُس کے دھیرے دھیرے اُٹھتے قدم —— میک اپ کے سامان کے قریب جا ٹھہرے — میک اپ کی چیزیں فطرت کے مطابق اب چاندنی کی خواہش بن چکی تھیں، حالانکہ نہ ہی اُس کے گلابی گلابی چہرے کو پوڈر کی ضرورت تھی — نہ گالوں کو مصنوعی غازے کی — نہ خوبصورت کالی کالی آنکھوں کو کاجل کی۔ اُسے تو قدرت نے اپنے ہاتھوں سے ہر رنگ بخش کر دُنیا میں بھیجا تھا — بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اُس کا حسن نکھر رہا تھا — لیکن ابھی وہ ناسمجھ تھی — بہت سی باتوں سے ناآشنا — اُسے اپنی خوبصورتی کا علم نہ تھا — اُسے بھی ان مصنوعی چیزوں کا شوق تھا — سرخ سرخ لپ اسٹک سے گلابی ہونٹوں کو گہرا کرنے کو اس کا دل چاہتا تھا —— آج اُس کی یہ خواہش پوری ہونے کے امکانات روشن تھے — شہید اُس کے پیچھے تھا ڈرتے ڈرتے اُس نے چپا سے پھر اجازت طلب کی — شہید اُس کے انتخاب پر مسکرا پڑا — آخر کو وہ لڑکی ہی تھی نا — فطرت کے مطابق یہ سب کچھ تو اس نے پسند کرنا تھا — شہید نے اُسے سب کچھ خریدنے کی اجازت دے دی —— اُس نے لپ اسٹک پوڈر — مسکارا — نہ جانے کیا کیا خرید ڈالا — کپڑے تو اُس کے پہلے ہی بن چکے تھے — جوتا اُس کے پاس نیا نہ تھا۔ شہید نے

اُسے جوتے بھی دلوا دیئے ــ تم نے اپنے لیے اتنا سب کچھ خرید لیا ــ اب اپنی امّی کے لیئے بھی کچھ خرید دو نا ـــ شہید کی تمنا تھی کہ وہ تارا کے لیے بھی کچھ ضرور خریدے ـ اب چاندنی کی آڑ لے کر وہ اپنا یہ ارمان پورا کرنا چاہتا تھا ـــ امّی نے تو نئے کپڑے بھی نہیں بنائے ــ چاندنی نے مغموم سے لہجے میں کہا ـ تو پھر کیا ہوا ـ ہم اُن کے لیے تیار شدہ کپڑے خرید لیتے ہیں ـ شہید چاندنی کو ساڑھیوں کے کاؤنٹر پر لے آیا ـ ایک سے ایک بیش قیمت جھل مل کرتی ساڑھیاں موجود تھیں ـ اور شہید نے نہ جانے کس سوچ کو ذہن میں بسا کر کس جذبے سے مرعوب ہو کر تارا کے لیے گلابی رنگ کی کامدار ساڑھی خرید لی ـ چاندنی بھی بے حد خوش ہوئی ـ امّی اس ساڑھی میں کتنی پیاری لگیں گی نا ـــ اس نے اپنے خیالات کا اظہار شہید پر بھی کر ڈالا ـــ ابھی سے تصور میں اُس نے تارا کو یہ ساڑھی پہنے دیکھ لیا ـــ کل آنے والی عید سچ مچ چاندنی کے لیے بے حد خوشیاں لے کر آ رہی تھی ـــ چاندنی نے چوڑیاں بھی خرید لیں ـ سنہری سنہری ـــ شہید نے تارا کے لیے بھی کانچ کی چوڑیاں خرید لیں ـ آتے وقت چاندنی نے مہندی کا پیکٹ بھی خرید لیا ـــ اور شہید نے بہت سی مٹھائیاں فروٹ اور نہ جانے کیا الم غلم سی چیزیں خریدیں ـــ دونوں لدے پھندے جب گھر میں داخل ہوئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے ـــــ

تارا تو اب پریشان ہونے لگی تھی ـــ اس پریشانی کے عالم میں وہ سچ مچ دہلیز پر اکھڑی ہوئی تھی ـــ شہید کی موٹر کی روشنیاں نظر آئیں تب اُس کی جان میں جان آئی ـ

شہید اور چاندنی کیسے خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے تھے ـ شہید نے موٹر سے تمام سامان نکال کر چھوٹے کمرے میں لا کر ڈھیر کر دیا ـــ اور تارا کو شہید کی اس فضول خرچی پر افسوس آ رہا تھا ـــ یہ سب کچھ خرید لائے آپ ـــ ؟ ـ اُس نے اپنی سوئی سوئی آنکھیں

پھیلا کر شہید سے سوال کیا ——

وہ ہنسی خوشی کے آثار چہرے پر سجائے مسکراتا رہا —— اور چاندنی خوش خوش اپنی چیزیں ڈبوں سے نکال کر تارا کے آگے سجانے لگی ——

ارے تو یہ سب کیا خرید لائی چاندنی — نہ جانے آج تارا اتنی بیزار کیوں ہو رہی تھی پھر اُس کے نزدیک چاندنی نے بڑی واہیات چیزیں خرید کر شہید کے روپوں کا خون کیا تھا لپ اسٹک ۔ پوڈر ۔ کاجل ۔ غازہ —— نہ جانے کیا کیا —— تارا کو غصہ آگیا —— ابھی سے تو فیشن کرے گی —— لپ اسٹک لگائے گی —— تیرا منہ نہ توڑ دوں گی میں ——

یہ کہہ کر تارا نے سچ مچ چاندنی کا دل توڑ ڈالا تھا ۔ —— اور بہ چاندنی کا منہ بن گیا ——

شہید بھی تارا کے اس انداز پر تعجب سے اُس کو دیکھنے لگا —— وہ چہرے سے ناخوش لگ رہی تھی —— حد درجے بیزار —— بیزار سی ——

ماں کو خوش کرنے کے لیے —— چاندنی نے جھٹ گلابی ساڑھی کا ڈبہ تارا کے آگے کر دیا —— یہ چچا نے آپ کے لیے بھی تو خریدی ہے —— گلابی جھل مل کرتی ساڑھی ۔ مدھم سے بلب کی روشنی میں بھی جگمگاہٹیں بکھیر رہی تھی —— تارا گم سم سی ہو گئی ——

پھر اُسے فاروق کی ماں کی باتوں کا خیال آگیا —— اُس نے ایک نظر شہید پر ڈالی اُس کا چہرہ کیا کہہ رہا تھا —— کیا بکھرا تھا اُس کے چہرے پر ۔ جیسے خاموش چہرہ بول رہا ہو ۔ اور دوسرے پل چاندنی نے کانچ کی چوڑیوں کا ڈبہ بھی اُس کے آگے کر دیا ——

—— یہ چچا نے آپ کے لیے یہ چوڑیاں

بھی تو خریدی ہیں ۔

میرے لیے —— میرے لیے —— گلابی ساڑھی —— کانچ کی سُرخ سنہری چوڑیاں ۔ کیوں

کیوں — یہ احسان کیا شہید نے مجھ پر مجھے اس کی یہ مہربانیاں پسند نہیں ہیں — وہ پھر ساڑھی اور چوڑیوں کو گھورنے لگی — جب سے فرید گیا تھا اُس نے کانچ کی چوڑیاں ہاتھوں میں نہ ڈالی تھیں — کانچ کی چوڑیاں تو سہاگ کی نشانی ہوتی ہیں اور گلابی رنگ اُسے منحوس لگتا تھا — جب اُس کا سہاگ چھنا تھا تو اُس نے گلابی سوٹ تو پہن رکھا تھا۔ کتنی باتیں اُس کے ذہن میں اُس وقت یکجا ہو گئیں —

وہ دھیرے دھیرے کانپنے لگی — دل میں ایک طوفان اُٹھنے لگا —

شہید کی یہ عنایتیں مجھے بدنام کر دیں گی. رسوا کر دیں گی —

کسی نے دیکھ لیا ان چوڑیوں کو اس جوڑے کو — تو — تو — پھر لوگوں کی زبان بند رکھنے کا میرے پاس کیا جواز ہو گا —

اُسے یہ ساڑھی زیب تن کرنے کا کیا حق تھا — کچھ بھی تو نہیں —

وہ حد درجے جذباتی ہو گئی — "شہید میں بیوہ ہوں — میرا سہاگ اُجڑ چکا ہے عید میرے لیے محرم بن کر آتی ہے — خوشی بن کر نہیں — پھر مجھے کوئی حق نہیں، یہ چمکتا رنگ اور یہ کھنکتی چوڑیاں پہنوں — اور آپ کو بھی کوئی حق نہ تھا میرے لیے یہ سب کچھ لانے کا — وہ روتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی — کیوں کرتے ہیں میرے ساتھ یہ ہمدردیاں — مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں — اُس نے ڈبے میں رکھی ساڑھی..... جنون کی کیفیت میں شہید کے قدموں میں بکھرا دی — چوڑیوں کا ڈبہ سامنے دیوار پر دے مارا — چوڑیاں ٹوٹ گئیں — اور شہید کا چہرہ ویران ہو گیا — وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر باہر نکل گیا — اور حیران و پریشان چاندنی — آنکھوں میں آنسو بھرے — سب کچھ دیکھتی رہی — تارا نے اس کی ساری خوشی کرکری

کرڈالی تھی اس وقت اُسے سراسر امّی قصوروار اور چچا مظلوم لگ رہے تھے —— وہ خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹ کر اپنی چارپائی پہ جا لیٹی — شوق سے خریدی ہوئی مہندی کا ڈبہ یوں ہی بند پڑا رہا ——

"عید آئی — اور صبح سے دوپہر ہو گئی — پھر شام اور شام کے بعد رات ہی آتی ہے رات آئی ہر سُو اندھیرا پھیل گیا — لیکن شہید نہ آیا — دن بھر تارا چاندنی اور اماں شہید کا صبر آزما انتظار کرتی رہیں۔ لیکن وہ رُوٹھ گیا تھا — کس طرح آتا — تارا اب خود پر نادم تھی — چاندنی نے بھی دن بھر ماں کو قصور وار ٹھہرایا تھا — اُس کا پُورا دن چچا کے انتظار میں گزر گیا — وہ نہ ہی سہیلیوں کے گھر گئی — اور نہ ہی اُسے عیدی ملی۔ اس بار اُسے چچا سے عیدی ملنے کی امید تھی — یہ عید بھی قسمت کی طرح خواب گذر گئی — تارا کو یقین تھا شہید ضرور آئے گا — اُس نے اس کی فرمائش کے مطابق بہت سے کھانے پکائے تھے — لیکن دل کب سچا ہوتا ہے — اُس کا دل جھوٹا نکلا — شہید نہیں آیا۔ نہ تارا سے کچھ کھایا گیا نہ اماں اور چاندنی سے — کھانا جوں کا توں پڑا رہا — چاندنی دن بھر ماں سے روٹھی رہی — جس نے اُس کے اتنے پیارے پُرخلوص چچا کے دل کو یوں توڑا تھا — تارا کو بھی اب پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا — لیکن حساس دل تھی فاروق کی ماں کی باتوں کا اثر لے کر دو دن سے اندر اندر کھول رہی تھی — بیکار اُس نے شہید پر یہ غصہ نکال ڈالا — اُس نے بے حد عامیانہ سلوک کیا تھا — شہید کے ساتھ — خوشی سے لائی چیزوں کی کتنی بے قدری کی تھی — چلو وہ اُس کے پہننے کے قابل نہ تھے — لیکن وہ انہیں قبول تو کر سکتی تھی — پھر چاندنی کے لیے رکھ

چھوڑتی — وہ بے حد پشیمان تھی — رات بستر پر لیٹ کر بھی وہ ہمیشہ کی طرح خیالوں میں گم ہو گئی — کتنا بے سکون دل تھا اُس کا — کبھی بھی تو سکون نہ پاتا تھا — اب شہید کی طرف سے دل کی توجہ ہٹی — تو نوید کی یاد ستانے لگی ——

اُس کی عید کیسی گذری ہو گی — ؟ — دل میں سوال اُبھرا — نہ جانے کہاں ہو گا وہ — کس شکنجے میں پھنس گیا میرا معصوم بچہ — کہ ماں سے ملنے بھی نہیں آسکتا — یا خون یوں رنگ بدل جایا کرتے ہیں۔ کیا آج کل کی اولاد ماں باپ کے لیے دل میں لگن نہیں رکھتی۔ اکثر وہ ایسی اداس سوچوں میں رات بتا دیتی —

اب اُسے فرید کی یاد کم آتی — اتنے مصائب میں مبتلا ہو کر اُس نے سچ مچ فرید کو یاد کرنا چھوڑ دیا تھا — اور پھر فرید کے ساتھ گزارے ہوئے تین سال وہ ذہن کے صفحوں پر کتنی بار دہرا چکی تھی۔

اور آج اُسے فرید سے زیادہ شہید کا خیال آیا — شہید جس کا دل اُس نے توڑ دیا تھا — ایسا کیوں کیا تھا میں نے — ؟ کیوں — ؟ — کیوں — ؟ یہ صدا آپ ہی آپ دل میں گونج بن رہی تھی — اُسے شہید کی رہائش گاہ کا علم نہ تھا — ورنہ دل کی ضد کے آگے مجبور ہو کر وہ اس کی دہلیز پر اُسے منانے پہنچ ہی جاتی — یہ جذباتی سی سوچیں فقط ایک رات تک اس پر چھائی رہیں — دوسرے دن وہ مطمئن ہو گئی — شہید نہیں آئے گا — تو اچھا ہی ہے — وہ کہانی جو —— دلوں نے دل میں گھڑی ہوئی ہے، وہ آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی — اس کی اس سوچ نے اُسے ایک سکون سا بخش دیا ——

کتنی ہی شامیں آئیں اور ڈوب گئیں — شہید تو جیسے اُن کے گھر کا راستہ

بھول گیا تھا۔ چاندنی پل پل شہید کو یاد کرتی ۔ اماں شہید کے نام کی رٹ لگائے ہوئے تھیں لیکن تارا نے کبھی اُس کا نام نہ لیا — اماں ذکر کرتیں تو ناگواری سے یہ ہی جواب دیتی۔ کب تک وہ اماں اپنا فرض ادا کرے گا — ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا تھا — وہ اماں کی نظروں میں شہید کو قصور وار ٹھہرانا چاہتی — حالانکہ شہید کے خلاف الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے اُس کے دل کی حالت عجیب سی ہو جاتی —

اور اماں بیچاری چپ ہو کر نہ جانے کون سی سوچ میں الجھ جاتی — دن آگے بڑھتے گئے — شہید کے آنے سے چاندنی کی زندگی میں جو رونق آئی تھی — اب پھر اُس کی جدائی سے ماند پڑ گئی — وہ پھر بجھی بجھی رہنے لگی — سردی کی رُت آ گئی — اور ساتھ اماں کی بیماری بھی بڑھ گئی — اُن کو دن پر دن شدید کھانسی ہوتی گئی، ہر دم بخار رہنے لگا — وہ اب پھر اُٹھنے پھرنے سے محتاج ہو گئیں — اماں کی وجہ سے تارا کی پریشانیوں میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہو گیا تھا — دن رات وہ اُن کی تیمارداری میں لگی رہتی — لیکن اماں کا کمزور سا چہرہ اور گہری گہری سانسیں اُسے اس بات کا احساس دلاتیں — کہ اب اماں اور اُس کا ساتھ بھی عارضی سا ہے — نہیں — وہ دل کو جھٹلاتی اگر اماں بھی ساتھ چھوڑ گئیں — تو پھر میں کس طرح جیوں گی — ؟ — اونہہ تارا — تم اس طرح جیو گی — جس طرح اب جی رہی ہو — ہاں دل پر ایک زخم اور لگ کر اُسے اور سخت کر دے گا —

لیکن — اماں تو میرا آخری ستون ہے — کیا بغیر ستون کے کوئی چھت کھڑی رہ سکتی ہے — وہ رو رو کر حال بُرا کر لیتی — اور ایسے میں اُسے بے اختیار شہید کی ہمدردیاں یاد آتیں

وہ جو تارا تو اس کے دل کو کتنی ڈھارس بندھتی ــــ کاش وہ آجائے ـ کاش ـ وہ آجائے ـ اس کا دل بے اختیار اُسے پکارنے لگتا ـ لیکن شہید کب اُس کے دل کی پکار سن سکتا تھا ـ اور اگر سن لیتا تو ـ پھر بھلا کس طرح نہ آتا ـ وہ تو تمام حالات سے بے خبر تھا ـــ

اور پھر ایک سرد سی رات اماں کی طبیعت بے حد بگڑ گئی ـ سانس حلق میں آکر رُک گیا ــ اماں ہوش میں نہ تھیں ــــ وہ رات تارا نے آنکھوں میں کاٹ دی ــ حالانکہ تارا مستقل اماں کا علاج دوسرے ڈاکٹر سے کروا رہی تھی ـ لیکن اماں کو تو اب شہید کے علاج کی عادت تھی ــ کسی طرح طبیعت سنبھل ہی نہ رہی تھی اُن کی ـــ اماں کی گرتی ہوئی حالت پتہ دے رہی تھی کہ رخصت کی گھڑی آپہنچی ہے ـ رات پڑوس کے چچا سے کہہ کر اُس نے دوسرے ڈاکٹر کو گھر پہ بلا لیا تھا اور ڈاکٹر مایوسی سے سر ہلا کر چلا گیا تھا ــــ اور اُس نے اماں کو اسپتال میں داخل کروانے کا مشورہ دیا تھا ــــ

تارا اکیلی تھی ـ آج اسے اس کڑے وقت اپنی تنہائی اور اکیلے پن کا شدید احساس ہو رہا تھا ــ اُس نے سوچ لیا کہ وہ صبح شہید کو بلا لائے گی ـ پھر وہی اماں کو اسپتال میں داخل بھی کروا دے گا ــــ وہ شہید کی فطرت کو سمجھ چکی تھی اُسے احساس تھا کہ شہید ضرور اُسے معاف کر دے گا ــــ صبح ہوئی تو پڑوس کی چچی کو وہ اماں کے پاس بٹھا کر اُن کے سوالوں کی پروا کیے بغیر اپنی سفید چادر اچھی طرح بدن پر لپیٹ کر شہید کو بلانے چل دی ــــ اُسے اس اسپتال کا پتہ معلوم تھا جہاں شہید کام کیا کرتا تھا وہ شہر کا سب سے بڑا اور مشہور اسپتال تھا ـ رکشہ والے نے اُسے آسانی سے

پتے پر پہنچا دیا ــــ ابھی کافی سویرا تھا ــــ لیکن پھر بھی مریضوں کی ایک لمبی قطار تھی جو جلد باری کی کوشش میں سویرے سویرے اسپتال آ کر بیٹھ جاتے تھے ــــ

ڈاکٹر شہید ابھی نہ آیا تھا ــــ تارا کے پوچھنے پر اُسے یہ ہی بتایا گیا کہ ڈاکٹر شہید نو بجے تک آتے ہیں ــــ نو بجے ــــ تارا کافی بے چین سی تھی ــــ نو بجنے میں تو ابھی کافی دیر تھی ــــ وہ برآمدے میں پڑی پتھر کی بنچ پر بیٹھ کر بے صبری سے شہید کے انتظار کی گھڑیاں گننے لگی ــــ اور آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں، شہید آ گیا تارا نے دیکھا وہ سفید اوورال میں نظریں جھکائے بالکل اُس کے قریب سے گذرا تھا اُس نے تارا کو نہ دیکھا تھا ــــ اگر دیکھتا تو یوں اجنبی بن کر تو ہرگز نہ گذرتا ــــ تارا میں اور صبر کی تاب نہ تھی ــــ اُس کا دھیان تو اماں کی سانسوں میں الجھا ہوا تھا ــــ وہ بے اختیار سی شہید کی طرف لپکی ــــ

"شہید بھیا" ! ــــ اُس نے اپنی لرزتی آواز میں اُسے پکارا ــــ

بے اختیار شہید کے آگے بڑھتے قدم پیچھے پلٹ گئے ــــ اُس نے اپنا رُخ موڑا تو تارا اُس کے بہت قریب کھڑی تھی ــــ بے حد پریشان حالت میں ــــ

شہید بے چین سا ہو گیا ــــ کیا ہوا تارا ــــ ؟ ــــ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے ــــ ؟

کیسے آئیں اس طرف ــــ ؟ ــــ اُس نے دو تین سوال اکٹھے ہی کر ڈالے ــــ

لیکن تارا کی حالت اس وقت بولنے کے قابل نہ تھی ــــ بس وہ تو آنکھوں سے رم جھم آنسو گرا رہی تھی ــــ شہید اُسے اپنے کمرے میں لے گیا ــــ اور باہر بیٹھے مریضوں میں ایک اضطرابی کیفیت دوڑ گئی ــــ یہ اچھا دستور تھا ــــ جو پہلے آئے

وہ انتظار میں ٹھوکھتا رہے — اور جو بعد میں آئے — وہ پہلے چلا جائے — اُن کو بھلا ڈاکٹر اور تارا کے رشتے کی کیا خبر تھی — میلے سے لباس اور اُجڑی اُجڑی صورت والی وہ عورت چہرے اور حلیے سے افلاس زدہ لگ رہی تھی — اور ڈاکٹر سفید برف سے لباس میں کہیں کا نواب لگ رہا تھا — کمرے میں آکر شہید نے پھر تارا سے وہی سوال دہرایا — اتنی پریشان کیوں ہو —؟ تارا کی حالت دیکھ کر شہید کو طرح طرح کے وہم ستانے لگے تھے ——

اور تارا بڑے زور شور سے رونے لگی — کانپنے لگی — اس کی اس کیفیت پر شہید سخت گھبرا گیا — تارا کو شانے سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا — کچھ تو بولو تارا —؟ وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا ——

"آپ مجھ سے ناراض ہیں — شہید بھیّا —؟" روتے ہوئے تارا نے اُس سے سوال کیا ——

اُونہہ کیا تم مجھ سے یہ سوال کرنے آئی تھیں —؟ — شہید کے لبوں پر تلخی اُبھر آئی — "تم کو میری ناراضگی کا خیال آ ہی گیا" — وہ اُسے افسردہ سی نظروں سے دیکھنے لگا —

"میں بہت نادم ہوں — آپ مجھے معاف کر دیں شہید بھیّا" — وہ آنسوؤں میں ڈوبی ڈوبی آنکھوں سے اُس کو دیکھنے لگی ——

اور شہید سب کچھ بھول کر ان آنسو بھری آنکھوں میں ڈوبنے لگا —

تارا نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں — اُس کی آنکھوں سے اب بھی ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے — وہ کس قدر بیقرار نظر آتی تھی — کیا صرف اُس کے لیے — شہید بے اختیار اُس کے بے حد قریب چلا گیا — تارا — اُس نے اُس کے ٹھنڈے ٹھنڈے لرزتے

ہوئے ہاتھ اپنے گرم گرم ہاتھوں میں چھپا لیے — اور اس لمحے تارا ہوش کی دنیا میں آگئی
اُس کے ہاتھ شہید کے ہاتھوں میں بھی لرزنے لگے — چہرہ کچھ اور فق ہو گیا — اُس نے
آہستگی سے اپنے ہاتھ شہید کے ہاتھوں سے علیحدہ کر کے اپنی چادر میں چھپا لیے ——

"میں بہت خود غرض ہوں شہید بھیا — اور میری یہ خود غرضی ہی اس وقت مجھے آپ کے
پاس لائی ہے"۔ وہ اُس کو اماں کی بیماری کے بارے میں بتانے لگی ——

شہید بھی کچھ پریشان سا ہو گیا — "تم مجھے اپنا سمجھتی ہو — تب ہی تو میرے پاس
آئی ہو — اس میں خود غرضی کی کیا بات ہے"۔ اُس نے تارا کو سمجھاتے ہوئے کہا —
"میں آج ہی اماں کو اس اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیتا ہوں — یہاں میں بھی ہوں گا
انشاء اللہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گی ——"

شہید کی باتوں سے تارا کو بے حد ڈھارس محسوس ہوئی — لیکن اس وقت شہید تارا
کے ہمراہ نہ جا سکتا تھا — باہر مریضوں کی ایک بڑی تعداد اُس کی منتظر تھی ——

"تم گھر جاؤ تارا — میں یہاں سے فارغ ہو کر اور اماں کو داخل کرنے کے انتظامات
کر کے دوپہر تک آؤں گا"۔ شہید نے بڑی اپنائیت سے کہا — شہید کے دلاسے
پر تارا کا ڈوبتا دل ٹھہر سا گیا — کتنا مخلص تھا وہ — اُسے پھر ندامت کا احساس ہونے
لگا — لیکن اس وقت اُس نے زبان کا سہارا نہ لیا — شہید کو ممنون نظروں سے دیکھتی ہوئی
باہر نکل گئی — تارا گھر پہنچی تو اماں کی حالت کافی خراب تھی — چاندنی رو رہی تھی ——
پڑوس کے گھروں کی عورتیں جمع تھیں — تارا کو وحشت سی ہونے لگی — اُسے دوپہر
دُور معلوم ہو رہی تھی — جب شہید نے آنا تھا — وہ پل پل گن کر گزارنے لگی ——

دوپہر وعدے کے مطابق شہید آگیا — چاندنی اتنے عرصے بعد اُس سے مل کر بہت

روئی — آنسو تو تارا کی آنکھوں میں بھی تھے — گھر میں جمع شدہ عورتوں کی نظریں شہید پر ہی تھیں — اماں پر نظر ڈال کر شہید گھبرا گیا — اور اُسی وقت اماں کو اپنی کار میں لٹا کر وہ اسپتال لے گیا — ساتھ چاندنی اور تارا بھی تھیں — گھر میں انہوں نے تالا ڈال دیا تھا۔ شہید نے اپنے خرچے پر اماں کے لیے علیحدہ کمرے کا بندوبست کیا تھا — پھر نرس بھی اُس نے اماں کے لیے علیحدہ مقرر کی تھی — بڑی توجہ سے اپنے اور مددگار ڈاکٹروں کے ساتھ اُس نے اماں کا علاج شروع کیا تھا —

" اسپتال میں داخل ہونے کے چند ہی گھنٹوں بعد اماں کی طبیعت سنبھل گئی تھی اور اُن کو ہوش آگیا تھا اور ساتھ ساتھ تارا کے دل کو چین بھی آگیا تھا — اُس کے آدھے دُکھ تو شہید نے بانٹ لیے تھے — اماں بھی شہید کو نظروں کے سامنے پاکر بے حد خوش ہو گئی تھیں — اُن کے نحیف چہرے پہ ایک لہر سی دوڑ گئی — کانپتا ہوا ہاتھ بمشکل شہید کے سر پر پھیرا — وہ بھی بے حد رنجیدہ ہو رہا تھا — اماں کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے کب سے بیٹھا تھا — "بڑا ستایا ہے تم نے شہید ہم سب کو اپنے انتظار میں" حرفِ شکایت اماں نے بڑی کمزوری سے ادا کیا —

وہ کچھ نادم سا ہو گیا — ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شہید اماں کے کمرے میں آبیٹھتا جہاں تارا اور چاندنی کے ساتھ وقت بے حد اچھا گذرتا — تارا تو بہت کم بولتی تھی۔ وہ سامنے موجود ہوتی تھی — یہ ہی شہید کے لیے بہت کچھ تھا — وہ خود ہی تارا کو اب کم مخاطب کیا کرتا

دو تین دن میں اماں کافی بہتر ہو گئی تھیں — شہید کی ہدایت پر ان کا خاص خیال رکھا جا رہا تھا —

" ایک شام شہید اسپتال سے ہی بے حد اصرار کر کے تارا اور چاندنی کو اپنے گھر لیتا

گیا — اسپتال سے ملحقہ بنگلہ اُسے رہائش کے لیے حال ہی میں ملا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اس خوبصورت نفیس سے بنگلے میں موجود تھی —

تارا نے ہر چیز کی تعریف کرکے شہید کا دل بڑھانا چاہا — "اونہہ سب کچھ ہی ہے تارا۔ لیکن اس گھر میں ہنگامہ نہیں — ہل چل نہیں — یہ تو ویرانہ ہے — صرف تنہائیوں کے بسیرے ہیں یہاں —" اُس نے تارا کی تعریف کا جواب ان الفاظوں میں دیتے ہوئے کہا ——

اور تارا خاموش ہوگئی — چاہتے ہوئے یہ نہ کہہ سکی — "تنہائیاں دور کرنا انسانوں کے اپنے بس میں ہے —— ویرانے کو آباد کیوں نہیں کر لیتے ——" لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ صرف اس خوف کی وجہ سے کہ مبادا شہید کوئی ایسی بات نہ کہہ دے کہ وہ برداشت نہ کر پائے —— ان دنوں وہ شہید سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتی تھی ——

لیکن اُسے محسوس ہوتا تھا۔ شہید دن پہ دن بہادر اور بے باک ہوئے جا رہا ہے تارا تمہارے ہاتھ کے پکے کھانے کھائے مدت ہوگئی — آج تم کچھ پکا ڈالو — بیرے ملازم کے ہاتھ کے بدذائقہ کھانوں نے میرا وزن سیروں کے حساب سے گھٹا دیا —۔ تارا نے پہلے بھی محسوس کیا تھا — شہید پہلے کے مقابلے میں کافی دبلا ہوگیا تھا —— وہ خاموشی سے راضی ہوگئی —— کچن اور فریج میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی — جو کچھ نہ تھا — وہ شہید نے ملازم کو لانے بازار بھیج دیا — چاندنی تو چچا کے ریڈیو گرام پر ریکارڈ سننے لگی —— شہید چاندنی کو وہیں چھوڑ کر تارا کے پاس کچن میں ہی چلا آیا — تارا شہید کی موجودگی اور پھر اپنی اور اس کی تنہائی سے گھبرا رہی تھی —

اور شہید اُس کی کیفیت کو بھانپ گیا تھا — بس اُلٹی سیدھی ہانکنے لگا۔ اُس نے اُس سے ایسی کوئی بات نہ کی۔ جس سے تارا کے حوصلے ڈگمگاتے یا دل شکنی ہوتی

رات اُن سب نے شہید کے ڈرائنگ روم میں کھانا کھایا۔ چاندنی کو تو چچا کا گھر بے حد پسند آیا تھا — انجانے اور ناسمجھی میں اُس نے کھلے الفاظوں میں اپنے دل کی اس خواہش کا اظہار کھانا کھاتے وقت تارا اور شہید کے سامنے کر ڈالا تھا۔ کہ اُس کا دل تو بس اب اس جگہ رہنے کو چاہتا ہے۔ اپنے چچا کے پاس۔ اُسے۔ اپنا بوسیدہ سا گھر اندھیرے اندھیرے کمرے اور گندی سی گلی بالکل نہ بھائی تھی —

"دیکھو تارا — تمہاری بیٹی کو ہمارا گھر کتنا اچھا لگا ہے ۔" اُس نے تارا کی طرف دیکھ کر کہا — لیکن تارا اُسے کب دیکھ رہی تھی — وہ تو نظریں نیچی کیے بمشکل حلق سے نوالے اتار رہی تھی — اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا اس وقت اُسے زہر لگ رہا تھا۔

"چاندنی — تمہاری امی کو ہمارا گھر تو بالکل اچھا نہیں لگا ۔" تارا کے چہرے کو پڑھ کر شہید نے چاندنی کو ہی دل کی بات بتا ڈالی ——

"آپ بھی اس کی طرح ناسمجھی کی باتیں کرنے لگے ۔" تارا نے ناگواری سے میز پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ تارا کے اس کٹے کٹے انداز پر شہید کچھ اور نہ کہہ سکا —

وہ تارا کو اماں کے پاس پہنچا آیا — رات باوجود ڈیوٹی نرس کے تارا اماں کے پاس ہی رہا کرتی تھی ——

"ایک ڈیڑھ ہفتے میں اماں صحت یاب ہوگئیں تو شہید کی مرضی سے اور ڈاکٹروں نے بھی ان کو ڈسچارج کر دیا۔ اماں کی بیماری، تارا اور شہید میں پھر صلح کرا گئی تھی شہید اب پھر باقاعدگی سے آنے لگا تھا۔ اماں کے لئے وہ طاقت بخش ٹانک دوائیں۔ پھل نہ جانے کیا کیا لے آتا۔

اس کی موجودگی میں اگر اماں کی دوائی کا وقت ہو جاتا، تو تارا کے بجائے شہید ہی اماں کو دوائی اپنے ہاتھ سے پلاتا۔ اماں کے منہ سے شہید کے لئے ہزاروں دعائیں نکلتیں۔

"خدا تمہاری ہر خواہش پوری کرے۔ دنیا جہاں کی تمہیں خوشیاں نصیب کرے۔ چاند سی دلہن آئے"۔ اماں کو شہید کی دلہن کا ارمان تھا۔ وہ دعاؤں میں یہ دعا بھی ضرور شامل کرتیں۔

وہ ہنسنے لگتا۔ "اماں اب اس سفید سر والے سے کون لڑکی بیاہ کرنے پر آمادہ ہوگی"۔

"لو ایسی کون سی عمر ہو گئی تمہاری"۔ اماں کہتی۔

"اس سفید بالوں پر سہرا سجا کیا اچھا لگے گا اماں"۔ وہ مسکرا مسکرا کر اماں سے بحث کرتا۔

"کیوں نہیں اچھا لگے گا۔ تم راضی تو ہو۔ میں مرنے سے پہلے اپنا یہ ارمان پورا کر جاؤں ہر ماں کو بیٹے کا بیاہ رچانے کا ارمان ہوتا ہے۔ تم بھی تو میرے بیٹے ہو"۔ اماں

کی آواز میں مسرت کی آمیزش ہوتی۔

"ہوں اماں۔ شہید لمبا سا سانس کھینچتا۔ صرف میری مرضی سے کیا ہوتا ہے"۔ اس کا چہرہ عجیب سا ہو جاتا۔ اداس سی نظریں تارا کے چہرے پر جا ٹھہرتیں۔ اور تارا کی جھکی پلکیں اس وقت چاہتے ہوئے بھی اٹھ نہ سکتیں۔ دل ہولے ہولے ڈوبنے لگتا وہ نہ جانے غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ یا خوش فہمی میں۔ لیکن اس کا سچا دل اس کو اس بات کی گواہی دیتا۔ شہید کے دل کو صرف اس سے تعلق ہے۔

"وہ اس کے بہکے بہکے انداز۔ الجھے الجھے جملوں کو کس طرح نہ سمجھتی وہ کوئی معصوم نوعمر لڑکی نہ تھی۔ وہ تو زندگی کے ہر مرحلے سے گذر چکی تھی۔

وہ بہت تجربہ کار عورت تھی۔ پھر بھلا شہید کی باتوں کو کس طرح نہ سمجھتی۔ شہید کے ان اشاروں اور کنایوں پر اُسے شدید غصہ آتا۔ دل کو بے حد تکلیف ہوتی۔ شہید کیوں تم میری زخمی ہستی پر اور ضربیں لگاتے ہو۔ میں تو پہلے ہی ٹوٹی بکھری شے ہوں۔

لیکن یہ تو اس کے دل کی زبان ہوتی۔ منہ سے وہ کچھ نہ بولتی۔ لیکن اُس کے افسردہ چہرے پر غم اور غصہ ضرور پھیل جاتا۔

ایک بار تو اماں سے تکرار کے درمیان۔ شہید نے اپنی پسند کی ایسی عورت کا خاکہ کھینچا۔ جو ہو بہو تارا کی تصویر تھی۔ اماں کیا سمجھیں! اس کی خبر تارا کو نہ تھی۔ ہاں تارا کھول سی گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اُس نے دوسرے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

"اس کی اس حرکت پر شہید افسردگی سے اماں سے مخاطب ہوا۔

"اماں اپنی قسمت میں۔ شادی وادی کا چکر ہے ہی نہیں۔ زندگی اتنی گذر گئی ہے۔

آگے کی بھی گذر جائے گی۔ وہ صحیح معنوں میں اس وقت بے حد شکستہ دل ہو رہا تھا۔

تارا شہید سے پھر بگڑی بگڑی رہنے لگی تھی۔ اس کی سوچ کے مطابق وہ بہت خراب خیالات کا مالک تھا۔ بھائی کی امانت پر بری نظر ڈالتا تھا۔ اور پاکیزہ رشتوں کی توہین کرتا تھا۔

شہید آتا تو وہ اس کے پاس نہ بیٹھتی۔ اندر کمرے میں بند ہو کر مسلسل مشین چلاتی رہتی۔ اب اُس نے پھر پہلے جیسے زور شور سے سلائی کا کام شروع کر رکھا تھا۔ حالانکہ شہید نے کتنی بار اُسے بڑے دکھ سے سمجھایا تھا۔ لیکن وہ کب شہید کی باتوں پر کان دھرتی تھی۔

شہید بھی اس کے مزاج کی وجہ سے اُس سے کم بولتا۔ لیکن اماں کی وجہ سے اُسے شام اس گھر میں آنا ہی پڑتا۔ اور سچی بات یہ تھی۔ لاکھ تارا روٹھی رہتی۔ پھر بھی وہاں آئے بغیر اُس کی شام نہ ملتی تھی۔

وہ نہ جانے کون سا سکون تلاش کرنے وہاں آتا تھا۔ حالانکہ سکون نام کی کوئی شے اُس گھر کے مکینوں کے پاس نہ تھی۔

اماں تو چراغ سحری تھیں۔ کب تک دیا بغیر تیل کے جل سکتا ہے۔ اس طرح اماں کب تک سنبھالا لیتیں۔ کتنی بار ڈوب ڈوب کر ان کی سانسیں ابھری تھیں۔ جب رخصت کی گھڑی آجاتی ہے تو جانا پڑتا ہی ہے۔ اور سردیوں کی جاتی رت کے ساتھ ایک ڈوبتی شام کو اماں کی زندگی کا ستارہ بھی افق میں جا ڈوبا۔

اماں بچھڑیں۔ اُن کو بھی موت نے تارا سے چھین لیا تھا۔ تارا کے آنسو آج پھر آنکھوں میں منجمد ہو گئے تھے۔ پہلے وہ اماں کی گود میں منہ چھپا کر غم سے فرار

حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن آج تو وہ گود اُس سے چھن گئی تھی۔ اور نہ جانے کس سہارے کو پانے کی کوشش میں اس کا ڈوبتا وجود شہید کی باہوں میں جا گرا تھا۔ شہید تو اُسے تسلی دینے اُس کے قریب آیا تھا۔ وہ سپردگی اور خواب کی سی کیفیت میں اُس کی باہوں میں سما گئی تھی۔ کتنی بے باک حرکت سرزد ہوئی تھی اُس سے۔ اُس وقت جبکہ گھر محلے کی جاہل اور افواہوں کو جنم دینے والی عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن تارا کو اس وقت کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ جذبات کی رَو میں بہہ کر انسان سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔ تارا کو اس بات کی کب خبر تھی کہ اس نے کتنی فحش حرکت کی ہے۔ شہید نے اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پلنگ پر جا لٹایا تھا۔ اب بھی وہ اس پر جھکا اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ پھر شہید کی ترکیبوں سے تارا کو ہوش آگیا۔ وہ رونے لگی۔ شہید بھی اس کے ساتھ رو رہا تھا۔ اُس کو تسلیاں تشفی دے رہا تھا۔

" اور پھر جب اتنا ہمدرد موجود ہے تو پھر ہمیں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے، عورتیں ایک ایک کر کے کھسنے لگیں۔

اور پھر تارا کے دل نے جلد ماں کی جدائی کو برداشت کر لیا۔ گذرتے دنوں نے آنکھوں کے آنسو خشک کر دیئے۔ دل کا زخم تو ہرا تھا۔ لیکن دل کو نظر آنے والی چیز نہیں۔ اُس کی کسی کو کیا خبر ہوئی ہے۔ اماں کے بعد گھر سونا سونا ہو گیا۔ بس دو ہی تو دم رہ گئے تھے۔ چاندنی اور تارا۔ شہید نے اب بھی آنا نہ چھوڑا تھا۔ روز ہی آتا۔ اور شہید کی وجہ سے معصوم اور پاکباز تارا محلے بھر میں بدنام ہو رہی تھی نہ جانے لوگ اتنے تنگ دل کیوں ہوتے ہیں۔ دوسروں کے معاملے میں۔ شہید تارا

کی دلجوئی کرتا۔ لوگ اُسے گناہ کہتے۔ محلے کی عورتوں میں شہید بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔
شہید نے کبھی کسی کو نظر اٹھا کر دیکھا تک نہ تھا۔ اور نہ ہی اُسے ان باتوں اور افواہوں کا علم تھا جو اُس کے اور تارا کے بارے میں آگ کی طرح پھیل رہی تھیں اور پھیلائی جا رہی تھیں۔ شہید تارا کی دلجوئی اور دل بہلانے کی خاطر اُسے بے حد اصرار پر آمادہ کر کے باہر بھی لے جاتا۔ محلے کی عورتوں نے اکثر اُسے شہید کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ کر باہر جاتے دیکھا تھا۔ اب جب کبھی شام محلے والیاں اکٹھی ہو کر بیٹھتیں تو باتوں کا مرکز تارا ہوتی —

"ادہر کتنے برس ہو گئے خاوند کو مرے ہوئے۔ لیکن دیور جی اب تک بھابی کے لاڈ اٹھا رہے ہیں خاوند کے مرنے کے بعد دیور تو پرائے ہو جاتے ہیں رشیدہ کہتی۔

وہ اُسے بھابی کب کہتا ہے نام لیتا ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے نام لیتے سنا ہے۔" فاروق کی اماں درست کہتی۔

"ضرور کوئی چکر ہے"۔ رشیدہ پختہ یقینی سے سر ہلاتی۔

"ہے تو کنوارہ۔ ہو سکتا ہے۔ تارا کے چکر میں ہی شادی نہ کی ہو اب تک"۔ چچی لونا ضروری سمجھتی۔ ساتھ ساتھ ایک اور سنگین الزام تارا پر لگ جاتا۔

"کیسی رونق آگئی ہے۔ تارا کے منہ پر بھی اور گھر میں بھی"۔ فاروق کی ماں کہتی "خوب بننے سنورنے لگی ہے۔ ہمیشہ رنگ برنگے لباس میں نظر آتی ہے۔ اور چاندنی کو دیکھو ایک سے ایک کپڑا پہنتی ہے"۔ ان کو چاندنی کا بھی اچھا پہننا بُرا لگتا۔

"سب کچھ وہ ہی تو خرید کر لاتا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب بھی آتا ہے۔ گاڑی سامان سے بھری ہوتی ہے"۔ پڑوس کی چچی تو ہر دم تارا کے دروازے

پر نظریں رکھتی تھیں۔ بظاہر منہ پر اس کی ہمدرد بنتی تھیں۔ لیکن تھیں بے حد کینہ پرور۔ ان عورتوں کے نزدیک تارا کا تو مسکرانا بھی گناہ تھا۔

"اب تو سلائی کا کام بھی ختم کر دیا۔ وہ ہی سب خرچہ اٹھاتا ہے۔" رشیدہ نے کچھ اور معلومات فراہم کیں۔ "میں تو انجانے میں ایک بھلا رشتہ لے کر گئی تھی۔ لیکن تارا نے تو قیامت ڈھا دی۔ مجھے خوب بے عزت کیا۔ ایسی خفا ہوئی کہ میں نے کوئی گناہ کر دیا ہو۔"

"لو ڈاکٹر کے بعد بھلا وہ کسی اور کو کیا گھاس ڈالے گی۔" فاروق کی ماں بولیں۔

"میں تو اُس سے کہہ ہی دوں گی کہ بی بی شرافت سے دو بول پڑھوا لو۔ بس بند کرو۔ یہ کھیل تماشہ۔" رشیدہ بولیں۔

"وہ ڈاکٹر کرے گا نکاح۔ جب سارے ارمان یوں ہی پورے ہو رہے ہیں۔ کیسی شان سے روز ایک سے ایک لباس پہن کر اُس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر جاتی ہے۔"

فاروق کی ماں کو تارا سے سب میں زیادہ بیر تھا۔ ان لوگوں نے جھوٹی سچی باتیں ملا کر تارا کے خلاف اچھی خاصی کہانی گھڑی تھی۔ ایک محاذ اُس کے خلاف بن چکا تھا۔

محلے والیوں کی نظروں میں تارا نہ جانے کیا سے کیا بن چکی تھی:

وہ نیک اور پارسا نہ رہی تھی۔ وہ گناہ گار تصور کی جاتی تھی۔ بے بات بے وجہ ہی۔ حالانکہ وہ اب بھی معصوم اور پاکباز تھی۔ اُس سے کبھی کوئی انجانا گناہ بھی سرزد نہ ہوا تھا۔ وہ تو بے حد پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی تھی۔ نہ زیادہ بولتی تھی نہ ہنستی مسکراتی تھی۔

"شہید ہر طرح سے اُس کو بہلانے کی کوشش میں تھا۔ وہ اُس کو طرح طرح قسمیں دے کر چاندنی کو اکسا کر صرف اُس کے دل بہلاوے کی خاطر باہر لے جاتا

تھا۔ وہ مجبور ہو کر گھر کی چار دیواری سے نکل تو آتی۔ لیکن سارے وقت گم سم رہتی۔ پتھر کے خوبصورت مجسمے کے مانند۔ اور شہید کب سے اس بے جان مجسمے میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی انتھک کوشش میں مصروف تھا۔ اُس کے مد مقابل بیٹھ کر بے تکان بولے جاتا۔ وہ سب کچھ سنتی۔ لیکن سپاٹ سا چہرہ لیے بیٹھی رہتی۔ اور شہید جھنجھلا جاتا۔ "اُف تارا۔ تم کس خمیر کی بنی ہو۔ کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا تم پر۔ کیا تم خود کو بدل نہیں سکتی۔ میری خاطر۔" وہ اپنا حوالہ بھی دے دیتا۔

"کوئی انسان خود کو کسی کے خاطر نہیں بدل سکتا۔ میں جیسی بھی ہوں اپنے لئے مناسب ہوں"۔ اُس کا دل تو وہ ہمیشہ توڑا ہی کرتی تھی۔

کبھی کبھار۔ تارا کی اس ضد پر۔ شہید کے حوصلے ہارنے لگتے۔ تم کس سراب کا پیچھا کر رہے ہو شہید۔ جو تمہاری پیاس کبھی نہ بجھا سکے گا۔ پتھر موم نہیں بن سکتا۔

اس طرح تارا بھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن پھر وہ دوسرے پل ضدی سوچیں۔ اُسے پانے کا جنون ہر سوچ پر قابض ہو جاتیں۔ نہ جانے اُس کا دل تارا سے بددل کیوں نہ ہوتا تھا۔ شہید کو اکثر تنہائیوں پر اپنے ہی دل پر آپ ہی حیرت ہوئی جو اُس کا ہوتے ہوتے بھی اُس کے بس میں نہ تھا۔ حالانکہ رنگ و روپ کا ایک دریا اس کے آگے موجزن تھا۔ اُس کے اسٹاف میں خوبصورت سی ڈاکٹر انجم اُس میں دلچسپی لیتے ہوئے کافی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اور شہید نے یہ محسوس کر کے اُس سے کترانا شروع کر دیا تھا۔ یہ روز ہی ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں عورتیں اس کے سامنے آتی رہتی تھیں۔ وہ قابل تھا لائق تھا۔ دولت مند تھا۔ خوبصورت وجیہہ تھا۔ بڑی عمر نے اس میں ایک سنجیدگی بھر کے اس کی شخصیت کو اجاگر کر دیا تھا۔ جیون ساتھی بنانے کے لئے۔

وہ اب بھی کسی حسین نوعمر لڑکی کا باآسانی انتخاب کر سکتا تھا۔ لیکن اُس کے ضدی پاگل سے دل نے اس عمر میں بھی بچوں جیسا فیصلہ کیا تھا۔ ایسے ضدی بچے کی طرح اس طرح اڑا ہوا تھا۔ جیسے وہ بھی چاند کو چھونا چاہتا ہے۔

چاند۔ جو انسان کی زد سے دور تھا۔ لیکن انسان نے اسے چھو لیا۔ پالیا۔ فتح کر لیا۔ کیا میں ایک کمزور سی عورت کو نہیں جیت سکتا۔ وہ اکثر بے حد جذباتی انداز میں سوچتا۔

تارا اس کی زندگی کی انمول خواہش بن گئی۔

حالانکہ تارا میں کیا تھا۔ حوادث کی آندھی نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔

وہ تو ایک اندھیری رات تھی۔ دکھ کی کتاب۔ اجڑی لٹی پٹی عورت۔ جو نہ اب جوان تھی اور نہ حسین۔ لیکن پھر بھی وہ اُسے دل کی تمام تر گہرائیوں اور شدید ترین جذبوں کے ساتھ پسند تھی۔ وہ اس کو حاصل کرنے کا خواہاں تھا ہر حالت میں ہر قیمت پر۔ لیکن یہ خواہش انہونی۔ انوکھی نظر آئی۔ کبھی کبھی ناکام تمنا بن جاتی۔

ناکام تمنا جس کا پورا ہونا اُسے محال نظر آتا، اور اُس کا اپنا دل چپکے چپکے کبھی زور زور سے یہی کہنے لگتا۔

تم۔ اُسے کبھی نہ پا سکو گے۔

کبھی۔ کبھی بھی نہیں۔

یوں تو محلے کی ساری عورتیں تارا کی جان کی دشمن تھیں۔ لیکن منہ پر خیر خواہ بنتی تھیں، نہ جانے کیا سوچ کر اُس ڈھلتی دوپہر کو رشیدہ آئیں۔ تارا نہا دھو کر بیٹھی تھی۔ گلابی پرانے سے سوٹ میں بے حد کملائی کملائی لگ رہی تھی۔

تارا کو رشید کے دل کی کیا خبر تھی۔ اس نے تو خوش اخلاقی سے اس کا سواگت کیا وہ اس کی اماں کی ملنے والیوں میں تھیں۔ اماں کے بعد اُسے فطرت کے مطابق ان کی ہر چیز کچھ اور اچھی لگنے لگی تھی۔ چاندنی گھر پر نہ تھی۔ سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے تارا کچھ بوریت محسوس کر رہی تھی۔ رشیدہ آئیں تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُس کا جی بہل سا گیا۔

"اماں کے بعد مجھے تو بے حد تنہائی کا احساس ہونے لگا ہے۔" انکو ہمدرد پاکر تارا دل کی کیفیت اُن کو بتانے لگی۔

"یہ تنہائی تو سب میں بری چیز ہے۔ کیسی بیمار لگ رہی ہو تم۔ میری مانو تارا۔ بس اب تم کوئی سہارا ڈھونڈ لو۔" رشیدہ اصل موضوع پر آگئیں۔

"جی!" وہ کچھ گھبرا کر معصومیت سے لب وا کر کے ان کو تکنے لگی۔

"بیٹی سچ تو یہ ہے۔ تو اس کی وجہ سے بدنام ہو رہی ہے۔ کوئی کسی کی زبان کو پکڑ نہیں سکتا۔ ان تمام باتوں کا خاتمہ ہو جائے تو بہتر ہے۔" رشیدہ مستقل بول رہی تھیں۔

تارا کی خاموشی کو وہ اُس کی رضا سمجھ رہی تھیں۔ اور دل ہی دل میں ان باتوں کو درست محسوس کر رہی تھیں۔ جو محلے کی عورتوں کا خیال تھا کہ تارا ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتی ہے ____

لیکن تارا اس وقت ہوشوں میں نہیں تھی۔ رشیدہ کے اس مشورے پر اور پھر اپنی بدنامی کے تذکرے پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ اس کے دل پر ایک قیامت سی بیت گئی تھی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو وہ **وقدھی ہوئی** آواز میں رشیدہ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا مقدس رشتوں کی پہچان کرنا یہ دنیا والے بھول گئے خالہ؟

"میں بھی تو مقدس رشتے کی بات کر رہی تھی تارا۔ میاں بیوی کا رشتہ مقدس ہی تو ہوتا ہے"۔

"اُف۔ ایسے ناپاک جملے آپ میرے اور شہید بھیا کے بارے میں زبان پر نہ لائیں۔ کیا جو بے سہارا ہوتے ہیں۔ ان کو سہارا دینا گناہ ہے۔ وہ میرے مرحوم شوہر کا بھائی ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے وہی جذبہ ہے۔ جو فرید کی زندگی میں تھا۔" تارا نے سچ بولا۔

"لیکن اصل میں تو وہ تمہارے لئے غیر ہے۔ کون نبھاتا ہے ایسے رشتوں کو"۔ رشیدہ نے اس پر پھر ایک وار کیا۔

تارا تلملا گئی۔ غصہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ "آپ کیوں پڑتی ہیں ان رشتوں کے ہیر پھیر میں۔ مجھے کسی کے مشورے اور ہمدردی کی قطعی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں"۔ اُس کا لہجہ بے حد تلخ اور توہین آمیز تھا۔

رشیدہ کے بھی جیسے آگ سی لگ گئی" تو خوب اُس کے ساتھ رات رات تک سیر کرتی پھرتی ہو۔ ہمیشہ وہ تمہارے گھر میں نظر آتا ہے۔ ہم نے ہدایت کی راہ دکھائی تو غصہ ہی آگیا۔ تم کس کس کی زبان پکڑو گی تارا۔ دیکھ لینا محلے والے اس کا ایک دن یہاں آنا بند کروا دیں گے۔

تمہاری بھلائی کی خاطر میں نے یہ بات چھیڑی تھی

دیکھو بیٹی تمہاری بھلائی کو کہہ رہی ہوں۔ یہ دنیا والے تم پر اب کیچڑ اچھالنے لگے ہیں۔ سب کی زبانیں بند کرنے کا ایک ہی علاج ہے۔ تم شادی کر لو"۔ وہ خود سارے الزامات سے بری ہو کر تارا کو محلے والوں کے خلاف اکسانے لگیں۔

"لیکن کیوں خالہ۔ کیوں؟ ۔ وہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میرے بارے میں میں نے تو کچھ بھی ایسی بات نہیں کی جو کسی کو مجھ پر الزام دھرنے کا موقع ملے"۔ اُس نے بے بسی سے کہا۔

"اصل وجہ تو وہ ڈاکٹر ہے۔ جو زور آتا ہے۔ ٹھنڈے دل سے بیٹی تم دونوں فیصلہ کر کے ایک ہو جاؤ۔ وہ بھی کنوارا ہے۔ تم بھی بے آسرا"۔

"کیا۔ کیا"۔ تارا کا سر چکرانے لگا۔ وہ منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی"۔ اگر اجازت دو۔ تو میں ہی تمہاری ماں بن کر اُس سے یہ بات چھیڑ دوں"۔ انہوں نے جیسے اپنا حق جتایا۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں"۔ تارا بلند آواز میں چیخ پڑی۔ اس وقت اس کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاتھ پیر سنسنا رہے تھے۔ وہ سر پر برقع رکھ کر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اور تارا گھٹنوں میں منہ چھپا کر بری طرح

سسکنے لگی۔ شہید کی وجہ سے وہ بدنام ہو رہی تھی۔ وہ تو پہلے ہی بری طرح لٹ چکی تھی۔ لیکن عزت کو وہ لٹانا نہ چاہتی تھی۔ کیسی کیسی الزام تراشیاں اُس پہ ہو رہی تھیں۔ آج رشیدہ کی باتوں سے اُسے اس بات کا پوری طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ نیک نامی اور شرافت تو باقی تھی اب اس کے پاس۔ جس کا سودا بھی شہید کی وجہ سے سر بازار ہو رہا تھا۔

"اُف یہ دنیا کیسی دنیا ہے۔ کیا صرف یہاں گناہ گار ہی بستے ہیں۔ شرافت یہاں زندہ نہیں رہ سکتی؟"۔

میں شہید کو یہاں آنے سے منع کر دوں گی۔ آج ہی۔ اُس نے پختگی سے سوچا۔

وہ متورم آنکھیں اور الجھی الجھی سوچوں میں گرفتار تھی کہ شہید چلا آیا۔ مغرب کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لیکن تارا کو آج گھر میں اجالا کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ چاندنی بھی اب تک واپس نہیں آئی تھی۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ شہید با آسانی اندر چلا آیا۔

آنگن کی بتی اُس نے ہی جلائی۔ مدھم سے جلتے بلب کی روشنی میں تارا بال پھیلائے عجیب مدہوشی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ شہید کو دیکھ کر تارا کے دل میں سلگتی آگ بھڑک اٹھی۔ ———— دھواں اُسے اپنی گرفت میں لینے لگا۔

"آج یہ پوز کیوں بنا رکھا ہے"۔ شہید نے شوخی سے کہا۔

لیکن وہ اس سے بے تکے سے انداز میں پوچھنے لگی "آپ یہاں روز کیوں آتے ہیں؟"

"اپنے دل کے کہنے پر۔ لاکھ اس کو روکتا ہوں، لیکن یہ بھی تمہاری طرح ضدی سا ہے میری نہیں سنتا"۔ تارا کے سوال پر شہید کو بہت کچھ کہنے کا موقع مل گیا۔ ویسے بھی ذہنی کشمکش سے تنگ آ کر اُس نے تارا سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کب کا کر رکھا تھا لیکن اُسے موقع ہی نہ ملتا تھا۔ آج وہ بہت کچھ کہنے پر آمادہ نظر آتا تھ

"مجھے تمہارا یہ چھوٹا سا گھر اپنی پناہ گاہ محسوس ہوتا ہے مجھے اس گھر میں عمر بھر کو پناہ دے دو۔ میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں چلا آؤں گا"۔

تارا تو آج شعلوں کی مانند بھڑکنا چاہتی تھی۔ شہید کی اس التجا پر سچ مچ بھڑک اٹھی۔ آپ عمر بھر رہنے کی بات کرتے ہیں۔ مجھے تو آپ کا ذرا سی دیر کو آنا بھی بُرا لگتا ہے۔ اُس کا لہجہ حد درجے ترشائی لئے تھا، چہرے سے بھی وہ بے حد غصے میں لگ رہی تھی۔ شہید حیران سا ہو گیا۔ آج تارا کو کیا ہوا تھا۔ یہ اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ اس کے دہلیز پر قدم رکھتے ہی لڑنا شروع کر دیا تھا۔ تارا جو ہر وقت صرف اس کی ہتک کیا کرتی تھی۔ نہ جانے وہ کس طرح یہ توہین برداشت کر جاتا تھا۔

اب بھی صبر مند بن کر ٹھنڈے لہجے میں بولا "تمہیں یہ کیا ہو گیا تارا؟"۔

"میں ہوش میں آگئی ہوں۔ پہلے آنکھیں بند رکھتی تھی۔ اب کھول لی ہیں۔ آپ کا روز اس طرح اس گھر آنا مجھے بدنام کر رہا ہے۔ رسوا کر رہا ہے"۔ وہ حقیقت اگلنے لگی۔

شہید بھی بھڑک گیا "ایسا کون کہتا ہے۔ نام تو بتاؤ۔ میں اُس سے سمجھ لوں گا"۔

"اونہہ۔ ہزاروں زبانوں کو آپ کس طرح بند کر سکتے ہیں۔ بس اس کا یہ حل ہے آپ ہم سے واسطہ ختم کر لیں۔ آپ کے سہارے کے بغیر ہم مر نہیں جائیں گے اسی طرح زندہ رہیں گے"۔

اس وقت وہ حد درجے احسان فراموش بنی ہوئی تھی۔

شہید گم سم سا ہو کر بس تارا کی صورت تکے گیا۔ جو کچھ کہنے کو راہ ملی تھی، تارا کی باتوں نے اس کی راہ کو گم کر ڈالا تھا۔ کہ اُسے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آخر کون سی ایسی بات ہو گئی ہے تارا۔ ؟۔ وہ مسلسل یہی سوال کئے جا

رہا تھا۔" محلے والوں کے دلوں سے پوچھیں۔ میں بدنام ہو چکی ہوں۔ صرف آپ کی وجہ سے۔ میرے پاس صرف شرافت کے علاوہ اور کیا ہے۔ لوگوں کی نظروں میں اگر یہ بھی ختم ہو گئی تو میں لٹ جاؤں گی۔ میری دنیا تو ختم ہو چکی۔ لیکن میں ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ میری دنیا اس کے دم سے آباد ہے۔ میں چاندنی کی ماں ہوں۔ اور بیٹیوں کی مائیں اگر رسوا ہو جائیں۔ تو ان کی بیٹیاں بھی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔"

وہ اتنا کچھ کہہ کر بری طرح گئی۔ تارا کی باتوں کے ان دیکھے زخم۔ شہید کے دل پر بڑی کاری ضربیں لگا گئے تھے "میں تم کو رسوا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو تم کو اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں۔ چاندنی کا مستقبل محفوظ چاہتا ہوں۔ تمہارے زخموں کو مندمل کرنے کا خواہاں ہوں"۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ چاندنی کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ میرے زخموں کا کسی کے پاس علاج"۔ تارا نے شہید کو آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔

"تارا۔

تم میرے بھائی کی بیوی تھیں سو ہو گیا۔ وہ رشتہ اب۔ اب میں۔ تمہارے ساتھ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بغیر مجھے زندگی ادھوری لگتی ہے نہ جانے یہ دل تم سے انجانے میں کب اس طرح کی محبت کرنے لگا کہ تم میری شدید خواہش بن گئی۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تارا"۔

"شہید نے دل کا بوجھ کتنے سادہ الفاظوں میں تارا کے آگے ڈھیر کر دیا تھا۔ لیکن تارا۔ وہ تو ایک زبردست طوفان کی زد میں آ چکی تھی... جہاں ہوا کا

زبردست زور اور شور تھا۔ ہر چیز ٹوٹ رہی تھی۔ بکھر رہی تھی۔ تارا کے وجود میں کیا ٹوٹا کیا چھوٹا۔ اس کی اُس وقت تارا کو بھی فکر اور خبر نہ تھی۔

"شہید نے وہ ہی کہا تھا۔ جو دنیا نے کہا تھا۔ وہ سب کو جھوٹا کہتی تھی لیکن دنیا کی تجربہ کار نگاہیں سب کچھ سمجھ چکی تھیں۔ دنیا سچی تھی۔ شہید جھوٹا تھا۔ وہ گناہ گار تھا کیسے گناہ کا سبق اُسے پڑھا رہا تھا"

"تم۔ تم کتنے نیچ ہو۔ کتنے بددیانت۔ میں اب بھی فرید کی امانت ہوں شہید تم کہاں سے خیانت کرنے آ گئے۔ جھوٹی محبت کا بھرم لے کر" تارا میں اس وقت بے حد ہمت پیدا ہو چلی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے شہید کے مقابلے پر ڈٹی ہوئی تھی۔ 1

شہید نے اب بھی ہمت نہ ہاری "تارا جذباتی نہ ہو، ہوش میں آ کر میری بات پر غور کرو۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ چاندنی کی بھلائی ہے۔ تم تن تنہا اس دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بعد میں ایک نہ ایک دن تم کو سہارے کی ضرورت محسوس ہو گی۔ ہم ایک دوسرے کا سہارا بن سکتے ہیں۔ مجھے نہ ٹھکراؤ تارا۔ مجھے نہ ٹھکراؤ" شہید کے لہجے میں منت تھی۔

لیکن تارا نے تو اُس وقت ہوش کا دامن ہاتھ سے بالکل چھوڑ رکھا تھا "مجھے آپ سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔ میں آپ کا وجود زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی۔ خدا کے واسطے آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ آج کے بعد یہ سمجھ لیجئے گا کہ آپ کے لئے اوروں کی طرح ہم بھی مر گئے"

یہ آخری جملے تھے تارا کی زبان سے جو شہید نے سنے اور پھر اُس سے کچھ اور نہ سنا گیا۔

اف کتنی شدید توہین کی تھی تارا نے اس کی۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ آنکھوں میں تلخی امنڈ آئی۔ تارا اُسے صاف الفاظوں میں اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم دے چکی تھی۔ شدید نفرت کا اظہار کر چکی تھی۔ اب وہ کس طرح وہاں ٹھہرتا۔ "ٹھیک ہے تارا۔ آج کے بعد پھر ہم کبھی نہ ملیں گے۔ میں جا رہا ہوں کبھی نہ آنے کے لئے"! اس نے ساری تلخی اپنے دل میں سمو لی۔ اور دھیرے قدموں سے باہر نکل گیا۔ تارا کے کانوں نے اس کی کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی ــ پھر آواز دور ہوتی گئی۔ شہید جا چکا تھا۔

اور تارا اس پر ظلم کر کے، دنیا کی باتوں کا بدلہ اُس سے لے کر بھی سکون نہ پا سکی بلکہ اس کا دل بے حد مضطرب ہو گیا۔

کہ آپ ہی آپ رو رو کر ہلکان ہو گئی۔ چاندنی گھر واپس آئی تو ماں کی حالت پر پریشان ہو گئی۔ اُسے اس بات کی بھی حیرانی تھی کہ آج شہید چچا کیوں نہیں آئے۔ کتنی بار اس نے تارا سے یہ سوال کیا۔

لیکن تارا نے اُسے یہ بھی نہ بتایا۔

کہ شہید آ کر واپس جا چکا ہے۔ پھر کبھی نہ آنے کے لئے۔ چاندنی کا تو شہید سے خونی رشتہ تھا اُسے تو شہید سے بے انتہا محبت تھی۔ رات دیر تک وہ گھر کے دروازے پر کھڑی شہید کا انتظار کرتی رہی۔ آخر مایوس ہو کر پلنگ پر آ لیٹی۔ تارا کے کہنے پر بھی کھانا نہ کھایا۔

تارا کی تو بھوک پیاس نیند سب ختم ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں آنکھیں موند کر چپکے چپکے رو رو کر وہ شہید کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔

شہید پہ گھر کے دروازے بند کر کے اُس نے چاندنی کو بھی سزا دی تھی شہید کو بھی اور خود کو بھی۔

یہ اُس کا دل ہی بار بار اس سے کہہ رہا تھا جس کو وہ اب جھٹلانے کی کوشش بھی نہ کر رہی تھی۔

- - - - - - - - - -

اور پھر شہید پلٹ کر تارا کی دہلیز پر نہ آیا۔ آتا بھی کیوں کر۔ تارا نے تو اس کی عزت کا لبادہ تار تار کر دیا تھا۔ کتنا ذلیل کیا تھا۔ دھتکارا تھا۔ اپنی شدید نفرت کا اظہار کر کے اُسے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔ ظاہری زخم بھر جاتے ہیں۔ ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن زبان سے چبھوئے نشتر جو کاری زخم دل پر لگائے جاتے ہیں وہ کبھی مندمل نہیں ہوتے ایسے زخم تارا نے شہید کو بھی بخشے تھے۔ اور خود کو بھی۔ اُسے اپنے دل کی پروا نہ تھی لیکن شہید سے بچھڑ کر نہ جانے اس کا دل اس کی اتنی پروا کیوں کرنے لگا تھا۔ اکثر ڈوبتی دوپہر اور ڈھلتی شام کے ساتھ اُسے شہید کی یاد آ جاتی۔ ایسے ہی لمحے تو وہ رونق کا احساس بن کر ویران گھر میں آیا کرتا تھا۔ تارا کی اداس نظریں بیرونی دروازے پر جا رکتیں۔ کان باہر لگے رہتے وہ شہید کی کار کی آواز بخوبی پہچانتی تھی۔

لیکن اس کا انتظار فضول تھا۔ بے فائدہ۔ لیکن تارا کی انتظار کرنے کی عادت نہ جانے ختم کیوں نہ ہوتی تھی۔ چاندنی شہید کے نہ آنے سے الگ اداس تھی۔ اس کا ننھا معصوم دل یہ نہ سمجھ سکا تھا۔ آخر اس کے اتنے اچھے چچا نے اُن کے گھر کیوں آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے دل کی شدید بے چینی کا اظہار تارا پر ضرور کرتی۔ وہ کیوں نہیں آتے۔ ؟ امی ہم اُن کا گھر جانتے ہیں۔ چلئے نا چچا کے پاس۔ وہ اکثر ضد میں آجاتی۔ رو رو کر حال بُرا کر لیتی۔ اور تارا نے چاندنی کو سمجھانے کی خاطر اس سے جھوٹ بولا تھا۔

تمہارے چچا کافی عرصے کے لئے باہر چلے گئے۔

امی کی اس بات پر اُسے صبر ضرور آگیا تھا۔ اس کے دل نے آپ ہی آپ چچا کا انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اُس کو اپنے چچا بھی بھیا کی طرح بے وفا لگنے لگے تھے۔ دوسرے شہر جاکر کیا وہ خط بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ وہ بے حد اداس ہو کر چپکے چپکے رونے لگتی۔ شہید کے چلے جانے سے چاندنی کو محسوس ہوتا۔ کہ اس کی زندگی میں پھر ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ اُس کے ننھے سے دل نے ہمیشہ باپ کی کمی محسوس کی تھی۔ لیکن شہید کے پیار نے اس کا وہ دکھ بھلا دیا تھا۔ وہ اُسے اپنا باپ سمجھنے لگی۔ کتنا شفیق تھا۔ اتنے عرصے اس نے چاندنی کی ہر خواہش کو پورا کیا تھا۔ پہلے وہ احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ کسی اچھی چیز کو دیکھتی۔ اس کا دل اُس چیز کو پانے کی تمنا کرتا۔ لیکن وہ دل کو مار لیتی۔ تم یہ نہیں لے سکتی۔ یہ تمہاری پہنچ سے باہر ہے وہ اپنی ماں کے دکھوں کو پہچان کر ننھی سی عمر میں حساس اور باشعور ہوگئی تھی۔ لیکن شہید نے اُسے وہ سب کچھ دیا۔ جو وہ چاہتی تھی۔ کتنی انمول یادگاریں اُس کے پاس محفوظ تھیں۔ اس کی دلائی ہوئی چیزوں کو وہ اب اس کی یادگار ہی تو سمجھنے لگی تھی۔ اس کا دل نہ جانے یہ کیوں سوچتا تھا۔ کہ اب وہ چچا کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ ایسی ہی کیفیت میں کتنے دن گذر گئے۔ پھر دن ماہ بنے۔ ماہ سال۔

تارا اب پھر دن بھر زور شور سے مشین چلاتی۔ حالات اور محنت نے اُسے بے حد بدمزاج اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ محلے والوں سے بھی اُس نے ناطہ توڑ لیا تھا۔ اب وہ سلائی کا کام باہر دکانوں سے لے کر آتی اور کمشن پر سلائی کرتی۔ سارا سارا دن وہ مشین چلاتی تھک جاتی تو چادر سے منہ لپیٹ کر چارپائی پر جا پڑتی۔ چاندنی سے بھی وہ بہت کم بات کرتی تھی۔ پھر ان دنوں وہ حد درجے کنجوس ہوگئی تھی۔ حالانکہ سلائی کی وجہ سے اچھی خاصی

آمدنی ہو جاتی تھی۔ لیکن تارا تو ایک ایک پیسہ گن کر رکھتی روز صرف گھر میں دال پکتی۔ نوید جو رقم بھیجا کرتا۔ وہ بھی کسی کونے میں چھپا کر رکھ دیتی تھی۔ نوید کو گھر سے گئے تین سال سے زائد عرصہ گذر چکا تھا۔ یہ تین سال تارا کے لئے تین صدیاں ہو کر گذر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نوید کے لئے ترس گیئں۔ دل اس کی یاد میں ہر دم تڑپتا رہتا۔ حالانکہ کراچی سے دور بھی نہ تھا۔ پھر بھی نہ جانے وہ کیوں نہ آ سکتا تھا۔ کون سے اصول کا پابند تھا؟ کس بندھن میں جکڑا ہوا تھا۔؟ کون سا جرم کیا تھا اس نے جو روپوش تھا ماں کی نظر سے بہن کی نظر سے۔؟ ۔؟

یہ سوال۔ تارا کے تاریک دل میں ابھر ابھر کے ڈوبتے۔ تین سال میں تو لوگ دنیا کے آخری کونے سے بھی اپنے عزیزوں کے لئے پلٹ آتے ہیں۔ اور نوید تو اس ملک میں ہی تھا۔ کیا اُسے ہماری یاد نہیں آتی۔ ماں اور بہن کے دکھ نہیں ستاتے۔ سوچوں کے نشتر اس کے دل میں چبھتے رہتے۔ سچ مچ وہ خون کے آنسو رو دیتی۔ میرا بیٹا مجھے بھول گیا۔ یہ دکھ اس کے لئے کتنا اذیت ناک تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے دکھ اُس نے خود سمیٹ رکھے تھے۔ ہر دکھ اس کے دل میں آسانی سے جا سماتا۔

قسمت کی گردش ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ عہد رفتہ کی یادوں کو قریب بلا بلا کر وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ یادوں کا یہ خزانہ اب وہ لٹا دینا چاہتی تھی۔ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ لیکن کیا یہ سب بھلانا اُس کے بس میں نہ تھا۔؟ ۔ یادوں کو فراموش کرنا آسان تو نہیں ہوتا۔ یاد ماضی کی رہگزروں میں قدم رکھتے ہی فریدہ کا دھندلا یا چہرہ تصور میں اجاگر ہوتا۔ اور پل بھر میں اس کے چہرے کے زاویے بدل جاتے نقش ونگار بدل جاتے۔ وہ چہرہ شہید کا چہرہ بن جاتا۔ وہ گھبرا کر اپنی سرخ سرخ آنکھیں

کھول دیتی۔ گھبرا کر سر تکیئے پر پٹخنے لگتی۔ لیکن دل میں آیا خیال جدا نہ ہوتا۔ شہید شہید شہید۔ اُس کے دل کی پکار نہ تھمتی۔ اُسے کبھی کبھار۔ اپنی جذباتی فطرت اور طبیعت سے کوفت ہونے لگتی۔ تم میں کیا تھا تارا۔

نہ تم اب حسین رہی ہو۔ تمہارے حسن کی حسین عمارت تو اب ڈھے چکی ہے۔ تم ایک ویران کھنڈر ہو۔ تم میں کیا تھا۔ کیا تھا تارا۔؟

نہ صورت۔ نہ حسن۔ نہ دولت۔ نہ جوانی۔ پھر بھی وہ تم کو دل کی گہرائیوں سے اپنانا چاہتا تھا۔ وہ تو تمہاری خاطر قربانی دینا چاہتا تھا۔ لیکن تم نے۔ تم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔

وہ بہکنے لگتی۔ شہید کے لئے دل میں عجیب سے جذبات اُبھر آتے۔ اُسے خود سے شرمندگی ہونے لگتی۔ لیکن اس کا دل کہتا۔ اُسے شہید سے لگن تھی۔ محبت تھی۔ ویسی ہی محبت۔ جیسی اُسے کبھی فرید سے تھی۔

اُسے اپنی اس حس پر حیرانی بھی نہ ہوتی۔ پہروں اُس کے دل و دماغ پر شہید کا تصور چھایا رہتا۔ باغی دل کہتا۔ تم ہار جاؤ تارا۔ اُسے منالاؤ۔

پھر۔ پھر۔ زندگی کے انداز بدل جائیں گے۔

سب کچھ بدل جائے گا۔ خزاں کا دور ختم ہو جائے گا۔ بہار آجائے گی۔ اور پھر سدا تمہاری زندگی میں بہار ہی بہار رہے گی۔

لیکن فرید — اُسے فرید کا خیال آجاتا۔ وہ تو مر چکا۔ اُس کا اب اس دنیا کے باسیوں سے کیا واسطہ۔

نہیں میں اس سے بے وفائی نہ کروں گی۔ اس کے بھائی کی بیوی بن کر گناہ

نہ کروں گی۔

نہیں نہیں۔ نہیں کی یہ تکرار اس کے دل کو پھر شہید کے خلاف باغی کر دیتی۔

"چاندنی نے میٹرک پاس کر لیا۔ ترقی کی پہلی منزل پر قدم رکھ لیا۔ تارا تو چاندنی کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔ سو چاندنی کالج جانے لگی۔ چاندنی اب ننھی سی بچی نہ رہی تھی۔ اب وہ کافی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ کالج سے آکر وہ ماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ سلائی کا زیادہ کام اب چاندنی ہی کرتی۔ کیونکہ تارا کے سیدھے ہاتھ میں اب مستقل درد رہنے لگا تھا چاندنی اپنی عمر کی لڑکیوں سے بالکل مختلف فطرت کی تھی۔ حالانکہ اس عمر کی لڑکیاں بے حد شوخ اور شریر ہوتی ہیں۔ لیکن چاندنی وہ تو صورت کے ساتھ ساتھ سیرت کی بھی معصوم تھی اُسے تو کھل کر ہنسنا بھی نہ آتا تھا۔ کالج میں وہ ہمیشہ سادہ جاتی۔ حالانکہ لڑکیاں ایک سے ایک فیشن کر کے آتیں۔ سب کے پاس خوب پیسے ہوتے۔ فری پریڈز میں وہ کینٹین میں نظر آتی تھیں۔ لیکن چاندنی سب سے علیحدہ رہتی۔ اس نے کسی بھی لڑکی سے دوستی نہ کی تھی۔ یہ محسوس کر کے کہ وہ ان کی ٹکر کی نہیں ہے۔ وہ تو ایک بے باپ کی لڑکی تھی اور جن بچیوں کے سر پر سے باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے وہ ادھوری شخصیت کی ہوتی ہیں۔ دل میں ہمیشہ محرومی کا احساس لئے رہتی ہیں۔ اور چاندنی کے پاس بھی باپ کے ساتھ کچھ نہ دیا۔

کالج میں اس کی کلاس کی لڑکیاں اُس سے دوستی کی خواہاں تھیں۔ لیکن چاندنی آپ جان کر ان سے دور رہتی۔ وہ خاموش طبع بے حد خوبصورت اور سنجیدہ و پُروقار سی لڑکی ہر من کو بھاتی ضرور تھی۔ لیکن اس کی خاموشی کو حسن مغرور سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اسے بے بات بے وجہ مغرور کہتے تھے۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ سب کچھ سن کر بھی چپ رہتی

لیکن اکثر اس کی کلاس کی شوخ لڑکیاں اُس کا گھیراؤ کر لیتیں۔ کیسی کیسی واہیات باتیں کیا کرتی وہ سب آپس میں۔ نہ جانے ان سب کو غیر لڑکوں سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ ہر ایک نے من میں کسی نہ کسی کو چھپا رکھا تھا۔

چاندنی تم بھی کیا کسی کو چاہتی ہو۔ ایک بار اس کی ہم جماعت نائلہ نے اُس سے پوچھ لیا تھا۔ نائلہ کی اس بات پر۔ مارے شرم کے اس کا گلابی چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ توبہ تم کتنی واہیات باتیں کرتی ہو۔ وہ گھبرا کر وہاں سے جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ لیکن تم تو اتنی خوبصورت ہو۔ تم کو تو ضرور کوئی چاہتا ہو گا۔ جاتے جاتے اُس نے نائلہ کے ہنسی میں ڈوبے یہ جملے سن لئے تھے۔

چاہے گئے اور چاہے جانے کی اس بات نے اس دل میں ایک کسک پیدا کر دی۔ مجھے کون چاہے گا۔ مجھے کون چاہے گا۔؟

رات جب کتابوں کو سامنے رکھ کر وہ پڑھنے بیٹھتی تو اس سوچ میں ڈوب گئی۔ اس دنیا میں اُسے بہت کم چاہنے والے تھے۔ جو چاہت ملتی وہ جلد چھن جاتی۔ نوید کی چاہت۔ شہید کی چاہت۔ پھر تارا نے کون سی اُسے چاہت دی تھی۔

مجھے کوئی نہیں چاہتا۔ اس کے دل میں ایک چوٹ سی لگی۔

اس رات وہ پڑھنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ پڑھ سکی۔

"شدید ترین گرمیوں کے دن تھے۔ گرمی میں تو کمرے میں سونا محال تھا۔ تارا اور چاندنی چھوٹے سے آنگن میں چارپائیاں ڈال کر تاروں کی خنک چھاؤں میں سویا کرتی تھیں۔ اس رات چاندنی بھی جلد سونے لیٹ گئی۔ آج کل وہ ضرورت سے زیادہ ہی اداس رہنے لگی تھی۔ وہ ایسی غم زدہ دل دکھانے والی سوچوں میں ڈوبی بس نیند میں کھونا ہی چاہتی تھی کہ باہر کا دروازہ بج اٹھا۔ ساتھ اس کا دل بھی۔ نہ جانے اتنی رات گئے کون آیا تھا۔ ؟۔ اُسے جب بھی گہری رات کو دروازہ بجتا خوف سا لاحق ہوتا۔ اب بھی دبکی چارپائی پر پڑی رہی، تارا اٹھ کر دروازے کے قریب چلی آئی۔ کون ؟ ۔ وہ بغیر اطمینان کئے رات کبھی دروازہ نہ کھولتی تھی۔

"امی میں ہوں" ۔ ؟۔ باہر سے آواز آئی ۔ ارے یہ تو اس کے نوید کی آواز تھی۔ تارا نے کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھول دی۔ چاندنی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے اس کا بچھڑا ہوا ماں سے لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ وہ کتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اُس سے لپٹی ماں گردن اٹھا کر اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ حیرانی سے بے یقینی سے۔ کہ آنے والا اُس کا بیٹا ہی ہے نا۔

پھر بھلا وہ اپنی ممتا کے احساس کو کس طرح نہ پہچانتی ۔ وہ نوید ہی تھا۔

کتنا بڑا ہو گیا تھا وہ۔ گھر سے گیا تھا۔ تو دبلا پتلا نکلتے ہوئے قد کا بچہ تھا لیکن تین برسوں میں وہ بھرپور جوان ہو گیا تھا چھ فٹ لمبا قد بے حد اچھا جسم اور بے حد

قیمتی سوٹ میں سر سے پیر تک چمک رہا تھا۔ اور تارا اُس کے سینے پہ اپنا سر رکھی اپنے آنسوؤں سے اُس کا نفیس سوٹ داغدار کر رہی تھی۔ اس سے گلے شکوے کر رہی تھی وہ بھی بھرائی آواز میں ماں کو تسلی دے رہا تھا۔

چاندنی بھی اسی بے قراری سے بھائی سے ملی۔ آنکھوں سے چھم چھم خوشی کے آنسو برسنے لگے۔ نوید کے آنے سے پل بھر میں گھر میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔ تارا بھی خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ چاندنی کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

تارا بس اس سے یہی سوال کئے جا رہی تھی۔ کہ آخر وہ اتنے عرصے کہاں رہا۔ لیکن نوید۔ تارا کو صحیح معلومات فراہم نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ کا پتہ ماں کو بھی نہ بتانا چاہتا تھا۔ اب تو وہ بے ایمانی کا پکا دھندا کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ خود بھی ڈھیٹ اور بے ایمان ہو گیا تھا۔ اشفاق کے گروہ میں شامل ہو کر۔ دولت کمانی اُسے خوب آگئی تھی۔ سچ مچ وہ عیش کے دن گذار رہا تھا۔ دنیا کے ہر رنگ سے کھیل رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا۔ زندگی کے پندرہ سولہ سال جو اس نے اپنے گھر میں گذارے تھے۔ وہ جہنم سے کم نہ تھے۔ اب تو اُسے دنیا میں جنت مل چکی تھی۔ دو بار وہ جاپان ہو آیا تھا۔ اب وہ بھولا بھالا نوید نہ رہا تھا۔ بیس برس کی عمر سے قبل وہ پکا خرانٹ ہو گیا تھا۔ ساتھ عیار اور مکار بھی۔ اچھی خوراک اور بے فکری کی وجہ سے وہ عمر سے دو گنا نظر آتا تھا۔ اب بار بار تارا اس سے اُس کے حالات پوچھ رہی تھی۔ تو وہ اُسے ایک من گھڑت کہانی سنانے لگا تھا۔

"امی۔ اس دن رات جب آپ نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ تو میں سڑک پر جانے لگا۔ کہ عظیم انکل کی کار میرے قریب آ کر رک گئی۔ اس کے اندر وہ

بیٹھے تھے انہوں نے مجھ رونے کی وجہ پوچھی۔ تو امی میں نے اُن سے جھوٹ بول دیا کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ نہ رہنے کا گھر نہ کوئی اور ٹھکانہ۔ اس پر انہوں نے مجھے اپنی کار میں بٹھالیا۔ اور مجھے اپنے ساتھ لیتے گئے۔

بس۔ پھر عظیم انکل نے اپنا بیٹا بنالیا۔

انہوں نے مجھے اس طرح پیار دیا۔ جس طرح وہ اپنے اور بچوں کو دیتے تھے۔ اس وجہ سے امی میں ان سے سچ نہ بول سکا۔ کہ میری امی اور بہن اس دنیا میں موجود ہیں۔ وہ مجھے جھوٹا کہتے اور گھر سے نکال بھی دیتے شاید۔ اس لئے میں نے آپ کو ان سے چھپ کر خط لکھے اور ان کے پتے پر خط بھی نہ منگوا سکا۔ عظیم انکل کی وجہ سے امی میں انسان بن گیا۔ انہوں نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے امی" نوید نے جھوٹ بول کر تارا کو مطمئن کر دیا۔ "دنیا میں اچھے آدمیوں کی کمی نہیں بیٹے" تارا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "لیکن میں دل پر بہت ظلم کر چکی اب میں تم کو خود سے جدا نہ ہونے دوں گی نوید" ۔ تارا نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ نوید خاموشی سے ماں کی باتیں سن رہا تھا۔ اور تارا مسلسل بول رہی تھی۔ "اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ میرا سہارا بن کر میرے قریب ہی رہنا بیٹے۔ اب تمہاری وجہ سے میرے دکھ کے دن ختم ہو جائیں گے" وہ بھیگی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر خشک کرنے لگی۔

"امی۔ اس بار تو میں صرف کچھ روز کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ عظیم انکل کا کام تھا اس جگہ۔ اب وہ اپنا سارا کاروبار مجھے سونپ چکے ہیں۔

ان کا اپنا کوئی بیٹا نہیں ہے نا اس وجہ سے" ۔ نوید نے پھر جھوٹ بولا۔

پھر ماں کو اداس ہوتا دیکھ کر ڈائے سے دلاسہ دینے لگا۔ تھوڑے دنوں کی اور

بات ہے امی۔ میں پھر آپ کے پاس ہی آکر رہوں گا۔ عظیم انکل کو مجھ پر بہت بھروسہ ہے اُن کا ویلیح کاروبار میں ہی چلا رہا ہوں"۔

نوید کے جھوٹ کے جھانسے میں آکر تارا دل ہی دل میں اپنے بیٹے پر فخر کرنے لگی۔ کتنا لائق فائق ہو گیا تھا اس کا نوید — پل بھر میں تارا کو محسوس ہونے لگا۔ وہ دکھ کا ایک طویل سفر کاٹ کر اب خوشیوں کی سرحد پہ آ گئی ہے۔ وہ بے حد ہلکی پھلکی ہو گئی۔

"نوید کے آنے کی خوشی میں — اس سے باتیں کرتے کرتے کتنی رات بیت گئی نوید اپنا بڑا سا سوٹ کیس بہن اور ماں کے لئے سوغات سے بھر کر لایا تھا۔ چاندنی کے لئے شوخ رنگوں کے لباس۔ جوتے مصنوعی زیورات، سویٹر۔ اور بہت کچھ تارا کے لئے بھی ہلکے رنگوں کے سوٹ۔ شال وغیرہ وغیرہ"۔

چاندنی کو ان چیزوں سے زیادہ بھائی کے آنے کی خوشی تھی۔

اگر وہ اس کے لئے کچھ بھی نہ لاتا جب بھی وہ ایسی خوشی محسوس کرتی جیسی ان قیمتی تحفوں کو پا کر محسوس کر رہی تھی۔ رات وہ سب بہت دیر میں سوئے۔

صبح نوید نے اپنے سوٹ کیس سے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکال کر جب تارا کے سامنے کی تو وہ حیران رہ گئی۔ "اتنے ڈھیر سے روپے کہاں سے آئے تیرے پاس"؟ — وہ کچھ مشکوک ہو کر بولی۔

اور نوید مسکرانے لگا۔ "تین برس سے محنت کر رہا ہوں۔ پھر عظیم انکل مجھے ہر ماہ جو جیب خرچ دیتے تھے وہ میں بینک میں جمع کروا دیتا تھا۔ آتے وقت سب نکال لایا"۔ اُس نے ماں کو مطمئن کرنا چاہا۔

لیکن تارا کے دل میں عجیب سی خلش بڑھنے لگی۔ دل کہنے لگا۔ کوئی کسی پر بے وجہ

مہربان نہیں ہوتا۔ اپنی دولت نہیں دے دیتا۔ وہ مشکوک ہو گئی۔ لیکن نوید پر اس کا اظہار نہیں کیا۔

اور نوید اپنی دھن میں کہہ رہا تھا "چاندنی اب بڑی ہو رہی ہے۔ جلد اُس کو بیاہنے کے دن آجائیں گے۔ دیکھئے گا۔ چاندنی کی شادی میں کتنی شان و شوکت سے کروں گا۔ یہ سب کچھ میں اس خیال سے توجمع کر رہا ہوں"۔ تارا نے محسوس کیا وہ کافی ذمہ دار ہو گیا تھا۔ اپنا فرض سمجھنے لگا تھا۔ یہ کتنی اچھی بات تھی۔ اس کا دل پھر ٹھہر گیا۔

" نوید وہاں جتنے عرصے رہا۔ زیادہ باہر کے کاموں میں الجھا رہا۔ روز صبح بن ٹھن کر گھر سے نکل جاتا۔ اور اکثر رات کو ہی واپس آتا۔

تارا کی شکایت پر وہ یہی جواب دیتا۔ امی میں یہاں بزنس کے سلسلے میں آیا تھا بہت سے کام نمٹانے ہیں مجھے۔

"میں تو سمجھی تھی ماں اور بہن کی محبت کی کشش تم کو یہاں لائی ہے۔ لیکن آئے بھی تو اپنے کام سے"۔ وہ غم زدہ لہجے میں کہتی۔

نہیں امی صرف آپ کی محبت یہاں لائی ہے مجھے۔ یہ کام تو کوئی اور کر سکتا تھا میں صرف آپ لوگوں سے ملنے کی خاطر کام کی آڑ لے کر آیا ہوں۔ اگر کام پورا کر کے نہ جاؤں گا۔ تو عظیم انکل شاید برا مانیں"۔ وہ ماں پر اپنی مجبوری ظاہر کرتا۔ دوسرے کا پابند ہی تو تھا وہ۔

نوید صرف اشفاق کے کام کے لئے تو یہاں آیا تھا۔ اشفاق تو نوید سے بے حد خوش تھا۔ وہ تو اس کی امیدوں سے بڑھ کر نکلا تھا۔ نوید کی وجہ سے اشفاق کا کاروبار

کافی ترقی کر گیا تھا۔ نوید نے اس کے لاکھوں کا ہیر پھیر کر کے اس کی دولت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اشفاق ہی اس کو اس شہر میں رہنے نہ دیتا۔ اسے خوف لاحق تھا۔ کہ کوئی بھید نوید کے گھر والوں پر نہ کھل جائے۔ ایسے برے کاموں میں دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے نا۔ عابد تو اشفاق کے پاس ہی رہتا تھا۔ اس کی بھی شان نرالی تھی۔ ایک سے ایک لباس پہنتا اشفاق کی ایک کار اس کی ہی تحویل میں تھی۔ اشفاق کے کاروبار کے سلسلے میں وہ آدھی دنیا دیکھ چکا تھا۔ ہانگ کانگ۔ ایران کابل، پیرس۔ سچ مچ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا وہ۔ اب جبکہ اشفاق کو نوید پر مکمل اعتماد ہو چکا تھا۔ اور وہ مکمل ٹریننگ بھی حاصل کر چکا تھا۔ تو اشفاق اب باہر کے ٹور پر نوید کو بھیجنے والا تھا۔ اور نوید

قبل از وقت باہر جانے کی خوشی سے سرشار تھا۔ یہاں پر نوید کا پورا وقت اشفاق اور عابد کے ساتھ گزرتا تھا۔ رات گئے وہ گھر جاتا۔ تو تارا اُس کے انتظار میں جاگ رہی ہوتی بیٹے جلدی گھر آجایا کرو۔ تارا کا روز ہی یہ اصرار ہوتا۔

" دیکھو کھانا کب سے تمہارے انتظار میں پڑا ٹھنڈا ہو گیا۔ اُسے دیکھتے ہی چاندنی کھانا گرم کرنے باورچی خانے میں چلی جاتی۔ وہ دونوں ماں بیٹیاں بھی نوید کے انتظار میں رات گئے تک بھوکی رہتی تھیں۔

اور اس پل نوید کو وہ وقت یاد آجاتا۔ جب پہلے وہ رات کو اس طرح دیر سے آیا کرتا۔ تو امی کے تیور کس قدر بگڑے بگڑے ہوتے۔ کتنی آسانی سے وہ اس پر ہاتھ اٹھا لیا کرتی تھی۔ تارا کا یہ سلوک ہی اُسے باغی کر کے گھر چھوڑنے پر آمادہ کر گیا تھا۔ لیکن اب وہ ہی ماں۔ کتنی چاہت سے رات گئے تک اس کا انتظار کیا کرتی۔ اور کتنے میٹھے الفاظوں میں اُس سے دیر سے آنے کا گلہ کرتی۔ میں تو اب بھی وہ ہی نوید ہوں۔ ہاں۔

میری حیثیت ضرور بدل گئی ہے۔ صرف دولت کی وجہ سے ۔ آج کل تو دنیا دولت کی ہے۔ دولت کے بغیر اپنے بھی پیار نہیں دیتے۔ عجیب سی فطرت ہو گئی تھی نوید کی ہر بات کو بس دولت کے ترازو میں تولا کرتا تھا وہ ۔ اس کے اعصاب پر تو بس دولت ہی دولت چھائی ہوئی تھی۔

ماں کا سچا پیار اور بہن کا احساس اس کے دل کو نہ تھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہا تھا۔ ماں کے دل میں اب بھی اس کی قدر و قیمت نہیں ہے۔ بلکہ ان نوٹوں کی ہے۔ جو اس نے ماں کی جھولی میں ڈالے تھے۔ وہ گھر آتا تو اکثر کھانے سے انکار کر دیتا۔

"امی میں نے تو آج ہوٹل میں کھانا کھا لیا ہے۔ چند دوست مل گئے تھے۔ ان کا ساتھ تو دینا ہی تھا۔ ویسے بھی اب اس کی زبان کو باہر کے کھانوں کی لت لگ گئی تھی۔ روپیہ تو ہر وقت اس کی جیب میں موجود ہی ہوتا۔ ایک سے ایک اعلیٰ ہوٹل میں جا کر من پسند کھانوں کا آرڈر دے دیا۔ جو جی میں آیا کھا لیا۔ گھر میں ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا صرف ایک دفعہ کا سالن اُسے نہ بھاتا تھا۔

اور تارا بے چاری تو اب روز ہی بیٹے کی خاطر کھانا کافی اہتمام سے پکاتی تھی۔ وہ کھانے سے انکار کر دیتا جب بھی اس کی ممتا کو چین نہ پڑتا۔ وہ دودھ گرم کر لاتی زبردستی اُسے پینے پر مجبور کر دیتی۔ پھر آخر میں خود جا کر سوتی۔

نوید کے آنے کی خبر دوسرے دن ہی محلے والوں کو ہو گئی تھی۔ چند ایک عورتیں مبارکباد دینے بھی چلی آئی تھیں۔

تارا ان دنوں اتنی خوش تھی کہ اُس کا دل آپ ہی آپ سب سے صاف ہو گیا تھا۔

شہید نواب سب کے لئے ایک بھولا بسرا نام بن گیا تھا۔ وہ کہانی ختم ہو چکی تھی۔ جو کبھی محلے والیوں نے۔ تارا اور شہید کے خلاف آپ ہی آپ بنا رکھی تھی۔

لیکن تارا شہید کو نہ بھولی تھی۔ اُس ہی شہید کو جس نے اس کا کتنا ساتھ دیا تھا۔ نوید کے لئے وہ بھی کس قدر پریشان ہوا تھا۔ کبھی تارا کا دل چاہتا۔ کہ وہ نوید کو شہید سے ملنے کا مشورہ دے۔ نوید شہید کا خون تھا۔ وہ آپس کے یہ خونی رشتے ختم نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے تو چاندنی سے جھوٹ بولا تھا۔ کہ شہید اب اس شہر میں نہیں رہتا۔ اس وجہ سے نوید سے وہ یہ بات کہہ نہ سکی۔

ویسے بھی اب وہ شہید کا نام لبوں پر نہ لاتی تھی۔

البتہ چاندنی نے نوید سے شہید کی بہت باتیں کیں۔ جن کو نوید نے بے دلی سے سنا۔ اُسے شہید سے کون سی محبت تھی جو وہ ان باتوں میں دلچسپی لیتا۔ اس نے تو آج تک شہید کو دیکھا بھی نہ تھا۔

"نوید کو آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ گذر گیا"

اور ایک دن اچانک اشفاق نے نوید کو حکم دے دیا کہ وہ چند گھنٹوں کے اندر پشاور چلا جائے سرحد پار سے اس کا کافی مال آنے والا تھا۔ اور وہ مال کراچی تک پہنچانے کا ذمہ نوید کا تھا۔ نوید نے اچانک ہی اپنے جانے کی خبر تارا کو سنائی۔ تو وہ رم جھم آنسو بہانے لگی۔ اس کا دل بیٹے کو پھر خود سے جدا کرنے پر بالکل راضی نہ تھا۔ لیکن ماں کے لئے نوید قربانی کس طرح دے سکتا تھا۔ اب تو وہ اپنی مرضی کا مالک نہ تھا۔ کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اشفاق اور اس کے ساتھیوں کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ بھلا وہ کس طرح اشفاق کا حکم ٹالتا۔

چاندنی اور تارا کو روتا چھوڑ کر وہ خود بھی کچھ دل گیر سا ہو رہا تھا۔ جاتے وقت اس نے دونوں کو بے حد تسلی دی اور ساتھ ساتھ جلد آنے کا وعدہ کر۔۔۔

وہ پھر نہ جانے کتنے دنوں کی جدائی کا داغ تارا اور چاندنی کو بخش کر اُن سے رخصت ہو گیا۔

- - - - - -

چمن تارا کی بچپن کی سہیلی تھی۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ ہنستے کھیلتے گذرا تھا۔ دونوں اکثر اپنی گڑیاؤں کی شادی ایک دوسرے کے گڈوں سے رچاتیں۔ اس طرح ایک دوسرے سے دونوں کو بے حد چاہت تھی۔ لیکن ایک عرصہ پہلے چمن کے والدین وہ شہر چھوڑ کر اپنے آبائی گاؤں جا بسے تھے۔ جہاں ان کی زمینیں تھیں اور جائیداد بھی تھی۔ وہیں گاؤں میں ہی۔ چمن کا بیاہ بھی ہو گیا۔

لیکن اس کا میاں بے حد پڑھا لکھا آدمی تھا۔ شہر میں بہت اچھی سرکاری ملازمت پر فائز تھا۔ چمن پھر شہر میں رہنے لگی۔ کار بنگلہ اور دنیا جہاں کی آسائشیں ملازمت کے ساتھ ساتھ اُس کے شوہر کو میسّر تھیں۔ پھر اُن کے تبادلے اکثر ہوتے رہتے ہر جگہ شہر کے بہترین علاقے میں ان کو کوٹھی ملتی۔ اس طرح چمن تو پورے ملک کی سیر کر چکی تھی۔ اب اس کا شوہر معراج نوکری سے ریٹائر ہو چکا تھا۔

اور اس شہر میں اُس نے مستقل رہائش اختیار کر لی تھی جہاں چمن کا بچپن گذرا تھا اُسے اب بھی کچی گلیوں کا وہ محلہ یاد تھا۔ سہیلیاں یاد تھیں۔ اُسے علم تھا اس کی طرح اس کی ساری سہیلیاں بھی بیاہ کر دور دیس جا چکی ہوں گی۔

سب کے بچے جوان ہو گئے ہوں گے۔ وہ خود بھی اب جوان بچوں کی ماں تھی۔ اس کا بڑا بیٹا ساجد بھی بڑی اچھی ملازمت پر لگ چکا تھا۔ دوسرے شہر میں

اکیلا رہتا تھا۔ چمن کو بیٹے کی تنہائی کا بے حد احساس تھا۔ اب اُس کے دل میں بہو لانے کا ارمان تھا۔ ساجد نے نیک اور فرمانبردار اولاد کی طرح تمام حقوق ماں کو ہی سونپ رکھے تھے۔ جو آپ کی پسند وہ میری بھی۔ اور چمن وہ تو بیٹے کی جنت کسی حور کے دم سے آباد کرنے کی خواہاں تھی۔ لیکن من پسند لڑکی اُسے اب تک نہ ملی تھی۔

ایک فرصت کی شام وہ اپنی بڑی سی کار میں بیٹھ کر اس محلے میں پہنچ گئی۔ جس سے اُس کی بچپن کی انمول یادیں وابستہ تھیں۔ ایک طویل عرصہ بے حساب سالوں بعد اس طرف گئی تھی۔ وہ محلہ اب بے حد تبدیل ہو چکا تھا۔ کچی گلیوں کے بجائے اب پختہ سڑکیں بن گئی تھیں۔ نئے مکانات اور دکانیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چمن کی کار آسانی سے اس سڑک میں داخل ہو گئی اور اُسے وہ دروازہ پہچانتے دیر نہ لگی جہاں پہلے وہ رہا کرتی تھی۔ چمن نے کار اس جگہ ٹھہرا لی۔ برابر تارا کا گھر تھا۔ تارا چمن کی بہترین سہیلی تھی۔

لیکن چمن نے سوچا اب تارا کہاں ہو گی اس گھر میں۔ پھر بھی نہ جانے کون سا اشتیاق اُسے وہاں کھینچ لایا تھا۔ چمن نے پہلے اس دروازے میں جھانکا جہاں اب احمد صاحب رہا کرتے تھے۔ گھر پر کوئی نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ آگے بڑھ کر تارا کے دروازے پر رک گئی۔ نہ جانے اب یہاں کون رہتا ہو۔؟۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے آہستگی سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ چمن کے ہاتھ رکھتے ہی اس کے استقبال کو اس کے دونوں پٹ وا ہو گئے۔ تارا آنگن میں بیٹھی مشین چلانے میں مصروف تھی۔ آہٹ پر نظریں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کھلے دروازے کے بیچ ایک بنی سنوری خوب صورت سی عورت کھڑی تھی۔ تارا کی نظروں میں آپ

ہی آپ سوال ابھر آیا۔ وہ شاید کسی اور کا پتہ پوچھنے آئی ہو۔ یا شاید سلائی کا کام دینے۔ ویسے اصولاً اسے اُس کے استقبال کو کھڑا ہونا تھا۔ کب سے بیٹھے بیٹھے اُس کی ٹانگیں جمنے لگی تھیں۔ بمشکل اٹھی۔ آپ کو کس سے ملنا ہے۔ ۔ ؟ ۔ آنکھوں میں ابھرا سوال زبان سے ادا ہو گیا۔

آنے والی اجنبی خاتون۔ بس ایک ٹک تارا کو تکے جا رہی تھیں۔

"تم تارا ہو۔ ؟" ۔ وہ اُسے پہچان کر بولی۔

"ہاں۔ لیکن آپ ۔ ؟" ۔ تارا اُسے نہ پہچان پائی تھی۔

"اوہ۔ تارا۔ میں تمہاری چمن ہوں۔ تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن میں تم کو پہچان گئی" وہ آگے بڑھ کر بے اختیار تارا سے لپٹ گئی۔

"چمن چمن" ۔ تارا نے اُس سے الگ ہو کر حیرانی سے دیکھا۔ چمن اُس کو یاد تھی لیکن یہ چمن کتنی مختلف نظر آ رہی تھی۔ تارا کی نظروں میں تو چمن کے نام کے ساتھ اب تک وہی پیلے پیلے رنگ کی دبلی پتلی سی چمن تھی۔ لیکن اب وہ کتنی مختلف نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کی پیشانی کا ابھرا ابھرا تل تارا کو چمن کی پہچان کرا گیا تھا۔ چمن تارا کے ساتھ پلنگ پر آ بیٹھی۔

"کہاں تھیں اتنے عرصے تک تم۔ ؟" تارا کے لبوں پر سوال ابھرا۔

چمن اس کو اپنے میاں کی نوکری پھر دنیا جہاں کے تبادلوں کے بارے میں بتانے لگی۔ تارا نے چمن کی حالت سے اندازہ لگایا تھا۔ کہ وہ بہت خوش حال ہے۔ چمن کے چہرے پر شادمانی تھی۔ سونے میں وہ سر سے پیر تک پیلی ہو رہی تھی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔

چلنے کے لحاظ سے تارا اس کے مقابل بہت کم تر نظر آرہی تھی۔ حالانکہ چمن اور تارا ہم عمر تھیں۔ لیکن تارا چمن کے سامنے اس سے دس سال بڑی لگ رہی تھی۔ چمن نے بھی تارا کے گھر اور اس کی حالت سے اس کی زندگی کی پریشانیوں کا پتہ لگا یا۔ اتنے عرصے بعد ملی تھیں وہ دونوں بچپن کی سہیلیاں۔ ایک دوسرے کو اپنی اپنی سنانے لگیں۔

چمن کی کہانی میں تو صرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ اُسے شوہر کی انمول محبت حاصل تھی۔ اس کے سارے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُس کا شوہر کروڑپتی تھا۔ وہ خوبصورت ایرکنڈیشن بنگلے میں رہتی تھی۔ کاروں میں گھومتی تھی۔ وہ بے حد خوش نصیب تھی۔ دنیا کی ہر نعمت اور دولت اُسے حاصل تھی۔

اور اس کے برعکس تارا۔ جسے بچپن میں ہر ایک نے قسمت والا کہا تھا۔ جسے اپنے پرائے سب چاہتے تھے۔ اب وہ تقدیر کے ہاتھوں ٹھکرائی ہوئی سسک سسک کر زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ قسمت کے لکھے کو انسان کا قلم نہیں بدل سکتا تارا کی زندگی کی کہانی کا صرف ایک آدھ باب خوشگوار تھا۔ آگے بس تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ چمن نے تارا کی روداد سنی۔ تو وہ خود بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔ اُسے تسلیاں دینے لگی۔

تارا تم پر کیا کیا بیت گئی۔ اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ لیکن اب پھر دوستی کا وہ ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے آگئی۔ چمن نے پیار سے کہا۔

دونوں کتنی دیر تک پچھلی باتیں دہراتی رہیں۔ چمن تو کچھ دیر کے لئے اس محلے میں بچپن کی یاد تازہ کرنے آئی تھی۔ اب تارا کے ساتھ مل جل کر اس طرح بیٹھی

کہ دھوپ کے سائے سنہری پڑ کے ڈوبنے لگے۔ تارا نے اس کے لئے چائے بھی کافی اہتمام سے تیار کی۔ چمن باورچی خانے میں اُس کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ چاندنی کے کالج میں تقریب تھی۔ اس وجہ سے وہ دیر سے آنے کا کہہ گئی تھی ۔۔ چمن تارا کو خدا حافظ کہہ کر دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ کہ چاندنی اُس وقت دروازے میں داخل ہوئی۔ چاندنی کو دیکھ کر چمن کے آگے بڑھتے قدم پھر تھم گئے۔ اس کی نظریں چاندنی کے چہرے پر تھم گئیں۔ تارا یہ تیری چاندنی ہے۔ چمن نے آگے بڑھ کر بے اختیار چاندنی کو گلے لگا لیا۔ اور چاندنی ایک اجنبی سی عورت کے محبت کے اس اظہار پر۔ حیران ہو کر کبھی ماں کی کبھی چمن کی صورت تکنے لگی۔

آخر یہ کون ہیں۔ ؟۔ یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ چمن تو بس چاندنی پر پل بھر میں فریفتہ ہو گئی تھی۔ تارا۔ تمہاری چاندنی نے اپنے نام کے ساتھ بے حد انصاف کیا ہے۔ یہ تو صورت کے لحاظ سے سچ مچ کی چاندنی ہے۔ چمن نے کھلے الفاظوں میں چاندنی کے حسن کی تعریف کی۔ تارا بیٹی کی تعریف پر مسکرانے لگی۔ اور چاندنی شرما گئی۔

اللہ میاں اس کا نصیب بھی صورت کی طرح چمکائے۔ چمن نے اُسے دعا دی۔ اور پھر چاندنی کو کچھ اور پیار کر کے تارا سے گلے مل کر پھر آنے کا کہہ کر رخصت ہو گئی۔

چاندنی کی حیرانی تارا نے چمن کے جانے کے بعد دور کی۔ وہ دیر تک اُس کو چمن کے بارے میں بتاتی رہی۔ چاندنی بھی خوش ہو گئی۔ کہ چلو اُس کی امی کی ایک ہمدرد سہیلی تو اس شہر میں آ گئی ہیں۔

چمن کو تو چاندنی کی من موہنی صورت بے حد پسند آئی تھی۔ وہ گھر آئی تو چاندنی کا حسن اس پر چھایا ہوا تھا۔ کسی زمانے میں تارا بھی سحر کن صورت کی مالک تھی۔ قدرت کا

شاہکار لگا کرتی تھی۔ لیکن اس کی بیٹی چاندنی تو تارا سے بھی دو قدم آگے نکل گئی تھی۔ لمبا قد۔ نازک سا جسم۔ خوبصورت نقش و نگار۔ اتنی بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ ستواں ناک اور ننھے منے تراشے ہوئے گلابی سے ہونٹ۔ یوں اس طرح لگتے۔ جیسے ہونٹوں کی جگہ کسی نے دو گلاب کی پتیاں چپکا دی ہوں۔ چمن تارا اور چاندنی کی ذات میں الجھ گئی۔ تارا کے دکھ اس کے دل کو چھو گئے تھے۔ پھر چمن اس عمر میں بھی حد درجے جذباتی تھی۔ بہت جلد فیصلے کر لیا کرتی تھی۔ اب اس کا دل ایک فیصلے پر جلد پہنچ گیا۔ اُسے ان دنوں اپنے بیٹے ساجد کے لئے حسین لڑکی کی تلاش تھی۔ ایسی لڑکی جو سچ مچ چاند سے مشابہت رکھتی ہو۔ اور آج من پسند لڑکی اُسے چاندنی کے روپ میں نظر آگئی تھی۔ ساجد کے لئے بالکل موزوں لگی۔

لیکن دوسرے پل اُسے تارا کی پوزیشن کا خیال آگیا۔ تارا غریب تھی۔ دوسروں کے کپڑے سلائی کر کے گذر بسر کر رہی تھی۔ وہ اونچے طبقے سے تعلق نہ رکھتی تھی۔

چمن۔ خوبصورت بہو کے ساتھ ساتھ۔ اونچا دولت مند گھرانہ۔ لاکھوں کا جہیز بھی چاہتی تھی لیکن اب چاندنی کے آگے اُسے کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ دیر تک سوچوں کے گرداب میں الجھی رہی۔ چمن کا اپنا میکہ بس کھاتے پیتے لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور وہ بیاہ کر سسرال گئی تو وہاں پیسے کی فروانی تھی۔ اس کے قدم رکھتے ہی سسرال کے یہاں پیسے کی اور فروانی ہو گئی۔ سب اس کو لکشمی کہتے تھے۔ اس کا قدم سسرال والوں کے لئے بہت مبارک ثابت ہوا تھا۔ پھر ایسی بہت سی مثالیں اس کے سامنے تھیں۔ کہ غریب کی لڑکی بیاہ کر دوسرے گھر گئی۔ اور دولت سے کھیلنے لگی۔ امیر کی دولت مند کے گھر گئی تو دولت مند ہی غریب ہوتے نظر آنے لگے۔ یہ تو سچ تھا۔ قسمت بنتے اور بگڑتے دیر نہیں لگتی۔

اپنے خیالات کا اظہار چمن نے اپنے میاں پر کر ڈالا۔ اُن کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا

بیٹا بھی صرف دولت کو اہمیت نہ دیتا تھا۔ ان کے نزدیک شرافت سب میں بڑی دولت تھی۔ راہ ہموار پاکر چمن کا دل بے حد مطمئن ہو گیا۔ اس نے چاندنی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ اپنی نظر میں اس نے اپنے کم رُو بیٹے کے لئے ہیرا ڈھونڈا تھا۔ آسمان کا چاند ڈھونڈا تھا چاندنی کے روپ میں۔ اُس نے اپنی پہلی فرصت میں تارا کے پاس جانے کا سوچ لیا۔

" ایک شام چمن تارا کے یہاں پھر پہنچ گئی اس سے کچھ مانگنے۔ ساتھ وہ مٹھائی کے ان گنت ڈبے بھی لائی تھی۔ جو اس کا ڈرائیور باہر آنگن میں رکھ گیا تھا۔ تارا کو چمن کے آنے کی بے حد خوشی ہوئی۔ لیکن چمن کے اس تکلف پر اُسے خوشی نہ ہوئی۔ وہ کسی کا احسان نہ لینا چاہتی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کی دولت مند سہیلی ترس کھا کر اس کے لئے یہ سب لے آئی ہے۔ "چمن اگر تم خالی ہاتھ مجھ سے ملنے آتیں تو مجھے زیادہ خوش ہوتی۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

"بس زیادہ باتیں مت کرو۔ میں یہ تھوڑی سی مٹھائی صرف اپنی خوشی کی خاطر لائی ہوں۔" چمن نے مسکرا کر کہا۔

تارا کچھ اور نہ بول سکی۔ چمن نے آتے ہی چاندنی کو تلاش کیا۔ چاندنی اندر کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اس کے امتحان عنقریب ہونے والے تھے اس وجہ سے ان دنوں وہ اکثر پڑھائی میں مصروف رہتی۔ تارا چمن کو اپنے ہمراہ اندر کمرے میں ہی لے آئی۔

گھر کے ملگجے سے لباس اور بکھرے بالوں میں بھی چاندنی کی صورت ماند نہ پڑتی تھی۔ چمن کی آمد پر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بڑے ادب سے اُسے سلام کیا۔

جواب میں چمن نے اُسے گلے لگایا۔ چاندنی تو کتابیں سمیٹ کر اپنی اتنی اچھی محبت کرنے والی خالہ کے لئے چائے بنانے باورچی خانے میں جا بیٹھی

اور چمن نے ایک دو ہی باتوں کے بعد۔ تارا پر اپنا مدعا ظاہر کر دیا۔ وہ چاندنی کی طلبگار بن کر آئی تھی۔

پل بھر میں تارا خواب کی سی کیفیت میں ڈوب گئی۔ اس کے کانوں نے کیا سنا تھا۔ اُسے یقین نہ آرہا تھا۔ اس کے لب ساکت ہو گئے۔ اور چمن اپنے بیٹے کی تعریف کرنے لگی۔ لاکھوں میں ایک ہے میرا ساجد۔ اعلیٰ ملازم۔ برفائز ہے۔ وہ اُسے بہت کچھ بتلانے لگی۔

لیکن خلاف توقع تارا خاموش تھی بالکل خاموش۔ ہونٹ وا کئے بس چمن کو تکے جا رہی تھی۔ چمن نے اُسے ایسی خوشی سے ہم کنار کر دیا تھا۔ کہ وہ سکتے کے عالم میں آگئی تھی۔ اور چمن کا دل اس کی گہری خاموشی پر الٹ پلٹ ہونے لگا۔ تارا تمہاری چاندنی پر میرا دل آ گیا ہے۔ میں خالی ہاتھ نہ جاؤں گی۔ تمہارا اقرار مجھے ان دیکھی نعمتیں بخش دے گا۔

اور اس پل تارا ہوش میں آگئی۔ "چمن مجھے یقین نہیں آرہا۔ کہ تم مجھ سے چاندنی مانگ رہی ہو۔ چاندنی اندھیرے گھر کی باسی ہے۔ اور چاندنی اندھیری راتوں کو ہی بھیجتی ہے تمہارے گھر میں دولت کی چمک ہے۔ چاندنی اس بڑے گھر کے قابل نہیں"۔ وہ غمزدہ ہو کر اُسے چاندنی کی حیثیت بتلانے لگی۔

"تارا۔ مجھے صرف چاندنی چاہیئے۔ اور کسی چیز کی مجھے نہ تمنا ہے نا ضرورت"۔

چمن نے پیار سے تارا کے کانپتے ہاتھ تھام لئے۔ "میرا دل نہ توڑنا۔ میں بہت مان لے کر تمہارے پاس آئی تھی"۔

تارا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک آگئی۔ "چمن میں تم کو اپنی چاندنی دے دوں گی وہ میری تمام تر خواہشات کا مرکز ہے۔ میں اُسے آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہی ارمان تو میری زندگی کے دن بڑھا رہا ہے۔ کہ چاندنی کو اس کے صحیح وطن

کو دے کر۔ میں بھی سکون سے مر سکوں۔ ورنہ شاید میری سانسیں زندگی کی ڈور سے یوں ہی الجھ کر مجھے اذیت بخشتی رہیں ۔خوشی کی خبر تارا کو دکھی کر گئی۔ اور چمن اس کے ساتھ رنجیدہ ہو کر اُسے سمجھانے لگی۔

چاندنی جب چائے لے کر آئی تو۔ تارا نے اس سے اپنے آنسو چھپا لئے۔ پھر وہ جبراً مسکرانے لگی۔ چمن نے چاندنی کو اپنے قریب بٹھالیا۔ مٹھائی تو وہ اپنے ہمراہ لے کر آئی تھی۔ ڈبے سے مٹھائی نکال کر اس نے پہلے چاندنی کا منہ اپنے ہاتھ سے میٹھا کرنا چاہا۔ وہ گھبرا گئی۔ گھبرا کر چمن اور پھر تارا کی طرف دیکھنے لگی۔

"چاندنی — تمہاری خالہ تمہیں خوشی سے کھلا رہی ہیں تو کھالو نا ان کے ہاتھ سے مٹھائی۔" تارا کے لبوں پر اس وقت بے حد پیاری سی مسکان تھی۔ چاندنی نے بے اختیار اپنا منہ کھول دیا۔ چمن نے چاندنی کو مٹھائی کھلا کر بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی —"بس تارا اب چاندنی میری امانت بن گئی"۔

چاندنی چونک پڑی — گھبرا کر وہاں سے کھڑی ہو گئی۔ پھر اُس سے چائے بھی نہ بنائی گئی۔ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں جا چھپی۔

"میں کسی کی امانت بن گئی — ؟"

اس کے دل نے سرگوشی کی۔ وہ آپ ہی آپ سب جان گئی سمجھ گئی۔ ایک انجانے سے تصور میں ڈوب گئی۔ وہ کون تھا۔ جس کی وہ امانت تھی۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ لیکن ایک ان دیکھی شکل جو کبھی کبھار۔ آپ اس کے ذہن میں بن جاتی تھی۔ اب پھر ذہن کے دریچوں سے جھانک کر اُسے ایک عجیب سی سرشاری میں ، ڈبونے لگی۔ اُس نے سکون سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

دل میں چپکے چپکے خوشی کے احساسات کروٹیں لینے لگے۔ ویسے سپنے دیکھنے کی اب اس کی عمر آگئی تھی۔ اب سپنے حقیقت کا روپ دھارنے والے تھے۔ وہ کسی کی ہونے والی تھی۔ اس کیفیت سے وہ اس وقت ابھری۔ جب چمن کے جانے کے بعد تارا نے اُسے پکارنا شروع کر دیا تھا ۔۔ وہ تارا کے پاس گئی تو۔ کچھ جھجھک رہی تھی۔ شرما رہی تھی۔ تارا کے پیلے چہرے پر آج اُسے ایک رنگ نظر آیا۔ مسرت کا سکون کا اطمینان کا۔ تارا نے اُسے قریب بٹھالیا۔

" پھر وہ اس کے بنا پوچھے اُسے بتانے لگی۔ چمن کی خواہش کے بارے میں۔ ساجد کی قابلیت کے بارے میں۔

چاندنی نظریں نیچی کئے سب کچھ سن رہی تھی۔ ساجد۔ ساجد۔ اسے یہ نام بھی بے حد پسند آیا۔ چمن منگنی کی رسم ادا کرنی چاہتی ہے۔ لیکن مجھے نوید کا انتظار ہے اس نے پچھلے خط میں لکھا تھا۔ کہ وہ جلد آنے والا ہے۔ پھر میں اپنا یہ ارمان خوب دھوم سے پورا کروں گی۔ اس نے چاندنی کا سر اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

ماں کے سینے میں منہ چھپا کر چاندنی کو رونا سا آگیا۔

لیکن تارا اس وقت خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

جیسے اس کے وجود پر سے کسی نے بھاری پتھر سرکا دیا ہو۔

اتفاق سے نوید دوسرے ہفتے ہی آگیا۔ تارا تو بے چینی سے اس کی منتظر تھی بھائی کی غیر موجودگی میں وہ چاندنی کی خوشی کی تقریب نہ کرنا چاہتی تھی۔ نوید آیا تو اس نے سب سے پہلے اُسے یہی خوشخبری سنائی۔

نوید بھی بے حد خوش ہوا۔ اُسے بھی چاندنی کی فکر لاحق تھی۔ خدا نے آپ ہی آپ کتنا اچھا حل ڈھونڈ دیا تھا۔ چاندنی بے حد اونچے گھر کی مانگ تھی۔ لیکن دولت مند اب نوید بھی تھا۔ اس بار اس نے ماں کے آگے نوٹوں کا ایک ڈھیر سا لگا دیا۔

تارا اتنے ڈھیر سے نوٹ دیکھ کر پھر مشکوک نظروں سے نوید کو تکنے لگی۔ "آخر تم ایسا کون سا کام کرتے ہو نوید ۔ ؟ ۔ جس میں آسانی سے اتنی دولت اکٹھی ہو جاتی ہے۔" وہ رک رک کر پوچھنے لگی۔

اس سوال پر نوید تھوڑا سا گھبرا گیا۔ لیکن دوسرے پل وہ زور سے ہنسنے لگا۔ "دن رات محنت کرتا ہوں۔ دن کو دن رات کو رات نہیں سمجھتا۔ اب میں نے ایک الگ کاروبار شروع کیا ہے۔ پہلی دفعہ جو منافع ہوا۔ وہ آپ کے آگے ہے۔ اس نے پھر جھوٹ بولا۔

تارا کے دل میں کھٹک سی ضرور تھی۔ لیکن وہ چپ ہو گئی۔ نوید نے ایک دوسری خبر سنا کر اُسے بے حد خوش کر ڈالا۔ "امی اب میں اس شہر میں ہی رہوں گا۔ عظیم انکل یہاں بھی آفس کھول رہے ہیں، وہ میں ہی سنبھالوں گا۔" وہ مگن سے لہجے میں بتانے

۲۹۴

لگا ۔

نوید کی جدائی سے تارا کتنی بے چین رہتی تھی۔ اب اس خبر سے وہ بالکل پرسکون ہوگئی۔ یہ دن اُسے اپنی زندگی کے بہترین دن محسوس ہوتے ۔

نوید اب بہت وسیع ذہن ہوگیا تھا۔ اب اس گھر میں وہ رہنا نہ چاہتا تھا۔ بقول اس کے کہ اس کا بڑے بڑے لوگوں سے ملنا جلنا تھا۔ اپنے کسی دوست کو وہ اس گھر میں بلانا اپنی ہتک محسوس کرتا۔ اب اُس کا اصرار گھر بدلنے کا تھا۔

وہ تارا سے یہی کہتا۔ کہ اب وہ اس قابل ہے۔ کہ کوٹھی اور بنگلے میں رہ سکے۔ پھر اس کی خواہش بھی یہ تھی۔ کہ چاندنی اس گندی سی گلی سے رخصت ہونے کی بجائے اعلیٰ گھر سے رخصت ہو۔ کیونکہ وہ بڑے گھر جا رہی تھی۔ وہاں جاکر اُسے اپنی ماں اور بھائی کی کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔

لیکن تارا کو نوید کی یہ باتیں اچھی نہ لگتی تھیں۔ وہ اپنا گھر نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ "نوید میری ساری زندگی اسی گندی سی گلی اور اسی گھٹے سے اندھیرے گھر میں گذری ہے۔ یہاں میری بہت سی یادگاریں دفن ہیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" تارا نے صاف انکار کر ڈالا ۔

لیکن نوید نے کب تارا کی بات مانی تھی۔ اُسے سمجھانے لگا۔ "گذرا وقت امی ماضی بن جاتا ہے ماضی کو بھول جانا اچھا ہے۔ یہاں سے نکل کر آپ خوش رہیں گی۔" وہ تارا کے سامنے طرح طرح کے دلائل پیش کرنے لگا۔

چاندنی بھی دوسرا گھر لینے کے حق میں تھی۔ یہ شکستہ سا گھر اُسے بالکل ناپسند تھا۔ اس گھر میں نہ سجاوٹ تھی۔ نہ کوئی ساز و سامان۔ پرانا بوسیدہ سا دو کوٹھری نما کمروں والا یہ گھر

چاندنی کو ہمیشہ اپنی پسماندگی کا احساس دلاتا تھا۔ جس گھر میں اس کی پوری زندگی گذری تھی اب تو یکایک خدا نے اس کی قسمت جگا دی تھی۔ کہ وہ بڑے گھر کی بہو بننے والی تھی اور اس کا بھائی بھی لاکھوں والا بن گیا تھا۔

چاندنی اور نوید نے تارا کو راضی کر لیا۔ وہ راضی ہوگئی۔ اس کی زندگی تو جیسی تیسی گذر چکی تھی۔ اب وہ بچوں کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ نوید نے ایک دو ہفتوں میں ہی حسب منشا بنگلہ ڈھونڈ لیا۔ شہر کے ماڈرن اور خوبصورت علاقے میں۔

نوید گھر کا پرانا ساز و سامان جو سچ مچ کاٹھ کباڑ کی شکل میں تھا وہاں نہ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر اس نے وہ گھر بند کر دیا۔ تارا اور چاندنی بس اپنے کپڑے لیتی آئیں۔ اپنا گھر چھوڑتے ہوئے تارا کا دل بے حد دکھ رہا تھا۔ وہ گھر جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ وہ تو اس کے بابل کا انگنا تھا۔ وہ جب فرید کے ہمراہ اس آنگن سے رخصت ہوئی تھی۔ تب بھی خوب روئی تھی۔ آج بیٹے کے ہمراہ وہ ترقی کی راہ پر جاتے ہوئے اس مکان کو چھوڑتے ہوئے بھی رو رہی تھی۔ انسان کا دل بھی کتنا حساس ہوتا ہے۔ پتھریلی دیواروں تک سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ایسی محبت تارا کو بھی اپنے گھر کی دیواروں سے تھی۔ دروازوں سے تھی۔ آنگن میں لگے نیم کے درخت سے تھی۔ باوجود ضبط کے وہ آنسو روک نہ پا رہی تھی۔

نوید ماں کے کمزور نحیف وجود کو اپنی مضبوط باہوں میں سمیٹ کر اُسے دلاسہ دینے لگا۔ چاندنی بھی ماں کو سمجھانے لگی۔ چاندنی کو تو یہ گھر چھوڑتے ہوئے اتنا کوئی خاص دکھ نہ ہوا تھا۔ ہاں دل میں خلش ضرور تھی اسکی آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی آگئی۔

تھی۔ ویسے اسے اس گھر کے اطراف بسنے والوں سے شکایت تھی۔ اس کا دل محلے والوں سے بے حد برا تھا۔ جب وہ بڑی ہوئی تھی۔ محلے والوں کی نظروں کا مرکز بن گئی تھی۔ کالج آتے جاتے۔ محلے کے گندے بدمعاش نما لڑکے اس کے پیچھے لگ جاتے۔ اُسے اُس گلی کا ماحول بہت گندہ لگتا۔

لیکن وہ دل میں گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ کسی سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ فاروق تو گلی کا غنڈہ بن چکا تھا۔

آتے جاتے چاندنی کرتا کا کرتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ یا فلمی گانے گانے لگتا چاندنی کا خون کھول جاتا۔ پھر وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ بے پردہ تھی۔ محلے کی عورتوں نے اس کی اس آزادی کو بھی بُری نظر سے دیکھا تھا۔ یہ سب محسوس کر کے چاندنی عمر بھر کے لئے ان گلیوں کے چکر سے فرار چاہتی تھی۔ اور اب اُسے فرار کا موقع مل چکا تھا۔

نوید اپنے کسی دوست کی کار مانگ لایا۔ ماں اور بہن کو اس میں بٹھا کر وہ نئی دنیا میں لے آیا۔ جاتے ہوئے تارا محلے والوں سے بھی نہ ملی۔ ایسا کون سا وہ اس سے اپنائیت کا برتاؤ کرتے تھے جو وہ سب سے کہا سنا معاف کروا کر جاتی۔ جبکہ ہر ایک نے خود اُسے رسوا کیا تھا۔ زخم دیئے تھے۔ سچ مچ ان کی وجہ سے اس نے شہید کو جبراً اپنی دنیا سے نکالا تھا۔

وہ زخمی خیالات کو دل میں بسا کر نئے گھر آگئی۔ نئی کوٹھی۔ بے حد خوبصورت تھی۔ روشن روشن کمرے ۔ شیشے کی طرح چم چم کرتی رنگ برنگے چپس لگی، زمینیں۔ شیشوں کے دروازے کھڑکیاں۔ اور دونوں طرف خوبصورت لان۔ چاندنی بے حد خوش تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا وہ سچ مچ جنت میں آگئی ہو۔ خوشی خوشی وہ ہر کمرے میں جھانکتی پھر رہی تھی۔ قلیل سے عرصے میں چھت تک پر ہوا آئی تھی۔

لیکن تارا گم سم تھی۔ بے حس سی بیٹھی کافی رنجیدہ سی لگ رہی تھی ۔ لیکن یہ اداسی وقتی تھی۔ دوسرے دن وہ بھی سنبھل گئی۔ چاندنی کے ساتھ مل کر گھر صاف کیا۔ نوید نے ایک ملازمہ کا بندوبست بھی کر دیا ۔ وہ نیا فرنیچر بھی لے آیا تھا۔

صوفہ سیٹ۔ ڈائننگ ٹیبل کرسیاں۔ قالین۔ پلنگ گھر سج گیا۔ غریب تارا اب ایک اچھے گھر کی مالکہ اور دولت مند بیٹے کی ماں تھی۔ جھونپڑے کو خیرباد کہہ کر محل میں آبسی تھی۔ لیکن گزرے دنوں کی تلخی اب بھی دل پر نقش تھی۔ اُسے سکون اب بھی نہ ملا تھا۔ اُسے اپنا وہی پرانا، اندھیرا اندھیرا گھر ہر لمحے یاد آتا۔ اُسے دولت کی ہرگز ہوس نہ تھی۔ لیکن اس کی اولاد اب اس چمک دمک پر مرنے لگی تھی۔

چاندنی کو اب نوید اس کی فرمائش پر سب کچھ لا دیتا۔ پیسوں کی ضرورت ہوتی وہ بھی ضرورت سے زیادہ دے دیتا۔ چاندنی تو بے حد خوش تھی۔ خوشی اور شادمانی اس کی ہر ادا سے ظاہر تھی۔ اس کی صحت نکھر گئی تھی۔ رنگت گلابی ہوتی جا رہی تھی۔ ہر دم بس اس کا ہنسنے ہنسانے کا دل چاہتا تھا۔ نوید اب مستقل اس شہر میں رہتا تھا۔ لیکن اکثر وہ کام کے سلسلے میں باہر بھی جاتا رہتا تھا۔ دن بھر بھی وہ کام کے سلسلے میں گھر سے غائب رہتا۔ رات بھی دیر سے آتا۔ کوٹھی کے سب سے کونے والے علیحدہ کمرے اس نے اپنے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ اکثر اس کے دوست احباب وہاں جمع رہتے۔ آدھی آدھی رات تک وہ اکثر وہاں رہتے سارے کے سارے حلیئے سے رئیس لگتے۔ ان کی بڑی بڑی کاریں باہر کھڑی رہتی تھیں۔ کوٹھی کے پچھلے کمرے کو نوید نے گودام بنایا ہوا تھا۔ اکثر وہ اس میں اپنا سامان لا کر رکھتا۔ یا پھر راتوں رات وہ سامان نکال کر دوسری جگہ بھیج دیتا۔ اس کمرے میں وہ ہمیشہ تالا ڈال کر رکھتا۔

"تارا نوید کی ان حرکتوں پر نظر رکھ کر پریشان ہو جاتی اس کے دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگتے۔ آخر نوید کس قسم کا کاروبار کرتا ہے۔ ؟ ۔ جو اتنی دولت کما لیتا ہے۔ اس کے اپنے ابا نے عمر بھر محنت کی۔ لیکن دولت مند نہ ہو سکے۔ فرید بھی اپنے پیچھے کچھ نہ چھوڑ کر گیا تھا۔ حالانکہ وہ پڑھا لکھا اور محنتی انسان تھا۔ لیکن نوید تو زیادہ تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔ پھر دولت کمانے کے یہ گر کہاں سے جان گیا۔ تارا بے حد الجھ جاتی ۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی نوید سے کچھ بھی نہ پوچھ سکی۔

"چمن کو تارا کی نئی رہائش گاہ کی خبر ملی تو وہ اُسے مبارک باد دینے چلی آئی — تارا کی زندگی کی اس تبدیلی پر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے بے حد خلوص سے تارا کو مبارکباد دی "خدا نے تمہارے دن پھیر دیئے۔ کتنا فرمانبردار بیٹا دیا ہے اللہ میاں نے تمہیں"۔ اس نے نوید کی خوب تعریف کی۔

چمن اب باقاعدہ چاندنی اور ساجد کی منگنی کا اعلان کرنا چاہتی تھی۔ اب بھی اس نے تارا سے یہ بات دہرائی — تارا کو کب انکار تھا — جلد منگنی کا دن مقرر ہوگیا۔ جمعے کا دن ایسے کاموں کے لیے مبارک ہوتا ہے۔ آئندہ جمعے کو چمن آنے کا کہہ گئی۔ تارا نے ہفتے بھر میں تمام تیاری مکمل کرلی۔ نوید ایک سے ایک بیش بہا چیزیں خرید لایا — دولہا کے لئے اعلیٰ سوٹ ہر قسم کا سامان۔ ہیرے کی انگوٹھی وہ ساجد کے لئے لے آیا۔

تارا تو بے حد خوش تھی۔ اُسے نوید پہ سارا گھر جا نار ہا۔ وہ منہ پر اس کی تعریف کرنے لگتی۔ "بھائی ہو تو نوید تجھ جیسا ہو — بہن کو باپ کی کمی نہ محسوس ہونے دینا۔ نوید۔" وہ دلگیر ہو جاتی۔

پھر اُسے چاندنی کی جدائی کا خیال بھی ستانے لگتا۔ "چاندنی چلی جائے گی تو پھر میں اکیلی رہ جاؤں گی یہ گھر سونا ہو جائے گا — پھر بس نوید تیری دلہن لے آؤں گی"۔

داہ دکھ بعد تارا کے دل میں بہلانے کی شدید خواہش تھی۔ حالانکہ نوید ابھی کم عمر

تھا اور نوید نے جب ماں کے منہ سے یہ بات سنی تو ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "دس برسوں تک میرا ایسا کوئی خیال نہیں۔" اس نے یہ بات ہنسی میں ٹال دی۔ اور تارا بھی اسے نوید کی ادا سمجھ کر ہنسنے لگی۔

نوید نے چاندنی کی منگنی پر بے حد بڑی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ اپنے تمام دوستوں ملنے جلنے والوں کو مدعو کیا تھا۔ تارا اپنے پرانے ملنے والوں کو بھی بلاوے دے آئی تھی نوید نے کوٹھی کو رنگ برنگے قمقموں سے سجوایا تھا۔ شامیانے لگوائے تھے۔ اعلیٰ قسم کے کھانے پکوائے تھے چمن بھی ڈھیر سے مہمانوں کو لے کر آئی۔ چاندنی کے لئے زیورات بھاری بھاری اور بہت کچھ لے کر آئی تھی۔ مٹھائی اور پھلوں سے کمرہ بھر گیا تھا۔ تارا خوش خوش کام کی مصروفیات میں گم تھی۔

لیکن بار بار اپنی تنہائی کا احساس ہو رہا تھا کاش اُس کا جیون ساتھی۔ چاندنی کا باپ اس وقت قریب ہوتا۔ تو پھر یہ خوشی کتنی بڑی خوشی بن جاتی۔ اُسے شہید کا خیال بھی آیا تھا۔ اس نے اُسے بلانے کو بھی سوچا تھا۔ وہ چاندنی کا چچا تھا۔ اس کا وارث تھا۔ چاندنی کی خوشی میں اس کی شرکت کا حق بنتا تھا۔ لیکن تارا نے شہید کو نہ بلایا۔ وہ پھر شہید پر اپنے گھر کے دروازے دوبارہ نہیں کھولنے چاہتی تھی۔

چاندنی دلہن بن کر بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ سنہرے کپڑوں میں اس کی چاند سی صورت جگمگ کر رہی تھی۔ بھاری زیورات اور گہرے گہرے میک اپ نے اُسے حور بنا دیا تھا۔ ہر کوئی دلہن کی خوبصورتی کی تعریف کر رہا تھا۔

لیکن تارا بیٹی سے دور دور تھی۔ اس خوشی کی گھڑی میں وہ اپنا سایہ بیٹی پہ نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ رات گئے تک ہنگامہ رہا۔

چمن بے حد خوش خوشی لوٹی تھی۔ اس کا اصرار تھا۔ بس اب وہ جلد ہی چاندنی کو اپنے گھر لے جائے گی۔

چاندنی کی منگنی کے بعد تارا بے حد مصروف ہو گئی تھی۔

اب وہ اکثر روز ہی بازار جاتی اور چاندنی کے جہیز کا سامان خرید کر لاتی۔ سلائی میں تو وہ خود ہی ماہر تھی۔ دوسروں کے کپڑے سیتے سیتے وہ اکتا گئی تھی۔ لیکن چاندنی کے کپڑے وہ بڑی محبت اور لگن سے تیار کر رہی تھی۔ دن بھر بھی مشین کے پاس بیٹھی رہتی تب بھی اُسے تھکن کا احساس نہ ہوتا۔ اور پھر نوید نے اُسے بجلی سے چلنے والی نئی مشین بھی تو لا دی تھی جو فر فر چلتی اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہوتا۔ چاندنی ان دنوں زیادہ تر پڑھنے میں گم رہتی۔ اُس کے ایف اے کے فائنل ہونے والے تھے۔

لیکن اُسے جب بھی وقت ملتا۔ وہ کام لے کر بیٹھ جاتی۔ جلد تارا نے چاندنی کے کتنے جوڑے تیار کر لئے۔ غرارے۔ کرتے۔ ساڑھیاں۔ چاندنی کے مستقبل کی مانند جگر جگر کرتے کپڑے۔ ان دنوں چاندنی بے حد مسرور تھی۔ ساجد کی چھوٹی بہن اُسے ساجد کی تصویر دے گئی تھی۔ اس کی منہ دکھائی کے طور پر۔ یہ مذاق بھی خوب تھا۔ لیکن چاندنی کا دل خود ساجد کو دیکھنے کا خواہاں تھا۔ تصویر صورت کا عکس ہوتی ہے ساجد تصویر میں اچھا خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ چاندنی نے تو فقط دل میں اُس ہی کو جگہ دی تھی۔ وہ اسے بے حد اچھا لگا۔

پہروں وہ اس کی تصویر دیکھتی رہتی۔ نہ جانے کیا کیا باتیں دل میں اس سے کرتی رہتی ہر گذرنے والا دن۔ اُسے ساجد سے قریب تر کئے جا رہا تھا۔

تارا نے بہت جلد اس کے جہیز کا آدھا سامان جمع کر لیا۔ بس دن بھر چاندنی

کے کام میں الجھی رہتی۔ کبھی سلائی کرتی نظر آتی۔ کبھی بازار کے چکر لگاتی۔ اور ڈھیروں چیزیں خرید لاتی — اب وہ چاندنی کو گھر کا کچھ بھی کام نہ کرنے دیتی — دن بھر خود تھکتی لیکن اس کا اظہار کبھی اس کے لبوں سے عیاں نہ ہوتا — ستا ستا چہرہ بتا دیتا — کہ وہ بے حد تھک گئی ہے۔

"نوید اب اکثر ہفتوں باہر رہنے لگا تھا۔ پچھلے ماہ بھی وہ پندرہ دن کسی کام کے تحت کراچی میں گذار کر آیا تھا — اور گھر پر صرف چار روز گذار کر وہ پھر ایک ماہ کے لئے باہر جا رہا تھا۔ ماں سے تو وہ کراچی کا نام لیتا۔ صحیح کبھی نہ بتاتا — کہ وہ جا کہاں رہا ہے

تارا کی سمجھ میں یہ ہر دوسرے ہفتے دوسرے شہر کے چکر...... نہ آتے۔ اُسے اب تک یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ اس کا بیٹا کیا کرتا ہے۔ کہاں اس کا دفتر ہے۔ کون سی اشیاء کا وہ کاروبار کرتا ہے۔ جو گھر میں دولت کی اتنی فراوانی ہے۔

اکثر اس نے نوید سے کاروبار کے بارے میں پوچھنا چاہا — نوید تو جھوٹوں کا استاد تھا — ماں کو مطمئن کر دیتا — اپنی باتوں سے — لیکن تارا کو پھر بوکھلاہٹ ہونے لگتی۔ آخر تمہارے کاروبار میں اتنا باہر جانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ ایک بار پھر اس نے نوید سے یہ پوچھ ڈالا۔

" اصل میں امی نعیم انکل کے دفاتر کراچی میں بھی ہیں۔ وہ ان دنوں بیمار ہیں۔ دفتر نہیں جا سکتے اس وجہ سے مجھے کراچی کا کاروبار بھی جا کر دیکھنا پڑتا ہے —" وہ سراسر جھوٹ بولتا —

اور تارا سوچنے لگتی اگر نوید سچ بول رہا ہے تو کیا دنیا میں ابھی ایسے فرشتہ صفت لوگ موجود ہیں۔ جو دوسرے کی اولاد کو اپنا کر اس کو سب کچھ بخش ڈالتے ہیں۔

"ماں کو سوچ کے گرداب میں ڈوبے دیکھ کر۔ نوید کمرے سے نکل جاتا۔ اُسے یہ خوف لاحق ہوتا کہ ماں پھر اس کی رگ پر ہاتھ نہ رکھ دے۔ اس سے کوئی اور سوال نہ کر ڈالے من گھڑت کہانیاں سنا سنا کر وہ پریشان سا ہو گیا۔

کبھی اس کا دل چاہتا اپنی فرشتہ خصلت معصوم ماں کو سب بتا ڈالے کہ تمہارا بیٹا بظاہر پرسکون دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا سکون لٹ گیا ہے۔ وہ مختار نہیں۔ وہ ایک کھلونا بن گیا ہے۔ جو چابی بھرنے سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح اشفاق اور دوسرے لوگوں کے حکم پر اس میں بھی چابی سی بھر جاتی — وہ خطرناک کام کرنے پر دل سے تو نہیں ہاں بے دلی سے آمادہ ضرور ہو جاتا۔

لیکن وہ ماں کو کچھ نہ بتا سکا۔ اُسے احساس تھا۔ اس کی ماں پھر اس کی دولت کو ناجائز قرار دے کر۔ اس کو بھی ٹھکرا دے گی۔

وہ سچ مچ ماں کی فطرت سے ڈرتا تھا۔

چاندنی کے امتحان ختم ہونے سے قبل ہی چمن شادی کی تاریخ مقرر کر گئی ـ اگلے چاند کی چڑھتی تاریخوں میں وہ ساجد کی بننے والی تھی ـــ بے حد قلیل عرصہ رہ گیا تھا ـ اس مدّت میں تارا کی مصروفیات دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھیں ـــــ

"چاندنی ان دنوں نہ جانے کیوں بے حد اداس رہنے لگی تھی ـــ اپنے جانے کے بعد اُسے اپنی امی کی تنہائی کا خیال بے حد ستاتا ـــ نوید تو ہفتوں گھر سے غائب رہتا ـ اب بھی وہ ہفتے سے کراچی گیا ہوا تھا ـــ بعد میں امی کتنا پریشان ہوا کریں گی ـــ وہ یہ سب سوچ کر آنسو بہانے لگتی ـــــ

ان دنوں اُس کے امتحانات شروع ہو چکے تھے ـــ دن رات کی محنت نے اُسے حد درجے تھکا دیا تھا ـــ امتحان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئے ـ لیکن نوید نہ آیا ـ شادی میں بس دس پندرہ دن رہ گئے تھے ـــ اتنے ڈھیر سے کام ابھی باقی تھے ـــ جو نوید کو ہی کرنے تھے ـــ تارا کے بس میں جو تھا وہ تو کر ہی چکی تھی ـــ اُسے شدت سے نوید کا انتظار تھا ـــ نوید نے کراچی کا صحیح پتہ تو اب تک نہ بتایا تھا ـــ ہاں اُس نے پوسٹ بکس نمبر ماں کو دے دیا تھا ـــ اس نمبر پر تارا نوید کو کتنے خط لکھ چکی تھی ـــ تمام حالات سے آگاہ کر چکی تھی ـــ لیکن نہ ہی نوید نے اُس کے خط کا جواب دیا تھا اور نہ وہ آیا تھا ـــ اب تو تارا کی پریشانی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی ـ رات بھی اُسے نیند نہ آتی تھی

اُس صبح اُس کی آنکھ کھُلی تو اس کا دل بے حد پریشان تھا —— رات بے حد بُرا خواب دیکھا تھا —— وہ جب بھی بُرا خواب دیکھتی اُس کی تعبیر کوئی آفت ہے کہ اُس پر نازل ہو جاتی - دل کو بہلانے کے لیے وہ دیر تک عبادت کرتی رہتی —— دل کے سکون کے لیے دعا مانگتی رہی لیکن ہلچل مچاتا دل نہ ٹھہرا —— جائنماز تہہ کر کے وہ چائے تیار کرنے کچن میں آگئی —— ابھی اُس نے چُولہا جلایا ہی تھا کہ چاندنی اُس کو پکارتی ہُوئی آگئی ——

"امّی — ا — امّی — ا! — امّی —" چاندنی کا چہرہ دُھلے کپڑے کی مانند سفید ہو رہا تھا —— وہ کانپ رہی تھی —— ڈول رہی تھی —— اُس سے اپنے قدموں پر چلا بھی نہ جا رہا تھا ——

"کیا ہُوا چاندنی —؟" —— تارا اُس کی اس کیفیت پر خود بھی حوصلہ ہارنے لگی —— لیکن چاندنی تو بس تھر تھر کانپے جا رہی تھی —— اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل رہا تھا وہ گھر رہی تھی —— تارا نے آگے بڑھ کر اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا —"کیا ڈر گئیں چاندنی؟ کیا ہُوا —" وہ اُسے پیار سے سینے سے لگا کر پُوچھنے لگی ——

"امّی — امّی —" چاندنی کی آواز بے حد کمزور تھی —"نوید بھیّا"— وہ اچانک رونے لگی — روتے روتے بے حال ہو گئی ——

نوید —— یاد تو تارا کو بھی آ رہا تھا —— اُس نے شاید یہی سمجھا چاندنی نوید کی یاد میں ہی رو رہی ہے —— وہ خود بھی رونے لگی — ویسے جیسے جیسے چاندنی کی شادی کی تاریخیں قریب آ رہی تھیں —— وہ حد درجے اداس ہو رہی تھی — اکثر اُسے رونا آنے لگتا تھا ——

"نوید چلا آئے گا بیٹے —— تارا چاندنی کو سینے سے لگائے ہُوئے سہارا دے کر

اندر کمرے میں لے آئی ——

"نہیں — نہیں — امی اب نوید بھیا نہیں آئیں گے —" وہ زور زور سے رونے لگی ——

چاندنی بہک رہی تھی — الٹی الٹی باتیں کر رہی تھی — تارا بے حد پریشان سی ہو گئی ——

"چاندنی اپنے آپ کو سنبھالو — نوید انشاءاللہ چلا آئے گا ——" وہ برابر چاندنی کو تسلی دے رہی تھی ——

"نہیں — نہیں — امی —" چاندنی نے پھر سر کو جھٹک کر انکار کیا ——

"ایسی بد فال منہ سے نہ نکال چاندنی — تارا کو غصہ سا آ گیا ——

ٹھہریئے امی آپ کو بھی حقیقت کا علم ہو جائے گا" وہ کانپتے ہوئے قدموں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی —— واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں اخبار تھا —— جس کو چاندنی نے جذباتی حرکت کرتے ہوئے مسل ڈالا تھا —— یہ مڑا تڑا اخبار چاندنی نے تارا کے سامنے کر دیا — تارا کی نظریں پہلے صفحے پر رُک گئیں —— پھر اُس کی حالت تو چاندنی سے بھی غیر ہو گئی — ہاتھوں میں اخبار تھر تھرانے لگا —— آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا تھا لیکن پھر بھی اُس کی نظریں اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی اپنے مجرم بیٹے نوید کی تصویر پر ٹک گئیں جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور وہ دو تین پولیس والوں کے حصار میں مجرم بنا نظریں جھکائے کھڑا تھا —— ساتھ یہ خبر بھی تھی — پولیس نے مشہور اور مفرور اسمگلر نوید فرید کو رات زبردست تعاقب کے بعد اُس کے ناجائز سامان اور چند ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا —— خبر کافی بڑی تھی — لیکن جو کچھ تارا نے پڑھ لیا تھا — وہی کافی تھا — اُس کا دماغ گردش کھانے لگا — وہ پختہ فرش پر گر پڑی — اُس کے سر سے خون بہنے لگا — ماں کی یہ حالت دیکھ کر چاندنی کے اور ہوش گم ہو گئے — وہ بلند آواز میں رونے لگی — گھر کا

کام کرنے والی ملازمہ اس وقت تک آ چکی تھی اس نے ہی تارا کو چاندنی کے ساتھ مل کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ ہی ڈاکٹر کو بلا لائی ڈاکٹر اس کی حالت سمجھ گیا۔ کہ وہ کسی زبردست صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ اُسے سکون اور نیند کا انجکشن دے گیا۔ دوائیاں بھی اس کے لئے ایسی تجویز کیں جو اعصاب کو سکون بخشتی ہیں۔ انجکشن کے اثر سے تارا دوپہر تک غافل رہی۔ اور چاندنی اس کے سرہانے بیٹھی روتی رہی۔

”تارا ہوش میں آ کر بھی۔ چپ رہی۔ حالات نے اس کو دکھ دے دے کر اُس کا دل چھلنی کر دیا تھا۔۔ ان گنت چھید تھے اُس کے دل میں۔ لیکن دل پھر بھی کام کرنا بند نہ کرتا تھا۔

کتنا ڈھیٹ تھا اس کا دل۔ زیست کے یہ اندھیرے اب اس کی زندگی میں سے اجالے کی ہر رمق چھین کر لے گئے تھے۔ وہ نا سمجھ ذرا سی خوشی سے یہ سمجھ بیٹھی تھی۔ کہ دکھ کی طویل رات بس اب ختم ہو گئی۔ اب اجالے کا سفر شروع ہو چکا ہے لیکن یہ اجالا۔۔ اب پھر گہرا اندھیرا بن گیا تھا۔

وہ ایک مجرم بیٹے کی ماں تھی۔ جو سماج دشمن تھا۔ ناجائز کاروبار کرتا تھا۔ حرام کی دولت کماتا تھا۔۔ اور یہ ہی حرام کی دولت اُس کی خوشحالی کا سبب تھی۔ وہ اتنے عرصے ناجائز دولت کے بل بوتے کس طرح سکون پاتی رہی۔ اس کا اپنا دل اُسے ملامت کرنے لگا۔

”نوید نے اسکی بچی کھچی عزت کا سرِ بازار نیلام کر ڈالا تھا۔۔ لوگ پھر مجھے باتوں کا نشانہ بنائیں گے۔ انگلیاں اٹھائیں گے مجھ پر۔۔۔ مجھے تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ یہ کیا کیا نوید۔ تو نے کیا کیا“۔

"مجھے کب دولت کی تمنا یا ہوس تھی۔ میں نے تجھ سے کچھ نہ مانگا تھا" وہ آپ سے بول بول کر رونے لگی۔ رونے میں چاندنی بھی مستقل اُس کا ساتھ دے رہی تھی — ذرا سی دیر میں تارا کو اس سجے سجائے گھر سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ ویسے بھی اس گھر میں آکر وہ فطری طور پر خوش نہ ہوئی تھی — لیکن بہل ضرور گئی تھی۔ اب اس کا دم اس وسیع روشن کمرے میں گھٹنے لگا۔

"چل چاندنی — اپنے اُس ہی گھر میں لوٹ چلیں۔ یہ گھر حرام کی دولت کے سہارے بنا ہے۔ حرام کی کمائی حلال کھانے والوں کو راس نہیں آتی" وہ ایسی باتیں کر کے خود بھی روتی رہی۔ اور چاندنی کو رلاتی رہی۔

"میں نے کب کچھ مانگا تھا نوید سے کب کچھ مانگا تھا۔؟" — وہ کبھی بکنے لگتی کبھی رونے لگتی۔ اس طرح شام ہو گئی — وہ دونوں صبح سے بھوکی تھیں۔ اور نہ ہی ان کو بھوک اور پیاس کا احساس ہوا تھا — اس غم نے جو سحر نے ان کو بخشا تھا۔ وہ ساری حس مٹا گیا تھا — غم نے کسی اور خواہش کو جگہ ہی نہ دی تھی۔

رسوائیوں کے خوف سے تارا کا دل کچھ اور سہما جا رہا تھا نہ جانے کیا ہو۔ کیا ہو — اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی اور المیہ بھی ہونے والا ہے۔ یہ صحیح ہے نا انسان کی چھٹی حس آنے والی آفت سے اُسے پہلے خبردار کر دیتی ہے۔ اب تارا کو چاندنی کی قسمت کی سنہری دھوپ بھی ختم ہوتی لگ رہی تھی۔ کیونکہ یہ خبر چھپنے والی نہ تھی۔ سارے اخباروں نے مع نوید کی تصویر کے اس خبر کو شہ سرخیوں میں جگہ دی تھی ———

اور چمن کے گھر میں بھی صبح سے ایک سکوت سا طاری تھا۔ سب کے دلوں

میں ہلچل برپا تھی۔ یہ خبر ان کے لئے بدنامی کا باعث تھی۔ ان دنوں ساجد بھی چھٹی لے کر آیا ہوا تھا۔ چمن نے ہی اُسے شادی کی تیاری کی خاطر بلا رکھا تھا۔

اب ساجد نوید کو مجرم کے روپ میں دیکھ کر بھڑک گیا تھا۔ وہ حکومت کا وفادار تھا۔ ایمان داری کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اور نوید بے ایمان تھا — مجرم تھا — اور یہ سب کچھ تھا اور بھی برائیاں اُس میں موجود ہو سکتی تھیں۔ ساجد بھڑک گیا تھا۔ وہ ایک بدنام خاندان میں شادی کرنا نہیں چاہتا — چمن کے میاں نے بھی اب اس رشتے کی مخالفت کی — تم نے نہ خاندان دیکھا۔ نہ شرافت بس لڑکی کی صورت پر مر مٹیں۔ ہمیں تو عزت دار گھرانہ چاہیئے۔

"ہم حلال کھانے والے ہیں۔ ہمارے خاندان میں کسی نے آج تک جیل کی صورت نہیں دیکھی ہم مجرم لوگوں سے کوئی واسطہ بھی نہیں رکھنا چاہتے"۔ سب ایک طرف تھے۔

چمن خود نادم تھی۔

منگنی تو کچا رشتہ ہوتی ہے۔ توڑی بھی جا سکتی ہے۔ چمن نے الزامات سے بری ہوتے ہوئے جس طرح جلدی چاندنی کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح رشتہ توڑنے کا بھی جلد سوچ لیا۔ ویسے اُس کا دل نوید کی گرفتاری سے تارا سے بھی برا ہو گیا تھا۔ وہ تارا کو بھی نوید کا شریک تصور کر رہی تھی — اس کے جذبات پل بھر میں محبت کے بجائے نفرت میں تبدیل ہو گئے تھے۔

"شکر ہے۔ کہ کوئی نیکی کام آئی۔ اور پہلے سب کچھ ہو گیا — ورنہ لوگ ہم پر ہی انگلیاں اٹھاتے"۔ ساجد نے کہا۔

چمن کو تارا کے دکھوں کا خیال بھی آ رہا تھا - اور وہ اُسے قصوروار بھی لگ رہی تھی - اس نے تو صرف چاندنی کو پسند کیا تھا - مال و دولت کی اُسے پروا بھی نہ تھی۔ اور نہ جہیز کی تمنا - لیکن پلک جھپکتے ہی تارا کے گھر دولت آ گئی تھی - اس کے رہن سہن کے انداز بدل گئے تھے ۔۔۔ اچانک اس رونق کو دیکھ کر چمن کچھ کھٹکی تھی - لیکن وہ خوش بھی تھی ۔۔ کہ اب اس کے خاندان والے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس نے چھوٹے گھر میں لڑکے کا رشتہ کیا ہے ۔

منگنی میں ہی نوید نے کیسی دھوم دھام کی تھی ۔

تارا نے چمن کے بغیر پوچھے اُسے بتا ڈالا تھا - کہ نوید کسی دولت مند آدمی کے کاروبار میں حصہ دار ہے - اب چمن کو تارا کی تمام باتیں جھوٹ لگ رہی تھیں - وہ سوچ رہی تھی تارا نے آپ جان کر بیٹے کے گناہوں پر پردہ ڈالا ۔۔ لیکن گناہ عمر بھر چھپا نہیں رہتا - وہ ظاہر ضرور ہو جاتا ہے - اس طرح تارا بھی اب گناہ گار تھی ۔

ساجد نے منگنی کی انگوٹھی اتار کر ماں کے آگے ڈال دی - ایمان دار آدمی آسانی سے ہیرا نہیں خرید سکتا - اس وقت اس کو یہ انگوٹھی زہر میں بجھی ہوئی لگ رہی تھی ۔

ساجد کا دل بہت جلد چاندنی سے واسطہ توڑنے پر راضی ہو گیا تھا - پھر اُسے چاندنی سے ایسا کون سا لگاؤ تھا ۔۔ اس نے تو اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی تھی - ہاں اس کی خوبصورتی کے چرچے ضرور سنے تھے - لیکن ساجد صرف خوبصورتی کو زندگی کا معیار نہ سمجھتا تھا ۔

بیٹا راضی نہ تھا - میاں راضی نہ تھا ۔۔ تو پھر چمن کس طرح یہ رشتہ قائم رکھتی۔

اس نے چاندنی سے ساجد کا رشتہ دل میں توڑ ڈالا — اور اس کا اظہار وہ تارا پر کرنے دوسرے ہی دن — منگنی پر دی گئی چیزیں اور انگوٹھی لے کر اپنی شاندار سی موٹر میں سوار ہو کر تارا کے گھر پہنچ گئی — کال بیل بجانے پر دروازہ چاندنی نے ہی کھولا — چاندنی کا چہرہ اس کے دل کے غم کا ترجمان بنا ہوا تھا — وہ بے حد کملائی ہوئی لگ رہی تھی۔ چمن کے تو تیور بدلے ہوئے تھے۔ چاندنی کو وہ ہمیشہ گلے لگا کر پیار کیا کرتی تھی لیکن آج اُس نے اس کے سلام کا جواب تک نہ دیا۔

تیوری پر گہرے بل ڈال کر تارا کا پوچھا۔

چمن کے اس انداز پر چاندنی سہم گئی۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ رندھی ہوئی آواز میں اس نے چمن کو کمرے میں جانے کو کہا — اور خود اپنے آنسو چھپاتی ہوئی دوسری طرف چلی آئی — دو دن سے اُس نے صحیح طور پر کچھ نہ کھایا تھا۔

اب چمن آئی تھی۔ وہ تو خاص تھی اس گھر انے کے لئے۔ چاندنی اس کے لئے چائے بنانے کچن میں آگئی۔

چمن نے تارا کے کمرے میں قدم رکھا تو تارا اس ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ تو چمن کو اپنا ہمدرد اور غم خوار سمجھتی تھی — ایک ہمدرد کی صورت سامنے پا کر اس کا دل بھر آیا — وہ رونے لگی۔

چمن کے تاثرات ابھی اس سے چھپے ہوئے تھے۔ اُسے کیا پتہ تھا۔ چمن تو اس پر کچھ اور ظلم ڈھانے آئی ہے — لیکن وہ تو اُسے اب بھی پہلے جیسا پر خلوص سمجھ رہی تھی چمن تارا سے کافی فاصلے پر بیٹھ گئی — تارا کے آنسوؤں کا اُس پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ تلخ سے لہجے میں تارا سے مخاطب تھی۔

"اب آنسو بہانے سے کیا فائدہ — تم نے پہلے یہ کیوں نہ سوچا۔ کہ برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے"۔

"کیا —" تارا کا دل چمن کی اس تلخ کلامی پر دکھنے لگا۔ پھر بھی ہمت کر کے بولی زبید نے مجھے کتنی بڑی بے عزتی سے ہمکنار کر ڈالا — چمن مجھے اس کے کرتوتوں کی کیا خبر تھی — اگر خبر ہوتی — تو — پھر میں اُسے عمر بھر کے لئے خود سے دور کر دیتی۔ کبھی صورت بھی نہ دیکھتی اس کی"۔

لیکن چمن اب بھی تارا کی باتوں کو جھوٹ سمجھ رہی تھی۔ منہ بنا کر پھر اُس نے کٹے کٹے لہجے میں کہا۔ "یہ تو یقین کرنے والی بات نہ ہوئی تارا کہ بیٹا دولت سے گھر بھرتا رہا اور تم بے خبر رہیں!"

تارا گنگ سی ہو گئی — اس کی زبان نے جیسے ساتھ چھوڑ دیا۔

چمن تو خطرے کا نشان بن کر آئی تھی — وہ حواس باختہ سی ہو کر صرف اُس کی صورت تکنے لگی۔ اور چمن اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگی۔

"تمہارے ساتھ ہم پر بھی لوگ کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ کہ بیٹے کا رشتہ کن لوگوں میں جوڑا ہے۔ ہماری عزت پر بھی تمہاری وجہ سے حرف آ گیا۔

سب کی نظریں الگ دوستوں کے سامنے نیچی ہوئیں — کہ خوب مجرموں سے ناطہ جوڑا ہے۔ چمن کی زبان تو تیر پہ تیر برسا رہی تھی۔ پیچ مچ کا زہر اگل رہی تھی۔ جو تارا کی رگوں میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

وہ صرف چمن کی سن رہی تھی۔ اپنا کہنے کو اس کے پاس کیا دھرا تھا — وہ اپنی صفائی بھی پیش نہ کر سکتی تھی۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ تمہاری دولت کا بھرم پہلے کھل گیا۔ بعد کو کچھ ہوتا تو ہم بھی تمہارے ساتھ گھسٹتے پھرتے۔"

چمن کی اس بات پر تارا تڑپ گئی۔ اُس کی چاندنی کے ہاتھوں میں مہندی کا رنگ چڑھنے میں صرف چند دن باقی تھے۔ لیکن چمن کی باتیں آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی تھیں — وہ طوفان جو چاندنی کا نصیب اپنے ساتھ لے کر جانے والا تھا۔ تارا پھر چمن کے آگے قسمیں کھانے لگی۔

میں لاعلم تھی چمن — میں نے کبھی دولت کی تمنا نہیں کی — اپنے بچوں کو محنت کی چکی میں پیس کر جوان کیا۔ مجھ میں اب بھی اتنی محنت اور ہمت تھی۔ کہ میں اس محنت کے سہارے اپنی باقی ماندہ زندگی گذار سکوں، بیٹے کی باتوں اور محبت نے اندھا ضرور کر دیا تھا۔ وہ چمن کے آگے سچ مچ گڑگڑانے لگی۔ لیکن چمن تو اپنا دل پتھر بنا کر آئی تھی۔ بس نہ سکی۔

"خیر جو ہونا تھا سو ہوا — اچھا یا بُرا — ہمیں اس سے کیا — کیونکہ میں تمہاری امانت واپس لوٹانے آئی ہوں"۔ اُس نے اپنے خوبصورت سے ہینڈ بیگ میں سے انگوٹھی کی ڈبیہ نکال کر تارا کے آگے رکھ دی —

انگوٹھی کی واپسی — ہر بات عیاں کر گئی — بدنصیب تارا کی بیٹی کو بھی زیست کے اندھیروں نے نگل لیا تھا — وہ رحم کی بھیک چمن سے نہ مانگ سکی — پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسلسل چمن کو تکے گئی۔

چمن کار سے اور چیزیں بھی نکلوا لائی۔ یہ ساری سنبھال لینا۔ اس نے کھڑے کھڑے کہا۔ آج ہمارے اور تمہارے درمیان کے سارے ناطے ٹوٹ گئے تارا —

چمن کی آواز اس وقت کچھ دھیمی سی پڑ گئی تھی۔

تارا کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل رہی تھی ۔ کہ اس نے دیکھا چاندنی چائے کی ٹرالی لئے چلی آ رہی ہے ۔ لیکن چمن رکی نہیں اس کی نظر میں اب اس گھر کا دانہ پانی اس پر حرام تھا ۔ کھٹ پٹ کرتی ۔ چاندنی کے ارمانوں کو کچلتی ۔ کار میں بیٹھ کر چلی گئی ۔

اور چاندنی فق صورت لئے جب تارا کے کمرے میں داخل ہوئی تو ۔ سامنے چمن کی لٹائی چیزیں پڑی تھیں ۔ ان چیزوں نے اُس کے بنا پوچھے اور بغیر کسی کے بتائے اُسے سب کچھ سمجھا ڈالا ــ لیکن وہ بہت صبر مند لڑکی تھی ۔ منہ سے ایک آہ بھی نہ نکلی ۔ ہاں دل ضرور رو رہا تھا ــ اس نے کبھی موت کی تمنا نہ کی تھی ــ لیکن آج اس کا دل اس دنیا سے یوں بیزار ہوا تھا ۔ کہ مستقل اسی سے یہ کہہ رہا تھا ۔

کاش موت کا بھولا بھٹکا فرشتہ اس وقت ادھر آ نکلے ۔ اور وہ اس کے پیروں میں منہ چھپا کر سو جائے ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۔

نوید کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ وہ مع اپنے ناجائز سامان کے گرفتار ہوا تھا۔ روز ہی اس کے بارے میں اخبارات میں خبریں آ رہی تھیں۔ اس کا تعلق بین الاقوامی اسمگلروں کے گروہ سے بتایا جاتا تھا۔ وہ کس کی پشت پناہی میں کام کرتا تھا یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ اشفاق کا نام اب بھی نہ آیا تھا۔ مجرم وہ تھا۔ پکڑا گیا تھا نوید۔ جو اس کا نمک خوار تھا۔ وفادار تھا۔ حلف اٹھایا تھا اس نے اشفاق کے سامنے کہ اگر برے وقت میں گرفتار ہوا جب بھی اشفاق یا اس کے کسی اور ساتھی کا نام اس کی زبان پر نہ آئے گا۔ اس عہد کو نوید نے نبھا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا اشفاق کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ جیل میں بھی آسانی سے اپنے خطرے کے تحت اسے ختم کروا سکتا تھا۔ نوید نے ہر جرم اپنے سر لے لیا تھا۔

"ایک لمحے میں تارا پر قیامت ٹوٹ گئی تھی۔

بیٹا جیل میں تھا۔ بیٹی کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور پھر نوید کی کوٹھی پر پولیس نے چھاپا مار کر ہر چیز ضبط کر لی تھی۔ تارا اور چاندنی اپنے صرف چند جوڑے لے کر پھر لٹے پٹے حال میں واپس پرانے گھر میں آ گئی تھیں۔ وہ دن کو ان کی زندگی میں چاندنی رات آئی تھی۔ پھر اب ہر سو اندھیری رات تھی۔ محلے والوں نے عجیب سی نظروں سے دونوں ماں بیٹیوں کا استقبال کیا تھا لیکن کوئی تارا کو تسلی دینے نہ آیا تھا۔ اور تارا کو کسی کی ہمدردی

کی ضرورت تھی بھی نہیں۔

نوید دوسرے شہر کی جیل میں تھا۔ فاصلہ طویل تھا۔ ناتواں تارا جوان بیٹی کے ہمراہ بغیر کسی آسرے کے اس سے ملنے جا بھی نہ سکتی تھی۔

پھر نوید پر مقدمہ چلا۔ کوئی دوست ساتھی کوئی اس کے کام نہ آیا سب اسے کانٹا سمجھ کر اپنا دامن بچا گئے۔ کسی نے نوید کی ضمانت نہ دی۔ اور نوید جیل سے باہر نہ آسکا۔ تارا خود کنگال تھی جو دولت تھی وہ بھی گھر کے ساتھ قرق ہو گئی تھی۔ ارمانوں سے بنایا ہوا چاندنی کا جہیز، زیور، جوڑے سب کچھ وہ وہیں چھوڑ آئی تھیں لیکن آتے وقت تارا شہید کی دی ہوئی گلابی ساڑھی ضرور واپس لے آئی تھی۔ وہ یہ ساڑھی بے حد احتیاط سے رکھتی حالانکہ اس نے اسے ایک بار بھی نہ پہنا تھا۔

اب مصیبت کے وقت اسے پھر بے اختیار شہید یاد آ رہا تھا۔ وہ ضرور میرے کام آئے گا۔ تارا کے دل کو پختہ یقین تھا۔ وہ چاندنی کی نظروں سے چھپ کر شہید کے پاس پہنچی۔ لیکن مایوس لوٹی۔ شہید کافی عرصے سے ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور فی الحال اس کے آنے کے کوئی امکانات بھی نہ تھے۔

تارا کا دل اب مصائب برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ زہر لے کر خود بھی کھائے اور چاندنی کو بھی کھلا دے۔ نجات کی اسے یہ راہ نظر آتی تھی لیکن مرنا یا مارنا آسان تو نہیں ہوتا۔ تارا نہ خود مر سکی اور نہ ہی چاندنی کو مار سکی۔ حالانکہ چاندنی بھی اب ماں کی سوچوں کے زاویوں کو اپنا چکی تھی اس کی ہر سوچ میں محرومی چھپی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی ویران تھی ہر سو خزاں کا دور دورہ۔ اس کی ان خوشیوں نے کب کا دم توڑ دیا تھا جو اس کا مستقبل اسے

دینے والا تھا۔ ساجد کی تو ان ہی تاریخوں میں اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے شادی ہو چکی تھی۔ جن تاریخوں میں چاندنی دلہن بننے والی تھی لیکن جوڑ تو قسمت بناتی ہے چاندنی اور تارا گلہ کس سے کرتیں۔ قسمت تو ایک ان دیکھی شے کا نام ہوتا ہے ۔ وہ دونوں دن رات اب نوید کی رہائی کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھیں۔

لیکن بدنصیبوں کی دعائیں کب عرش پر پہنچتی ہیں ۔ نہ کوئی دوا قبول ہوئی اور نہ کوئی کام آیا۔ نوید پر مقدمہ چلا ۔ فیصلہ ہو گیا اس کے خلاف ۔ نوید کو سزا ہو گئی۔ بارہ سال کی قید بامشقت ۔ یہ خبر بھی اخبار میں آئی تھی ۔ تارا اور چاندنی بری طرح تڑپ رہی تھیں ۔ لیکن اس تڑپ کا کوئی علاج بھی نہ تھا ۔ بارہ سال ۔ کس نے دیکھے تھے اپنے اندر کتنی وسعت رکھتے تھے یہ سال ۔ بیوگی کے انیس بیس سال تارا نے کس مصیبت سے کاٹے تھے ۔ اس کے وجود میں جان نہ رہی تھی ۔ اب نوید کے انتظار میں یہ بارہ سال کس طرح گذریں گے ۔ اس کا دم تو ابھی سے آنکھوں میں آ گیا تھا ۔ اتنے عرصے تک اپنے زندہ رہنے کی تو تارا کو بالکل امید نہ تھی لیکن بیٹے کی بربادی پر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا ۔ نوید کی جوانی کے بارہ سال جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے سسک سسک کر قید تنہائی میں گذریں گے جوانی تو امنگوں سے بھری رات کی مانند ہوتی ہے ۔

کتنی خواہشات دل میں جنم لیتی ہیں ۔ یہ دور تو عمر کا سب میں خوشگوار دور ہوتا ہے لیکن نوید ۔ اپنی عمر قید میں کاٹ دے گا ۔

نہ دلہن آئے گی ۔ نہ بارات جائے گی ۔ نہ اس کے دل میں رونق ہو گی ۔ کچھ بھی تو نہ ہوگا ۔ کچھ بھی تو نہ ہوگا ۔ کیسی قسمت تھی اس کی ۔

کوئی سکھ اس نے نہ دیکھا تھا ۔ نہ اپنا اور نہ اولاد کا ۔ بیٹا جیل چلا گیا تھا ۔ چاندنی کا

رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ اب تو اسے کوئی اچھی امید رہی بھی نہ تھی — ہر آس ٹوٹ گئی تھی۔ اب چاندنی کو کون پوچھے گا۔ نوید نے تو اپنے ساتھ ساتھ بہن کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا

چاندنی کے پاس صرف حسن کی انمول دولت تھی جو خدا نے اسے بخشی تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا تھا اس کے پاس۔ نہ باپ کا سایہ سر پر تھا۔ نہ دولت تھی۔ اور اب تو ان کی شرافت غیرت کا شیرازہ بکھیر گیا تھا۔

کون پوچھے گا — بے باپ کی بچی کو — مجرم بھائی کی بہن کو۔ غربت و افلاس میں ڈوبی جوانی کو۔ چمن تو منہ پر تھپڑ مار ہی چکی تھی — اور اس کی صابر بیٹی نے اس صدمے کو چپ چاپ سہہ لیا۔ اپنا دکھ درد۔ ماں سے بھی چھپا نہ سکی۔ منگنی کی انگوٹھی۔ جوڑا اور زیور سب ماں کے آگے لا رکھے۔ امی اب یہ چیزیں آپ لوٹا دیں ان پر میرا کیا حق — چاندنی کے چہرے پر نظر ڈال کر تارا کے دل پر قیامت سی بیت گئی۔

ہائے نوید تو نے یہ کیسی آگ لگائی ہے۔ ان دیکھی آگ۔ جس میں ہمارا سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔

نوید کی جدائی کی تارا پہلے سے عادی تھی — موت تو آتی نہ تھی۔ جینا تو تھا ہی۔ دن تو گذارنے تھے۔ اچھے یا برے — وہ گذرنے لگے۔ تارا پھر پرانے دھندے میں لگ گئی۔ دوسروں کے کپڑے سینے لگی — لیکن ہمت نے ایسا جواب دیا تھا — کہ اس سے اب کام نہ ہوتا تھا۔ نوید کے دیئے ہوئے کافی روپے اس کے پاس تھے۔ تارا ان روپوں کو خرچ کر کے گناہ نہ کمانا چاہتی تھی۔ لیکن مجبوری بے کسی انسان کو غلط راہ پر لے جاتی ہے۔ بھوک تو اپنے وقت پر ہی لگا کرتی ہے اور اس بھوک کے علاج کے لیے وہ رقم خرچ ہونے لگی۔ دن گذرنے

گئے۔ جمع شدہ روپیہ ختم ہو گیا۔

تارا کی پرانی مشین اب بے کار ہو گئی تھی۔ وہ مشین بھلا کب تک تارا کا ساتھ دیتی۔ لیکن انسانوں سے زیادہ وہ مشین ہی وفادار ثابت ہوئی تھی۔ تارا نے اس کی گھرر گھرر میں دو بچوں کو جوان کیا تھا۔ خود بھی زندہ رہی تھی۔ کبھی بھوکی نہ رہی تھی۔

''نئی مشین خریدنے کی سکت نہ تھی۔۔۔ نوید کی ولائتی مشین تو گھر اور سامان کے ساتھ قرق ہو گئی تھی۔

پھر چاندنی کا جمع شدہ زیور بکنے لگا۔ روٹی کی خاطر۔۔۔ چاندنی کی پڑھائی کی خاطر۔ دھات کے یہ چمکتے ٹکڑے صندوق میں پڑے بیکار ہی تو تھے۔

چاندنی کی سوچ کے مطابق۔ اب اسے کسی زیور کی ضرورت ہی نہ تھی۔۔۔ اسے اپنی زندگی کی ویرانیوں سے چاہت ہو گئی تھی۔ زندگی کا سفر اس نے تنہا طے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دو سال گذر گئے۔ لیکن کس طرح گذرے۔ کوئی تارا اور چاندنی کے دل سے پوچھتا۔ دکھ کی ایک رات ہی کتنی بھاری ہوتی ہے۔ لیکن یہ دو سالوں کا چکر تھا۔ بے شمار دنوں بے حساب راتوں کا پھیر تھا۔ دکھ کے دو بھاری بھاری سال چاندنی کو اب حالات کا عادی بنا گئے تھے۔ وہ اب کافی ہمت ور ہو گئی تھی۔ حالات نے کم عمری میں اسے بے حد حوصلہ بخش دیا تھا۔ وہ اب ماں کا سہارا بن گئی تھی۔ تارا تو اب پلنگ سے جا لگی تھی۔ چاندنی دن بھر پڑھائی کی محنت گھر کے کام کاج اور پھر باہر کی سلائی کر کے تھکن سے چور ہو جاتی۔ قسطوں میں اس نے ایک نئی مشین خرید لی تھی۔ اس طرح بس دن پورے ہو رہے تھے۔ وہ پڑھائی میں ہمیشہ سے اچھی تھی۔ اب تو وہ بڑی محنت سے پڑھتی۔ کتابوں کو اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ جدوجہد کر کے کالج کی فیس معاف کروا لی تھی۔ اس کا کالج گھر سے کافی فاصلے پر تھا وہ روز پیدل جاتی اور پیدل آتی۔ کتابیں خریدنے کو اس کے پاس پیسے نہ ہوتے وہ کالج لائبریری میں خالی پیریڈ میں بیٹھ کر نوٹس بناتی رہتی۔ ضرورت کی کتاب ساتھ لاتی۔ پھر رات بھر وہ نوٹس بناتی رہتی۔ اس کو اب زندگی کے ہر حسین رنگ سے نفرت تھی۔ اسے صرف اپنے غم اپنی تنہائیاں اور اپنی ماں کے لاغر وجود سے پیار تھا۔ اس نے بی اے کے بعد ملازمت کرنے کا سوچ

رکھا تھا۔ باعزت ملازمت۔ وہ سوچتی اسے کسی اسکول میں تو ضرور جگہ مل جائے گی۔ پھر زندگی کی یہ ڈگمگاتی ناؤ بھنور سے نکل ہی جائے گی۔ کسی نہ کسی طرح کنارے لگ جائیگی اس کے دل کو مستقبل سے بڑی اچھی امیدیں تھیں۔

"لیکن اچھی امید کب پوری ہوتی ہے۔ چاندنی نے بی اے کر لیا۔ اچھی ڈویژن میں پاس بھی ہو گئی ـــ وہ وقت آگیا تھا جس کو اس نے کب سے ذہن میں بسا رکھا تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلنا چاہتی۔ مشین کی گھرر گھرر جس کو بچپن سے اس کے کانوں نے سنا تھا اب اس کے کانوں کے پردوں کو چیر کر رکھ دیتی تھی وہ بھی ماں کی طرح اس مشین کے آگے بیٹھ کر بوڑھا نہ ہونا چاہتی تھی۔

لیکن تارا جو زمانے کی ستائی ہوئی تھی جوان اور خوبصورت بیٹی کو گھر سے نکالنے پر آمادہ نہ تھی اسے خبر تھی۔ کہ یہ دنیا عیاشی بدکاری کا ایک اڈہ ہے۔ کوئی اس کی چاندنی کو میلا نہ کر دے۔ اسے بدنام نہ کر دے۔ چاندنی تو معصوم بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔ کس طرح وہ اسے زمانے کی ہوا میں تیز و تند تھپیڑوں میں یوں تنہا چھوڑ دیتی۔

چاندنی جب بھی ملازمت کا کہتی۔ تارا کے چہرے پر ایک بیچارگی سی پھیل جاتی۔ کس دل سے اس بات کی اجازت دوں۔ چاندنی تجھے بھوکی گندی نظروں کا مرکز بنانے کے لیے باہر بھیج دوں یہ دنیا بہت بری ہے۔ اس میں بسنے والے سفید پوش بھی اندر سے میلے ہیں وہ درندہ فطرت ہوا کرتے ہیں۔ تارا چاندنی کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے لگتی۔

"لیکن امی آپ کی بیٹی تو ایسی فطرت کی نہیں ہے نا۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں امی۔ میرے حوصلے بھی ڈگمگا نہیں سکتے۔ مجھے کوئی نہیں بہکا سکتا۔" وہ عزم اور پختہ یقین سے کہتی۔ پھر ماں کو فکر مند دیکھ کر وہ اسے سمجھانے لگتی۔

زمانہ بدل گیا ہے امی۔ میں تو ضرورت کے تحت ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔ آج تو بڑی سے بڑی لڑکی بھی آپ کو دفتروں میں اسکولوں کالجوں میں ملازمت کرتی نظر آئے گی تعلیم صرف اپنے تک محدود رکھی جائے تو بے کار بن جاتی ہے۔ طرح طرح کی دلیلوں سے اس نے ماں کو راضی کر لیا۔

ویسے گھر میں دھول اڑ رہی تھی۔ غربت اور افلاس کی۔ اگر چاندنی ہمت ہار کر بیٹھ جاتی تو ایک دن فاقوں کی نوبت آ جاتی۔

تارا کو راضی کر کے چاندنی ایک دن کی ملازمت کی تلاش کے لیے گھر سے نکل پڑی۔ لیکن وہ نوعمر تھی ناتجربہ کار تھی۔ اسے یہ بھی نہ معلوم تھا۔ کسی جگہ کو حاصل کرنے کے لیے سفارشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ رشوتوں کے بغیر کچھ کام نہیں ہوتا۔ ویسے بھی چاندنی کسی دفتر وغیرہ کا رخ کرنا نہ چاہتی تھی۔ وہ کسی اسکول میں بچوں کو پڑھانے کی خواہاں تھی۔

اس نے ہر اسکول میں جھانکا۔ ہر جگہ جا کر ملازمت حاصل کرنے کی درخواست کی لیکن اس ناتجربہ کار لڑکی کو دنیا کی دوڑ میں کون پوچھتا،

چاندنی کی ہمت ہار گئی۔ وہ مایوس ہو گئی۔ تم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتیں۔ چاندنی۔ تمہارا وجود تو اللہ میاں نے بھکاری کے ایک خالی کشکول کی طرح دنیا میں لا ڈالا ہے وہ اس مایوسی پر بے حد روتی۔ یہ دل بھی کیسا پگلا ہے۔ ہر بار ہارتا ہے۔ پھر کیوں۔ کیوں کوئی تمنا کرتا ہے۔ سوچوں کی یلغار کے ساتھ اسے اپنے دل پر آپ غصہ آ گیا۔

مایوس ہو کر پھر وہ اپنی مشین کے پاس آ بیٹھی۔ گھروں سے کپڑے لینے اور دینے تارا ہی جایا کرتی تھی۔ کسی کے گھر میں اس نے چاندنی کو کبھی نہ بھیجا تھا۔ لیکن ان دنوں تارا بے حد بیمار تھی۔ باہر آنے جانے سے قاصر تھی۔ اس وجہ سے سلائی کا کام بھی نہ آتا تھا۔ چاندنی تو اب تنہا

مصائب کا مقابلہ کر کے تھک سی گئی تھی — ماں بیمار تھی اور وہ ان دنوں بالکل بیکار — قریب ہی ایک ڈاکٹر تھا تارا کا اس سے ہی وہ علاج کرا رہی تھی۔ ماں جب بھی بیمار ہوتی اسے شہید چچا کی یاد آتی۔ لیکن اب وہ اس کی محبت کا اثر دل سے زائل کر چکی تھی۔ اسے وہ بھی دنیا والوں کی طرح لگتا۔ بے وفا۔ جبھی تو ان سے بالکل منہ پھیر بیٹھا تھا۔ چاندنی کو حقیقت کا کب علم تھا وہ صرف شہید کو ہی برا بھلا کہتی تھی۔

اس شام وہ ڈاکٹر کی دکان پر تارا کی دوائی لینے گئی تھی۔ کہ کلینک کے باہر نیلی رنگ کی پلیمتھ میں اسے ایک جانی پہچانی لڑکی کی صورت نظر آئی — فرخندہ — چاندنی کے دل نے بے ساختہ اس کا نام پکارا۔

فرخندہ چاندنی کے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی — دس سال تک دونوں کا ساتھ رہا تھا چاندنی سے اس کی جان پہچان تھی۔ دوستی تو چاندنی نے کسی سے کبھی نہ کی تھی۔ لیکن اب فرخندہ کو پہچان کر اس کے قدم رک گئے۔

فرخندہ بھی چاندنی کو پہچان کر کار سے نکل آئی۔ اس کا ڈرائیور سامنے کی دوکان سے کچھ خریدنے گیا ہوا تھا۔

"ارے چاندنی۔ تمہاری صحت اتنی خراب کس طرح ہو گئی کتنی زرد ہو رہی ہو — کیا بیمار تھیں؟" — فرخندہ نے ایک ساتھ اتنے سوال اس سے کر ڈالے۔

"نہیں تو" چاندنی نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا —

فرخندہ کی شادی ہو چکی تھی اس کا شوہر کینیڈا میں گیا تھا۔ اس ہی ہفتے وہ بھی شوہر کے پاس جا رہی تھی۔ فرخندہ تو بے حد خوش لگ رہی تھی۔

اور چاندنی صورت سے مصیبت زدہ لگ رہی تھی۔

چاندنی کی عمر بھی امنگوں کی عمر تھی۔ لاکھ اس نے دل پر پہرے بٹھا رکھے تھے لیکن کبھی دل میں ضرور ہل چل سی پیدا ہو جاتی۔ اب بھی اسے اپنی قسمت سے گلہ اور فرخندہ کی تقدیر پہ رشک آنے لگا۔

"آجکل کیا کر رہی ہو؟" فرخندہ نے اس کا حال جاننا چاہا۔ "ملازمت کی تلاش۔" دل کی بات چاندنی کے لبوں پر آ گئی۔

"کس قسم کی ملازمت چاہیے تمہیں؟" فرخندہ نے اپنائیت سے سوال کیا۔

"کسی اسکول میں یا پھر بچوں کو پڑھانے کی ملازمت۔ کسی آفس یا دفتر میں قدم رکھنا مجھے ناپسند ہے۔" چاندنی رک رک کر نہایت افسردگی سے فرخندہ سے مخاطب تھی۔

فرخندہ سوچ میں پڑ گئی — "میرے ایک دور کے کزن ہوتے ہیں ان کو اپنی بہن کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو اس کو پڑھا بھی سکے۔ زوجاجہ بے حد اچھی لڑکی ہے۔ لیکن تم کو ان کے گھر جانا پڑے گا۔" فرخندہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"گھر۔" چاندنی فکر مند سی ہو گئی۔

"ہاں چونکہ زوجاجہ کا رشتہ اس دنیا سے کٹا ہوا ہے۔ وہ معذور ہے۔" چل پھر نہیں سکتی۔ فرخندہ بتانے لگی۔ "پھر وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ تم اس گھر کو اپنا گھر پاؤ گی۔" فرخندہ نے ہر طرح سے چاندنی کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے وہاں بھی قسمت آزما کر دیکھ لوں گی۔" چاندنی کا دل اس ملازمت پر آمادہ ہو گیا۔ فرخندہ نے اسے پتہ سمجھا بھی دیا۔ اور لکھ کر بھی دے دیا۔

"میں علی بھائی سے فون پر بھی تمہاری سفارش کر دوں گی۔" فرخندہ نے اسے خداحافظ کہہ کر کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

اور چاندنی بھی دھیرے دھیرے قدموں سے گھر کی طرف چل پڑی ۔۔ گھر آ کر اس نے پہلے تارا کو دوا کی خوراک پلائی ۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر ہولے ہولے اس کا سر دبانے کے ساتھ ساتھ فرخندہ سے جو اس کی باتیں ہوئی تھیں وہ بھی سنا ڈالیں ۔ تارا سب کچھ سن رہی تھی بمشکل بولی ۔

"دن پر کسی پرائے گھر میں کس طرح رہو گی نہ جانے کیسا ماحول ہو ۔ کیسے لوگ ہوں" تارا کو فکر ہوئی ۔

"امی یہ تو بعد کی باتیں ہیں ۔ اگر مجھے وہ لوگ اچھے نہیں لگیں گے تو پھر میں خود ملازمت پر تیار نہ ہوں گی ۔ پھر زوجاجہ تو معذور لڑکی ہے"۔ اسے ابھی سے زوجاجہ پر رحم آنے لگا تھا تارا چاندنی کی اس بات پر خاموش ہو گئی ۔ اس کی بیٹی کتنی قربانی دے رہی تھی جس کی عمر دلہن بننے کی تھی ۔ کسی کے دل کی رانی بننے کی تھی ۔ دوسرا گھر بسانے کی تھی وہ دوسرے کے گھر میں ملازمت کرنے کی خواہاں تھی ۔ لیکن وہ ایسا نہ کرتی تو پھر زندگی کی ناؤ کس طرح آگے بڑھتی ۔ پچھلے دنوں جب وہ شدید بیمار ہوئی تھی تو چاندنی نے اس کے علاج کی خاطر اپنی چوڑیاں بیچ ڈالی تھیں ۔ جو تارا نے اچھی امید کے ساتھ چاندنی کے لیے رکھ چھوڑی تھیں ۔۔ تارا کو اس بات کا علم ہوا تو وہ تڑپ گئی "میری امی ۔ اب آپ امیدیں باندھنا چھوڑ دیں ۔ وہ چوڑیاں میرے کس کام کی مجھے کسی چیز کا شوق نہیں"۔ وہ دکھ سے ماں کو سمجھانے لگی لیکن چوڑیاں اتنے سستے داموں میں بک جانے کا تارا کو بے حد قلق تھا ۔ غصے کے اظہار کے طور پر اس نے دو تین دن چاندنی سے بات نہ کی تھی ۔ اور چاندنی بیچاری اتنی قربانیاں صرف ماں کی خاطر تو دے رہی تھی اپنی اسے کوئی فکر ہی نہ تھی ۔۔ وہ ماں کی بیماری سے بھی بے حد پریشان تھی لیکن آج فرخندہ سے مل کر وہ خود کو اس طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی جیسے اسے یہ ملازمت مل ہی گئی ہو ۔

صبح کے اشتیاق میں رات بھر چاندنی کو صحیح طور پر نیند نہ آئی۔ وہ علی الصبح بیدار ہو گئی۔ صبح صبح اس نے سارا کام نمٹا لیا۔ گھر بھی صاف کر لیا۔ آنگن بھی دھو ڈالا۔ تارا کے لیے دوپہر کا کھانا بھی تیار کر دیا۔ ماں کے ساتھ ناشتہ کر کے وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی اس نے اپنی امی کی کالی ساڑھی پہننے کے لیے نکال لی۔ ماں کے پرانے کپڑے، ساڑھیاں اب وہ ہی پہنا کرتی تھی۔ کالی ساڑھی میں اس کی گوری شفاف رنگت اور روشن ہو جاتی تھی۔ بالوں میں کنگھی کر کے وہ ماں سے اجازت لے کر ایک نئی جستجو دل میں لیے گھر سے نکل پڑی۔ جاتے جاتے تارا نے نصیحت کی — "چاندنی جلد لوٹ آنا" — "جی اچھا امی" — اس نے فرمانبرداری سے جاتے ہوئے جواب دیا۔

الحمرا سوسائٹی اس کے گھر سے کافی دور تھی، لیکن چاندنی تو ان دنوں بجپت کرنے کے موڈ میں تھی، میلوں میل چلتی۔ اب بھی وہ پیدل چل پڑی گرمیوں کے دن تھے۔ سویرے سویرے سورج آگ سی برسات لگتا تھا۔ چاندنی پل بھر میں پسینے سے شرابور ہو گئی۔ اس کی گلابی رنگت دھوپ کی تمازت سے سرخ انگارہ سی ہو گئی۔ پیر بری طرح تھک گئے۔ لیکن وہ برابر چلتی گئی۔ دو ڈھائی میل کا فاصلہ وہ بڑے حوصلے سے اپنے نازک پیروں سے طے کر گئی لیکن اس کی حالت بری تھی۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ الحمرا سوسائٹی آ گئی۔ ۴۲ نمبر

علی احمد کی کوٹھی تلاش کرنا کچھ اسے مشکل لگ رہا تھا - ہر طرف ایک سے ایک عالیشان کوٹھیاں کھڑی تھی - جو مکینوں کی بے پناہ دولت کی منہ بولتی تصویریں تھیں - علی احمد کی کوٹھی کی تلاش میں اس جگہ کے چکر لگاتے لگاتے اسے آدھ گھنٹہ ہو گیا - تب جا کر اسے وہ کوٹھی مل گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا - بڑا سا سنہرا گیٹ اس کے استقبال کو جیسے پہلے سے ہی کھلا تھا پورچ میں بڑی سی سفید کار کھڑی تھی - اور اس کے قریب بے حد اعلیٰ سوٹ میں ملبوس. علی احمد ہی کھڑے تھے - آفس جانے کے لیے وہ بس کار میں بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ ذرا فاصلے پر آتی بے حد خوبصورت سی لڑکی جو کافی پریشان اور گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی ان کو چونکا گئی - وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے -

چاندنی ان سے کافی فاصلے پر رک گئی - اس وقت اس کی سانس اس قدر پھولی ہوئی تھی کہ اسے بولنا دوبھر لگ رہا تھا - اس پہ سامنے کھڑے علی احمد کی نفیس سی شخصیت اسے اور بوکھلا گئی تھی - علی احمد دو قدم آگے بڑھ کر خود اس کے قریب چلے آتے -

"آپ نے کس سے ملنا تھا"؟ انہوں نے اس سے سوال کیا -

"جی - علی احمد صاحب سے" اس نے اپنی آنکھیں پھیلا کر کچھ گھبراہٹ میں کہا - وہ اس کے اس پیارے سے انداز پہ کھل کر مسکرا پڑے -

"فرمایئے - مجھے ہی علی احمد کہتے ہیں" - وہ اس سے نرمی سے مخاطب تھے - اور چاندنی آنکھیں پھیلا کر ان کو تکنے لگی - اس نے فرخندہ کے انکل کا جو امیج کل سے آج تک بنایا تھا - وہ اس سے بالکل ہی مختلف تھے - بے حد دلفریب شخصیت کے بلند قد وقامت کے وہ وجیہہ صورت انسان تھے - ہاں ان کے کالے بالوں میں سفید بالوں کی آمیزش نمایاں تھی - ان سفید بالوں سے ہی وہ کچھ معمر لگ رہے تھے - اگر سارے بال کالے

ہوتے تو وہ بھی بالکل ہی جوان دکھائی دیتے۔ چاندنی حیرانی سے ان کو تک رہی تھی۔ پھر ذرا سی ہوش کی دنیا میں آئی تو — گھبراتے ہوئے انداز میں بولی۔ "مجھے فرخندہ نے آپ کا پتہ دیا تھا"۔

"اوہ —" وہ اس کی گھبراہٹ پر لطف اندوز ہو رہے تھے "ہاں رات فرخندہ نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ اور میں آپ کا منتظر ہی تھا۔ آئیے اندر تشریف لائیں پھر تفصیل سے گفتگو ہوگی"۔ انہوں نے چاندنی کو اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ علی احمد کی ہمراہی میں چاندنی اندر آگئی۔ اندر ایک وسیع ہال میں وہ چاندنی کو لے آئے باہر سے علی احمد کی کوٹھی کتنی خوبصورت تھی وہ خود بھی کتنے صاف ستھرے تھے۔ لیکن صرف اس وسیع کمرے کو دیکھ کر چاندنی نے گھر والوں کے ذوق اور نفاست کا پتہ لگا لیا۔ وہ کمرہ بے حد اجڑا اجڑا اور گندا تھا۔ یہ شاید ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ فرنیچر بے حد اعلیٰ تھا۔ لیکن سب پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی صاف نظر آرہی تھی۔ صفائی ستھرائی ایسا لگتا تھا کہ اس کمرے کی مہینوں سے نہیں ہوئی۔ سرخ قیمتی قالین منوں مٹی سے بھر کر اپنی اصلی رنگت کھو چکا تھا۔ کشن الگ میلے تھے۔ کھڑکیوں کے بھاری پردے میلے تھے اور گرل چھوڑ کر آدھے کھڑکیوں سے لٹک کر سخت برے لگ رہے تھے۔ چھتوں پہ جا بجا جالے لگ رہے تھے۔ چاندنی نے ایک نظر میں ماحول کا جائزہ لے کر اس گھر والوں کی بدسلیقگی اور بدذوقی کو محسوس کر لیا۔ علی احمد کے کہنے پر وہ ایک صوفے پہ بیٹھ گئی۔ لیکن اس وقت وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ ایک اجنبی مرد کے ساتھ اس طرح تنہا ... میں بیٹھنے کا اسے پہلی بار اتفاق ہوا تھا۔ اس کی گھبراہٹ نے ... چھپ رہی تھی اچھی خاصی کانپ رہی تھی۔ پیاس سے الگ بری حالت تھی۔

لیکن اسے پیاس کا اظہار کرنا بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ علی احمد چاندنی سے کافی فاصلے پر بیٹھ گئے۔

"مجھے اپنی بہن کے لیے ایک دوست ایک ساتھی کی ضرورت تھی" انہوں نے گفتگو کا سلسلہ زوجاجہ کی طرف ہی رکھا۔

"جی"۔ چاندنی سر جھکا کر فرمانبرداری سے ان کی باتیں سننے لگی۔

"زوجاجہ نارمل بچی نہیں ہے ۔ وہ پیدائشی معذور ہے۔ چلنے پھرنے سے قاصر" علی احمد اداس سے ہو گئے۔ ان کا چہرہ دکھ کی ترجمانی کر رہا تھا۔

فرخندہ سے اسے زوجاجہ کی معذوری کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ اسی کی ہمدردی میں ہی وہ فوراً وہاں چلی آئی تھی۔

علی احمد اس سے کہہ رہے تھے۔"آپ زوجاجہ کی دوست بن سکیں گی۔ اس کا خیال رکھ سکیں گی"۔ ان کے لہجے میں التجا تھی۔

"جی۔ میں میں اپنی پوری کوشش کروں گی"۔ اس نے پھر دھیرے سے جواب دیا۔

"آپ اس کو پڑھنے لکھنے میں مدد دے دیجیئے گا۔ کیونکہ زوجاجہ اسکول جانا پسند نہیں کرتی اور بچوں کو دیکھ کر اسے محرومی کا احساس ہوتا ہے"۔ وہ اس سے ساری باتیں اس وقت طے کرنا چاہتے تھے۔"آپ کو پورا دن زوجاجہ کے ساتھ گذارنا پڑے گا"۔ ملازمت کی یہ شرط کر دی تھی لیکن چاندنی کو اتنے عرصے بعد امید کی خوشی ملی تھی۔ وہ ہر بات قبول کرنے پہ اس وقت آمادہ تھی۔ وہ یہ ملازمت کھونا نہ چاہتی تھی۔ ویسے علی احمد صورت سے بے حد شریف لگ رہے تھے کتنے احترام سے اس سے بول رہے تھے۔

"جی جب آپ نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے تو پھر میں اسے بنھانے کی پوری کوشش کروں گی" اس نے کچھ رک رک کر اقرار کر لیا۔

علی احمد بے حد مسرور ہو گئے۔ ان کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔

"آپ نے بہت بڑا احسان کیا ہم پر۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے" ۔ چاندنی نے کچھ جھینپ کر کہا۔ "میں بھی تو ضرورت کے تحت یہاں آئی تھی۔"

"چلیئے آپ کو زوجاجہ سے ملواؤں" ۔ انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اس کا نام پوچھ ڈالا

"چاندنی ہے" اس نے مختصر سے جواب میں اپنا نام بتا ڈالا ۔

پھر وہ علی احمد کی رہنمائی میں زوجاجہ کے کمرے میں آ گئی ۔ جو کوٹھی کے آخری کونے میں تھا۔

علی احمد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی زوجاجہ کو مخاطب کیا۔ "زوجاجہ دیکھو تمہارے لیے ہم کتنی اچھی سہیلی لائے ہیں" ۔ زوجاجہ وہیل چیر پر بیٹھی تھی ۔ اپنی معصوم سی آنکھیں اٹھا کر اجنبی نظروں سے چاندنی کو دیکھنے لگی ۔ زوجاجہ کا حلیہ اس وقت بے حد خراب تھا لباس بھی میلا تھا ۔ بال بھی الجھے ہوئے تھے ۔ یوں لگتا تھا اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ زوجاجہ کی صورت پر نظر ڈالتے ہی چاندنی کو اس پہ رحم آ گیا ۔

وہ اس کے قریب چلی آئی ۔ "آپ ہم سے دوستی کریں گی نا زوجاجہ" ؟ ۔ اس نے زوجاجہ کا مرجھایا ہاتھ تھام لیا ۔ اس اپنائیت پر وہ شرما گئی ۔ سر جھکا کر منہ چھپانے لگی ۔ زوجاجہ سے علی احمد چاندنی کا تعارف کرانے لگے "یہ چاندنی ہیں ۔ زوجاجہ اب یہ دن بھر تمہارے پاس رہیں گی" ۔ اور زوجاجہ پھر بے یقینی سے چونک کر چاندنی کی طرف دیکھنے لگی ۔ چاندنی کو

محسوس ہوا۔ زوجاجہ زبان سے زیادہ آنکھوں سے بولتی ہے۔ لیکن چاندنی اسے بولنے پر آمادہ کرنا چاہتی تھی۔ "اگر آپ ہم سے نہیں بولیں گی تو پھر ہم چلے جائیں گے"۔

"نہیں"۔ زوجاجہ کے لبوں نے جنبش کی۔ "آپ مجھے بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ اس نے چاندنی کا ہاتھ تھام لیا۔ علی احمد مسکرانے لگے۔ چاندنی بھی خوش ہو گئی"۔ "دیکھیے زوجاجہ نے آپ سے کتنی جلد دوستی کر لی۔ اس کو نبھانا آپ کا کام ہے"۔ علی احمد نے چاندنی کو مخاطب کیا۔

"اگر میں زوجاجہ کی کچھ مدد کر سکوں تو اس سے مجھے خوشی ہوگی"۔ چاندنی رحم دل تھی۔ زوجاجہ پر اسے پہلی نظر میں رحم آگیا تھا۔ وہ اس ملازمت پر آمادہ ہو گئی"۔ "تو پھر آپ کل سے ہی آجائیں"۔ علی احمد بولے۔

چاندنی رضامند ہو گئی۔ لیکن آج وہ جلدی جانا چاہتی تھی اس وجہ سے زوجاجہ سے کل آنے کا وعدہ کر کے وہ باہر آگئی۔ علی احمد اس کے پیچھے تھے ویسے چاندنی کو اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ اسے اتنے بڑے گھر میں علی احمد اور زوجاجہ کے علاوہ اب تک کوئی نظر نہ آیا تھا انہوں نے اسے گھر پر اتار دیا"۔ "مس چاندنی روز صبح کار آپ کو لینے آجایا کرے گی"۔ انہوں نے اس کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔

اور چاندنی دل میں مسرت کا خزانہ چھپائے دل سے ان کا شکریہ ادا کر کے اندر چلی آئی۔

جہاں تارا اس کی منتظر تھی۔ ماں کو اچانک اس نے آٹھ سو کی ملازمت کا بتا کر بے حد حیران کر ڈالا۔

دوسری صبح چاندنی منہ اندھیرے اٹھ بیٹھی — جلدی سے سارا کام کیا — بیمار ماں کو دن بھر کے لئے تنہا چھوڑنے کا خیال بھی بے حد اذیت ناک تھا۔ لیکن دوسری طرف اُسے ملازمت کا خیال بھی تھا۔ پھر ملازمت بھی ایک احساسِ ذمہ داری ہوتی ہے۔ ماں کو ناشتہ کرواکر وہ ان کو ہر طرح کی ہدایت کرنے لگی۔ وقت پر دوا پی لیجئے گا امی۔ دوپہر کا کھانا کھا لیجئے گا۔ اور میرے لئے پریشان نہ ہویئے گا میں مغرب تک آجاؤں گی۔

سفید سادہ سے لباس میں چاندنی سادگی کا مجسمہ لگ رہی تھی — بے حد گھنے بالوں کو اس نے دو چوٹیوں کی شکل میں باندھ لیا۔ اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح — وہ چہرے پر میک اپ چھوتی بھی نہ تھی۔ اس کے جو شوق تھے۔ وہ حالات کی ستم ظریفی نے فنا کر دیئے تھے۔ چاندنی جیسے ہی تیار ہوئی۔ علی احمد کا ڈرائیور کار لے کر اُسے لینے آگیا۔

اور تارا پھر بیٹی کو ایک بار نصیحت کرنے لگی۔ اس کا دل سخت مضطرب سا تھا —
"چاندنی حالات نے ہمیں اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ تم دوسرے گھر کی ملازمت کرو۔

لیکن بیٹی۔ عزت کی سفید چادر کو داغدار نہ ہونے دینا۔ شرافت کا انمول خزانہ کبھی نہ لٹانا۔ یہ دنیا بُری ہوس پرست ہے چاندنی۔

تم اپنے مرحوم باپ کی عزت ہو۔ چاندنی۔" تارا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چاندنی کی آنکھیں خود بھیگ گئیں۔" امی۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں آپ کی بیٹی ہمیشہ ثابت قدم

رہے گی۔ پھر امی میں تو بڑے اچھے لوگوں کے گھر جا رہی ہوں۔ اس نے پھر ماں کو اطمینان دلایا اور وقت کی نزاکت کا احساس کر کے۔ دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرتی ہوئی وہ علی احمد کی کار میں جا کر بیٹھ گئی۔

چاندنی نے کار میں بیٹھ کر محسوس کیا کہ سامنے کی بالکونی سے فاروق کی ماں اُسے ہی تاک رہی تھیں۔ احمد چچا کی بیوی بھی۔ دروازے کی اوٹ سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ اپنے دروازے پر کھڑا فاروق اُسے دیکھ کر بڑی خباثت سے مسکرا رہا تھا۔ ہائے کاش ہم بھی کار والے ہوتے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر یہ جملہ کہا — چاندنی نے یہ سب سنا۔ اس کا خون کھول گیا۔ اور ساتھ ساتھ سخت کوفت بھی ہونے لگی — ڈرائیور کار گلی سے نکال کر لے گیا۔ لیکن چاندنی کی الجھن دور نہ ہوئی۔ روز اس طرح اس کے سویرے سویرے جانے سے نہ جانے محلے والے کیا سمجھیں گے۔ اس کے دل نے سوچا۔

اُسے اس محلے اور اس میں بسنے والے پست ذہن لوگوں سے شدید نفرت تھی۔ نہ جانے یہ محلے کی عورتیں اس کی مظلوم ماں کی کیوں دشمن تھیں۔ چاندنی کو پتہ تھا شہید چچا کا آنا بھی ان محلے والوں کو بُرا لگتا تھا۔ جیسے وہ ان ہی کا کچھ لینے چلا آتا تھا۔

کچھ عرصے کے لئے اس محلے سے نکل کر چاندنی بے حد خوش ہو گئی تھی — اُسے دلی سکون مل گیا تھا۔ لیکن اُسے کیا خبر تھی۔ کہ حالات کی ستم ظریفی اس کو بری طرح لوٹ کر پھر اس ہی گھر میں لا ڈالے گی۔ پھر یہ گھر تارا کا اپنا گھر تھا — سر چھپانے کا ایک ٹھکانہ تو دونوں کو میسر تھا۔ اگر یہ گھر نہ ہوتا۔ تو پھر وہ دونوں ماں بیٹیاں صحیح معنوں میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرتیں کیونکہ اس مہنگائی کے زمانے میں کرائے کا گھر لینا آسان نہ تھا۔ نہ ہی ان کی اتنی حیثیت تھی۔ کہ وہ معمولی سا کرایہ بھی دے سکیں۔ دو وقت کی روٹی بھی اب مشکل

سے ملتی تھی۔ اور چاندنی ہی اب زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی۔

راستے بھر چاندنی بس اسی ہی سوچ میں ڈوبی رہی۔ علی ولا آگیا۔

چاندنی سیدھی زوجاجہ کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اس کی منتظر تھی۔ اس کے کملائے کملائے چہرے پر چاندنی کو دیکھ کر بڑی معصوم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"میں سمجھی تھی آپ میرے پاس نہیں آئیں گی"۔ اس نے خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا خدشہ بھی چاندنی پر ظاہر کر دیا۔

"ارے نہیں زوجاجہ۔ اب تو ہم روز ہی تمہارے پاس آیا کریں گے۔ کیونکہ اب ہم اور تم دوست بن گئے ہیں نا"۔ چاندنی زوجاجہ کے پلنگ پر اس کے بہت قریب بیٹھ گئی۔ زوجاجہ نے اب تک ناشتہ بھی نہ کیا تھا۔۔۔ وہ تو صبح سے چاندنی کے انتظار میں بھوکی بیٹھی تھی۔ میں آپ کے ساتھ ناشتہ کروں گی۔ زوجاجہ نے اپنی خواہش ظاہر کی۔ حالانکہ چاندنی گھر سے کھا پی کر آئی تھی۔ لیکن زوجاجہ کی خوشی کے لئے وہ اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی۔ زوجاجہ کا ناشتہ کمرے میں ہی آجاتا تھا۔ اور علی احمد ڈائننگ روم میں اکیلے ہی ناشتہ کرتے تھے۔

زوجاجہ کی ملازمہ جن کو زوجاجہ خالہ کہا کرتی تھی۔۔۔ ٹرالی میں ناشتہ سجا کر اس کے کمرے میں لے آئیں۔ خالہ زیب اس گھر کی ملازمہ تھیں۔ لیکن انہوں نے زوجاجہ کو ماں بن کر پالا تھا۔ اس وقت سے ان کا زوجاجہ کا ساتھ تھا جب زوجاجہ کی ماں اُسے چند ماہ کا چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ خالہ زیب نے زوجاجہ کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کی ماں بن گئی۔ زوجاجہ ان کی گود میں پروان چڑھی تھی۔۔۔ ایک ڈیڑھ سال کی عمر تک جب وہ چل نہ سکی تو پھر سب کو تشویش ہوئی۔ زوجاجہ تو اپنے ماں باپ کی شدید خواہش

کا برعکس تھی۔ اس کے ماں باپ کو اولاد کی شدید تمنا تھی۔ لیکن اللہ میاں نے ان کو سب کچھ دے کر اولاد کم ہی دی۔ صرف ایک بیٹا علی احمد — پھر اس کی پیدائش کے تقریباً بائیس برس بعد اللہ میاں نے زوجاجہ کو ان کے یہاں بھیج کر قدرت کا کرشمہ دکھایا تھا۔ لیکن زوجاجہ آئی — تو ماں مرگئی — اور وہ بچی بھی ادھورا وجود لے کر آئی تھی — بظاہر تو نارمل نظر آتی تھی — لیکن علاج معالجے کے بعد ڈاکٹر نے اس کا مرض لاعلاج بتا ڈالا۔

یہ بچی عمر بھر اپنے پیروں پر نہ چل سکے گی۔ ڈاکٹروں کی رائے نے باپ اور بھائی کا دل توڑ دیا۔ لیکن وہ ننھی سی بچی ابھی اس حس سے ناآشنا تھی — لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ زوجاجہ کو اپنی معذوری کا احساس ہو گیا۔ اس کے ابا نے اُسے اسکول میں ضرور داخل کیا۔ وہ وھیل چیر کے ساتھ اسکول جاتی۔

خالہ زیب اسکول میں بھی اس کی کلاس کے باہر بیٹھی رہتی تھیں۔ لیکن وہاں زوجاجہ نے تمام بچوں سے خود کو مختلف سمجھا۔ سب کتنی آسانی سے بھاگتے پھرتے کھیلتے کودتے شرارتیں کرتے۔ وہ ایک جگہ ساکت بیٹھی رہتی۔ چھٹی ہوتی تو خالہ زیب اس کی ڈھیل چیر کو دھکیل کر گیٹ پر لے جاتیں۔ جہاں ڈرائیور کار لئے اس کا منتظر ہوتا — پھر وہ گھر آکر بھی بس اپنے کمرے میں مقید ہو جاتی۔

اپنی حالت مجبوری پر اس کا ننھا دل بے حد کڑھتا — وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی۔ یہ ہی وجہ تھی — کہ ضد میں آکر اُس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ باپ اور بھائی اس پر جبر نہ کر سکے۔ زوجاجہ کو گھر پر ٹیچر پڑھانے آنے لگی۔ لیکن اُسے کسی چیز کی لگن نہ تھی۔ جسم کی طرح اس کا دماغ بھی کند تھا۔

ہر ماہ ایک نئی ٹیوٹر اُس کے لئے رکھی جاتی پھر بھی وہ پڑھنے میں چل نہ سکی۔

پھران دنوں اس کے گھر بھابی بھی آگئیں - علی بھیا کا گھر بس گیا - بیٹے کا گھر بسا کر اُس کے ابا اللہ میاں کے گھر جا بسے - اور زوجاجہ خود کو بے سہارا محسوس کرنے لگی۔ لیکن اس وقت خالہ زیب ہی اس کا سب میں بڑا سہارہ بن گیئیں —— زوجاجہ کا سارا کام وہ ہی کرتی تھیں —— زوجاجہ فقط ان سے ہی گھر میں بولتی تھی - حالانکہ گھر میں اب بھابی کے دم سے رونق ہو گئی تھی - لیکن اس کی بھابی نے کبھی زوجاجہ کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا —— وہ حد درجے مغرور اور خود سر ہیں - اکثر علی احمد سے اب بھی ان کا بگاڑ رہتا — علی احمد شادی سے خوش نہ نظر آتے تھے - بظاہر ان کی زندگی میں ہر طرف سکون راحت تھی - دولت کی کمی نہ تھی - بیوی بھی تھی - اللہ میاں نے بچے بھی دیئے تھے۔ لیکن ان کی بیوی نے کبھی اپنے بچوں کی بھی دیکھ بھال نہ کی تھی - آیا کے حوالے بچوں کو رکھا تھا - وہ تو خود ہر وقت اپنے ہی نخروں میں تلملی رہتی تھیں - نہ گھر کی خبر تھی نہ بچوں کی - اور نہ میاں کی پروا تھی اُن کو -

گھر پر ملازموں کی اچھی بڑی تعداد موجود تھی - اس وجہ سے گھر کا شیرازہ ہی بکھرا ہوا تھا - کسی ملازم سے بیگم علی احمد کو ذرا سی شکایت ہوئی - اس کو نکال کر دوسرا رکھ لیا جاتا - آئے دن نوکروں کی وجہ سے گھر کی قیمتی اشیاء غائب ہوتی تھیں -

گھر میں نہ کوئی طور طریقہ تھا۔ نہ سلیقہ اور ڈھنگ نظر آتا تھا - اتنے نوکروں کے باوجود گھر گندہ رہتا - کھانا بدذائقہ پکتا —— علی احمد کی طبیعت نفاست پسند تھی لیکن کیسی پھوہڑ بیوی سے واسطہ پڑا تھا - وہ اتنے ملازموں کی موجودگی میں اپنا کام خود ہی کر لیتے — لیکن ان کی بیگم نے تو کبھی ان کو پانی کا ایک گلاس تک اٹھا کر نہ دیا تھا - اور نہ وہ کوئی اپنا کام خود کرتیں - کچن میں جانے سے اُن کا دم گھٹنے لگتا

تھا وہ تو خود کو بے تخت و تاج کی ملکہ تصور کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ ایک بہت بڑے باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ باپ مل اونر تھا۔ بے حد رئیس۔ لاکھوں کی جائیداد۔ بیٹی کے نام کر رکھی تھی۔ اور دولت کو ہی بیگم علی احمد سب کچھ سمجھتی تھیں۔

ان کو شوہر اتنا دولت مند نہ ملا تھا۔ اس وجہ سے ان کی نظروں میں جچا بھی نہ تھا شادی کے بعد بھی وہ باپ کی دولت سے کھیل رہی تھیں۔

علی احمد تو ان کی باپ کی دولت کا پاؤ حصہ بھی نہ کما سکتے۔ کچھ بڑے گھر سے مرعوب ہو کر دولت کی کشش محسوس کر کے۔ علی احمد کے مرحوم والد نے بیٹے کا رشتہ اُس گھر سے طے کیا تھا۔ علی احمد بے حد خوبرو تھے۔ اور ان کی بیگم کا شمار بدصورتوں میں ہوتا تھا۔ کالا رنگ موٹے موٹے نقش نگار۔ پھر ہر طرح کی بے فکری اور اچھی خوراک نے ان کی صحت بھی کافی اچھی کر دی تھی۔ اور دن بہ دن وہ فربہی کی طرف مائل نظر آتی تھیں۔ علی احمد کے دل کو بیوی ایک دم نہ بھائی تھی۔ لیکن وہ گذارہ کر رہے تھے۔ کوئی ایسی بات کرنی نہ چاہتے تھے۔ جس سے جگ ہنسائی ہو۔

لیکن بیوی کے سلوک نے ان سے زندگی کی بشاشت چھین لی تھی۔

وہ اکثر الجھے الجھے اور پریشان رہتے۔ بیگم علی احمد اور ان کے اختلاف کی وجہ زوجاجہ کا وجود بھی تھا۔ علی احمد کو بہن کے دکھوں سے اس کے وجود سے بے حد پیار تھا۔ پھر فقط ایک ہی تو بہن تھی اُن کی۔ اور بہنیں تو بھائیوں کو پیاری ہوتی ہی ہیں۔ چاہے وہ خوبصورت ہوں یا بدصورت۔ اپنے بچوں سے زیادہ وہ زوجاجہ کے قریب رہتے۔ دفتر سے آتے تو اس کے کمرے میں ہی اُس کے ہمراہ چائے پیتے۔ بیوی کو بھی وہ اس میں شریک کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن بیگم علی احمد کو کیا ضرورت تھی اس اپاہج لڑکی

کے قریب بھی پھٹکنے دی۔ وہ بے ضرر سی لڑکی ان کی نظروں کا کانٹا تھی۔ ان کو علی احمد کا بھی بہن کے قریب جانا اس سے باتیں کرنا اس کے لئے تحفے و تحائف لانا سخت بُرا لگتا اور وہ یہ برداشت نہ کر پاتی تھیں۔ پھر ان میں برداشت کرنے کی بالکل صلاحیت نہ تھی جو بات ذرا سی مرضی کے خلاف ہو۔ اس پر وہ ایک شور برپا کر دیتی تھیں۔ نوکروں پر حکم چلانے کی ان کو بچپن سے عادت تھی۔ اب میاں پر بھی حکم چلانا چاہتی تھیں۔

بہن جی بہلانے اور باتیں کرنے کے لئے گھر میں موجود تھی تو بیوی لانے کی کیا ضرورت تھی اکثر وہ علی احمد سے ایسی واہیات باتیں کر جاتیں۔

اُن کی دن رات کی یہ باتیں سن سن کر علی احمد بھی عاجز آ گئے تھے۔

اور پھر مرد زیادہ دیر برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہی رکھتے ہیں — وہ بھی ایک دن گرج پڑے بیوی پر برس پڑے۔ بس آفت آ گئی۔ بیگم علی احمد بھی خاموش رہنے والی نہ تھیں۔ خوب دونوں میں تکرار ہوتی۔ نوکر الگ ڈر گئے۔

زوجاجہ اپنے کمرے میں تھی۔ لیکن بھابی اور بھائی کے جھگڑے کی آواز اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی — وہ سہم کر رونے لگی۔ خالہ زیب بڑی تھیں۔ انہوں نے بیچ میں بولنا چاہا لیکن ہمت نہ پیدا کر سکیں۔ حیثیت تو وہ ملازم کی رکھتی تھیں نا۔ کس طرح بولیں۔ پھر اس جنگ کا انجام یہ ہوا۔ کہ بیگم علی احمد دونوں بچوں کو سمیٹ کر اپنے ابا کے گھر جا بیٹھیں۔ اور پھر باپ کے ذریعے علی احمد کو کچھ اور بے عزت کروایا۔

علی احمد آخر کب تک دبتے — کھلونا بنے رہتے۔ وہ بھی ان کو منانے نہ گئے۔ حالانکہ ان کو اپنے ننھے منے بچوں کی یاد اکثر ستاتی تھی۔ لیکن غصہ کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

"بھابی کے جانے سے زوجاجہ کے دل کو زبردست صدمہ پہنچا۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ بخار کی کیفیت میں بھی وہ علی سے یہ التجا کرتی کہ بھابی کو منا لائیں ۔ وہ رو رو کر بے حال ہو گئی تھی۔ اتنا بڑا صدمہ اس نے اپنے دل پر بٹھا لیا تھا ۔ کہ دن بہ دن اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی ۔ بھیا میں مر جاؤں گی اگر آپ بھابی کو واپس نہ لائے تو ۔ اُس نے بھائی کو یہ دھمکی دے ڈالی۔

زوجاجہ نے علی احمد کو شکست ماننے پر مجبور کر دیا تھا ۔ وہ بیوی کی خوشامد کر کے ۔ اس کی خطاؤں کو اپنی خطائیں مان کر اُسے واپس لے آئے ۔

لیکن چند ماہ بعد پھر وہ ہی نوبت آگئی ۔ اس بار علی احمد بھی بری طرح ضد میں آ گئے ۔ آخر کب تک وہ بیوی سے دبتے ۔ جس نے ان کی زندگی میں پیچ پیچ کا زہر گھول رکھا تھا ۔ نہ جانے بیگم علی احمد اس قدر پتھر دل کیوں تھیں ۔ جو ان کو زوجاجہ پر رحم نہ آتا تھا۔ علی احمد زوجاجہ کو کس طرح گھر سے دور کرتے ۔ ایسی حالت میں تو زوجاجہ کی شادی کا سوال بھی عمر بھر پیدا نہ ہو سکتا تھا ۔ وہ معذور تھی ۔ پھر اس سے کون شادی کر سکتا تھا ۔ اس بار زوجاجہ بھی بھائی کو بھابی کو واپس لانے کا کہہ کہہ کر ہار گئی ۔ لیکن علی احمد کی ضد نہ ٹوٹی ۔ اب بیگم علی احمد کو گھر چھوڑے ہوئے ۔ چار ماہ ہو گئے تھے ۔

اب وہ گرمیوں کا سیزن مری کے بنگلے پر گزارنے گئی ہوئی تھیں ۔ سیر سپاٹوں کے علاوہ ان کو کچھ اور نہ سوجھتا ۔ ازدواجی زندگی کی اس تلخی کو انہوں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا بچوں کو بھی وہ اپنے ساتھ نہ رکھتی تھیں لیکن باپ کے پاس بھی نہ چھوڑتی تھیں ۔

ان کے بچوں کی دیکھ بھال تو ملازم کرتے تھے ۔ ان کو بچوں کے مستقبل کی فکر بھی نہ تھی ۔ حالانکہ ان کی بڑی بیٹی سارہ اب ، سات آٹھ برس کی ہو رہی تھی ۔ لیکن بیگم

علی احمد حال میں مگن تھی۔ مستقبل تو ان کو دور نظر آتا تھا۔

سارہ زوجاجہ سے کافی مانوس تھی۔ اکثر اس کے قریب موقع پا کر آجاتی تھی۔ حالانکہ بیگم علی احمد اپنے بچوں کو بھی زوجاجہ سے دور رکھتی تھیں۔ یوں اس طرح جیسے خدانخواستہ زوجاجہ کو کوئی چھوت کی بیماری ہو — اور وہ ان کے بچوں کو بھی لگ جائے گی۔ بھابی کا سلوک بے حد اذیت ناک تھا۔ پھر بھی ان کے جانے سے زوجاجہ بے حد اداس اور گم سم ہو گئی تھی — دن بھر چپکے چپکے روتی رہتی ان دنوں اس کی استانی بھی اُسے پڑھانے سے انکار کر کے رخصت ہو چکی تھیں۔ کیونکہ زوجاجہ پڑھنے پر بالکل توجہ نہ دیتی تھی۔

اب علی احمد کو زوجاجہ کے لئے ایسی ہستی کی ضرورت تھی۔ جو اُسے پیار محبت سے پڑھا سکے۔ اس کی ہمدرد دوست ساتھی بن سکے اور وہ ہستی ان کو چاندنی کے روپ میں موزوں لگی۔

اور انہوں نے چاندنی کو منتخب کر لیا۔ آفس جانے سے قبل علی احمد روز کی طرح زوجاجہ کے کمرے میں آئے — چاندنی زوجاجہ کو ناشتہ کروانے میں مصروف تھی۔ آج زوجاجہ ہمیشہ کی طرح اداس نہ تھی۔ بلکہ وہ تو بے حد خوش نظر آرہی تھی۔

علی احمد کو دیکھ کر چاندنی احتراماً کھڑی ہو گئی۔ "ارے بھئی مس چاندنی ہم سے اتنا تکلف نہ برتیں"۔ وہ خوش دلی سے مسکرائے۔ اور پھر جلد وہ دونوں کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے — ان کے آفس کا وقت جو ہو چکا تھا وہ دن بھر کاروبار کی مصروفیات میں باہر گم رہتے تھے۔ شام یا کبھی رات کو واپس آتے تھے۔

علی احمد کے جانے کے بعد، چاندنی نے اپنا فرض اور ذمہ داری نبھانی شروع کر دی۔

زوجاجہ کا کمرہ اچھا خاصا کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ ملازم شاید ہفتوں اس کمرے کی صفائی نہ کرتے تھے۔ لیکن چاندنی تو بے حد نفاست پسند طبیعت رکھتی تھی۔ اس کا گھر بے حد چھوٹا اور بغیر کسی سامان کے تھا۔ لیکن ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ چاندنی نے خالہ زیب کے سہارے زوجاجہ کو پلنگ سے اتار کر کرسی پر بٹھا ڈالا۔

پھر اس کے پلنگ کی میلی چادر بدلی تکیئے کے غلاف بدلے۔ اپنے ہاتھوں سے سارا کمرہ صاف کیا۔ کمرہ چمکنے لگا۔ پھر وہ زوجاجہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ زوجاجہ بھی کمرے کی طرح گندی ہو رہی تھی۔ اور شاید گرمی کے اس شدید موسم میں بھی وہ ہفتے بھر نہ نہاتی تھی۔

چاندنی نے زوجاجہ کے صاف ستھرے کپڑے نکالے۔ اور اُسے نہانے بھیج دیا۔ نہا دھو کر زوجاجہ بے حد اچھی لگنے لگی۔ دوپہر ہو گئی۔ کھانا کمرے میں ہی آگیا۔ دونوں کھانا کھانے لگیں۔ اور خالہ زیب چاندنی سے اُس کی پوچھنے لگیں۔ اور ساتھ ساتھ اس گھر کی بھی سنانے لگیں — خالہ زیب سے پہلے ہی دن چاندنی کو سب کچھ معلوم ہو گیا — کہ علی احمد کی زندگی کتنی تلخ ہے۔ اس کو تو وہ بے حد مخلص سے لگتے تھے، سارا قصور ان کی بیوی کا محسوس ہوا — وہ بے حد دکھی ہو گئی علی احمد کی کہانی پر۔

دوپہر چاندنی زوجاجہ کو پڑھاتی رہی۔ پہلے دن اُسے علم ہو گیا۔ زوجاجہ پر اُسے کافی محنت کرنی پڑے گی۔ اور وہ محنت سے ڈرتی تھوڑی تھی — شام کی چائے ان لوگوں نے لان میں پی۔ حالانکہ زوجاجہ دن بھر اپنے کمرے میں ہی بند رہتی تھی۔

لیکن آج چاندنی اُسے کھلی فضا میں لے آئی تھی۔ اس طرح اندھیرا پھیلنے لگا اور چاندنی کے جانے کا وقت ہو گیا۔ علی احمد خود تو اب تک گھر نہ آئے تھے۔

لیکن چاندنی کے خیال سے انھوں نے ڈرائیور کو کار دے کر بھیج دیا تھا۔
کل آنے کے وعدے پر زوجاجہ سے رخصت ہو کر چاندنی گھر واپس آگئی۔

چاندنی کی آمد نے زوجاجہ کی زندگی بدل دی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اتنی خوش ہوئی تھی۔۔ اب اُس کے دل سے بھابی کے جانے کا خیال بھی جاتا رہا تھا۔ زوجاجہ اور چاندنی کی عمروں میں بس چند سال کا ہی فرق تھا۔ زوجاجہ چاندنی کو اپنا سب کچھ محسوس کرنے لگی۔ دوست ہم درد ساتھی۔ اس نے عمر بھر کوئی سہیلی نہ بنائی تھی۔ کبھی کسی محفل میں شریک نہ ہوئی تھی۔ وہ تو ازل سے اکیلی تھی۔ علی احمد کے بہت سے ملنے جلنے والوں کو تو یہ علم بھی نہ تھا۔ کہ ان کی ایک بہن بھی ہے۔ سب ان کو اپنے والدین کی واحد اولاد سمجھتے تھے۔ زوجاجہ نے تو اپنے بھائی کی شادی تک میں شرکت نہ کی تھی۔۔ ان دنوں وہ کافی چھوٹی ہوا کرتی تھی۔ سارا گھر اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ صرف خالہ زیب اُس کا سایہ بن کر اس کے ساتھ رہی تھیں۔۔ لیکن اُسے بھائی کی شادی کی بے حد خوشی تھی۔ لیکن بھابی نے تو گھر میں قدم رکھتے ہی اس کا ننھا منا معصوم سا دل بری طرح توڑ ڈالا تھا۔

پھر زوجاجہ نے بھابی کی نفرت محسوس کر کے خود ان سے کنارہ کر لیا تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کی سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔

لیکن چاندنی نے بہت جلد اس خلا کو پُر کر دیا تھا۔ زوجاجہ چاندنی کی آمد پر بے حد خوش تھی اس کی بجھی بجھی صورت آپ شاداب ہو گئی تھی۔ اور بہن کی اس تبدیلی کو محسوس

کر کے علی احمد بھی چاندنی سے بے حد خوش تھے۔

چاندنی اب روز سویرے ماں سے رخصت ہو کر علی احمد کے یہاں آجاتی تھی۔ محلے والوں کو یہ جستجو ضرور تھی۔ کہ چاندنی کو سویرے سویرے کس کی کار لینے آتی ہے۔؟ اور وہ کہاں جاتی ہے۔؟ طرح طرح کی زبانیں پھر اس کے خلاف افواہیں پھیلانے لگی تھیں۔ فاروق کا خیال تھا۔ چاندنی نے کسی دفتر میں ملازمت کر لی ہے۔ اور یہ سوچ کر ہی محلے کی ساری عورتیں اُس پر طرح طرح کی تہمتیں لگا کر دل کو ٹھنڈک پہنچانے کی کوشش کرتیں خوب تارا نے بیٹی کو دولت کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ایک دن جب کوئی گل کھلائے گی۔ چاندنی ۔ تب سر پکڑ کر روئے گی تارا ۔ چچی سنگدلی سے کہتی۔ لیکن چاندنی کو ایسی باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ گھر سے کوئی گناہ کرنے نہیں نکلتی تھی ایک بے کس کمزور لڑکی کا سہارا بن کر وہ تو ثواب کما رہی تھی۔

زوجاجہ تو چاندنی سے بے حد مانوس تھی۔ اس نے اپنے دل کی ہر بات چاندنی کو سنا ڈالی تھی۔ بھابی کی زیادتیوں کا ذکر بھی وہ اکثر کر کے اداس ہو جاتی۔ اور اس کی اداسی دور کرنے کے لئے چاندنی اُسے کافی دلاسہ دیتی۔ بے حد پیار سے سمجھاتی ——

علی احمد سے بھی اب چاندنی کی جھجک جاتی رہی تھی۔ لیکن وہ ان سے کھل کر بات نہ کر سکتی تھی۔ نہ جانے علی احمد سے اُسے اتنی گھبراہٹ کیوں محسوس ہوا کرتی تھی ——

اکثر شام کی چائے کے وقت تک وہ دفتر سے لوٹ آتے تھے۔ پھر چائے باہر لان میں پی جاتی۔ زوجاجہ کی وھیل چیر کو خالہ زیب دھکیل کر باہر لے آتیں۔

علی احمد کو چاندنی کی اداسی اور پھر گھبراہٹ کچھ اچھی ہی لگنے لگی تھی۔ وہ اس سے کوئی سوال کرتے۔ تو پہلے وہ گھبرا جاتی۔ پھر سنبھل کر اٹک کر جواب دیتی۔ اس کی اس ادا پر علی احمد کے لب مسکرانے لگتے۔ اور چاندنی کچھ شرمندگی محسوس کرنے لگتی۔

لیکن گذرتے وقت نے چاندنی کی یہ گھبراہٹ دور ہی کر دی۔

اکثر شام وہ زوجاجہ کو کار میں بٹھا کر باہر لے جاتے۔ چاندنی کا ساتھ ضروری ہوتا۔ علی احمد کے ساتھ چاندنی نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کر چکی تھی۔ پھر راستے بھر علی احمد گفتگو کرتے رہتے۔

باتوں ہی باتوں میں علی احمد نے چاندنی کے گھریلو حالات پوچھ ڈالے تھے۔

چاندنی کو تو اُن پر بے حد مان ہو چلا تھا۔ اُس نے ان کو اپنا ہمدرد جان کر اپنے حالات بتا ڈالے تھے۔ ماں کی مجبوریاں گنوا دی تھیں۔ اس نے زلیست کے صرف اندھیروں کو دیکھا تھا۔ اتنا کچھ بتا کر چاندنی رونے لگی تھی۔

اور اس کے یہ آنسو دیکھ کر علی احمد بے چین سے ہو گئے تھے۔ "چاندنی۔ یہ انمول آنسو یوں بیدردی سے تو لٹائے نہیں جاتے۔ آپ تو بے حد حوصلہ مند ہیں۔ ہمت ہارنے کے بجائے حالات کا مقابلہ کیا آپ نے" وہ اس کی بہت کچھ تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ۔ اُسے مناسب الفاظوں میں دیر تک سمجھاتے رہتے۔ طرح طرح کی مثالیں دیتے رہتے اور ان کی اتنی پر خلوص شفقت آمیز باتوں سے چاندنی کی بھیگی بھیگی آنکھیں آپ خشک ہو جاتیں۔

"چاندنی غم تو زندگی کا لازمی جز ہیں۔ کون انسان عمر بھر صرف خوشیاں سمیٹا ہے۔ سکھ تو اس دنیا میں انمول ہو گئے ہیں۔ یہ خریدنے والی چیز نہیں۔ علی احمد اکثر

اپنی بے سکونی کا اظہار چاندنی پر کر جاتے۔
اپنے غموں کی کہانی اب وہ کھلم کھلا الفاظوں میں چاندنی کو سنانے لگے تھے۔
چاندنی معصومیت سے یہ سب کچھ سنتی رہتی۔ وہ اتنی تجربہ کار تھوڑی تھی۔ جو ان کو کوئی مشورہ دے سکتی۔ ہاں اُسے علی احمد کی حالت پر بے حد دکھ ہونے لگتا۔

وہ بھی سب کچھ ہوتے ہوئے تنہا ہیں۔ — اُن کے دکھ کو محسوس کر کے علی احمد کو چاندنی نے ایک بار دبی دبی زبان میں یہ مشورہ دیا تھا — کہ وہ اپنی بیوی سے صلح کر لیں۔ بچوں کو پھر لے آئیں۔ آپ ہی آپ پھر اُن کا دل بھی آباد ہو جائے گا۔ اور گھر میں بھی رونق آ جائے گی۔

اونہہ — علی احمد تلخی سے ٹال گئے۔ تم بہت معصوم ہو — ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا چاندنی کہ دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ سکے۔ تم کہاں سمجھ سکو گی۔ تم کہاں سمجھو گی یہ باتیں — اب اکثر وہ اس طرح چاندنی کی تعریف کر جاتے — پھر اب تو وہ دن بہ دن چاندنی سے بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے اُسے احترام سے پکارتے مس چاندنی کہا کرتے۔ پھر صرف چاندنی کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ اور اب آپ سے تم پر آ گئے تھے۔ لیکن چاندنی یہ سب محسوس کر کے بھی اظہار نہ کرتی۔ کیوں کہ وہ اس سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ اور اُن کا یہ انداز اُسے بُرا بھی نہ لگتا تھا — لیکن پھر بھی وہ تکلف کی حدود کو پار کرنے کے حق میں نہ تھی۔ ویسے علی احمد دن بھر گھر سے باہر رہتے تھے۔ گہری شام کے ساتھ آتے تھے۔ جب چاندنی کا اُن سے ٹکراؤ ضرور ہوتا — زوجاجہ کا تو اب روز ہی باہر کا پھیر کو جی چاہنے لگا تھا۔ علی احمد بہن کی فرمائش کو کبھی ٹھکراتے۔ ڈرائیور کو چھٹی دے کر وہ کار خود ہی ڈرائیو کرتے۔

چاندنی کو روز روز کے یہ سیر سپاٹے ناپسند تھے ۔ علی احمد سے اس کا کون سا رشتہ تھا ۔ وہ اجنبی ہی تھے ۔ بقول اس کی امی کے کہ مرد کی ذات کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا ۔

یہ بات اس کے دل میں کھٹکتی ۔۔۔ وہ اکثر ان کے پروگرام میں شرکت نہ کرنے کی معذرت طلب کر لیتی ۔ لیکن علی احمد کب اس کی سنتے ۔

" تمہارے بغیر سیر کا کیا مزہ چاندنی " علی احمد نے ایک بار کہہ ہی ڈالا تھا جیسے صرف وہ اس کی وجہ سے باہر جاتے ہوں ۔

"جی" ۔ علی احمد کی اس بات پر چاندنی چونک پڑی ۔ گھبرائے گھبرائے انداز سے ان کو تکنے لگی ۔۔۔ ان کو شاید اپنے الفاظ کا اندازہ ہو گیا ۔ فوراً بات کا رخ بدلتے ہوئے بولے ۔ "تمہارے بغیر زوجاجہ جراداس ہو جائے گی" ۔

اور دل نہ کرتے ہوئے بھی چاندنی کو صرف زوجاجہ کی وجہ سے ان کا ساتھ دینا پڑتا ۔ اکثر سیر سپاٹے میں چاندنی کو گھر پہنچنے میں دیر ہو جاتی ۔۔۔ اور جب وہ اندھیرا پھیلنے کے بعد گھر میں داخل ہوتی تو تارا کی بے چین نظروں کو دروازے پر جما پاتی ۔

اکثر تارا اس کے دیر سے آنے پر ناراض ہو جاتی تھی ۔۔۔ اسے چاندنی کا دن بھر باہر رہنا سخت ناپسند تھا ۔ طرح طرح کے وہم اکثر اسے ستاتے تھے ۔ اکثر وہ ان خیالوں سے چھٹکارا پانے کے لئے چاندنی کو یہ مشورہ دیتی ۔ دن بھر کی یہ ملازمت چھوڑ دو چاندنی ۔ اب میں بھی ٹھیک ہوں ۔ جس طرح عمر بھر گذارہ کیا ہے ۔ سلائی کر کے آگے بھی کر ہی لیں گے ۔

ان دنوں اُسے چاندنی کی شادی کی بے حد فکر تھی - اُپنے ایک دو ملنے جلنے والوں سے جو دوسرے محلے میں رہتے تھے - اپنی اس پریشانی کا ذکر بھی کیا تھا۔ اب وہ بیٹی کے لئے کون سے محلوں کے خواب دیکھتی تھی - غریب کی بیٹی کو غریب گھر جانا تھا۔ بیگم ریاض کے کپڑے تارا ایک عرصے سے سیتی تھی - انہوں نے تارا کو چاندنی کے رشتے کے بارے میں اطمینان دلایا تھا - کہ وہ اپنی کوشش سے اس کی بیٹی کا گھر آباد کرنے میں ضرور اس کی مدد کریں گی ۔

لیکن اب تارا کو نہ جانے یہ کیوں محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ گھر سے باہر رہ کر چاندنی اس کی فرمانبردار نہیں رہی ہے - پہلے اس کا کتنا کہا مانتی تھی - اب بالکل نہ سنتی تھی اور دن بھر کی یہ ملازمت اُسے بے حد پسند تھی -

"امی یہ ملازمت چھوڑ کر میں اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی نہیں مار سکتی"۔

کتنی دشواری کے بعد اُسے یہ ملازمت ملی تھی - پھر ہر طرح کی سہولت اُسے میسّر تھی۔ گاڑی لینے بھی آتی تھی اور واپس پہنچانے بھی - علی احمد اس کے بن مانگے اُسے ایڈوانس روپے دے دیتے - چھ ماہ میں اُسے کسی سے شکایت نہ ہوئی تھی - بلکہ وہ اس گھر کے ماحول میں رچ بس گئی - زوجاجہ کے علاوہ اب وہ گھر کے کاموں میں بھی دخل اندازی کرنے لگی تھی - ڈرائنگ روم بھی اُس نے اچھی طرح سیٹ کر دیا تھا۔ ملازموں سے بھی کام کروانے لگی تھی - اس کی یہ فرض شناسی محسوس کر کے علی احمد اس سے بے حد خوش تھے -- اس کی تعریفیں کر کر کے ان کا منہ خشک ہو جاتا - اور ان تعریفی الفاظ میں --- اکثر وہ ناجائز الفاظ بھی استعمال کر جاتے ۔

"جتنی تم خوبصورت ہو -- ویسی فطرت بھی رکھتی ہو" ۔

حسن والوں کی ہر چیز میں حسن اور نزاکت ہوتی ہے — وہ چاندنی کی تعریف ایسے الفاظ میں کرتے — چاندنی کو یہ باتیں اچھی تو نہ لگتی تھیں۔ لیکن وہ کبھی اپنی خفگی کا ان پر اظہار نہ کرتی — پلکیں جھکا کر خاموشی سے بس ان کی باتیں سنتی رہتی تھی — پھر اپنی امی کے سامنے وہ صرف علی احمد کے گھر والوں کی تعریفیں کرتی۔

چاندنی نے تارا کو یہ نہ بتایا تھا۔ اور نہ بتانے کے حق میں تھی۔ کہ جس گھر میں اس کا پورا دن گذرتا ہے۔ اس گھر کی مالکن وہاں نہیں رہتی۔ اگر وہ صحیح بات ماں کو بتا دیتی۔ تو یقیناً تارا اُسے اس گھر میں ہرگز جانے نہ دیتی۔ ویسے وہ ماں سے اکثر بیگم علی احمد کے وہ قصے بیان کرتی — جو اُس نے اُن کے بارے میں سن رکھے تھے — کہ وہ حد درجے بدمزاج اور مغرور ہیں۔ اور زوجاجہ سے نفرت کرتی ہیں۔ جب ہی تو علی احمد نے بہن کے لئے اس کا انتخاب کر رکھا ہے۔ تاکہ وہ اداس نہ ہو —

ایک شام ماں کے خدشات دور کرنے کے لئے۔ وہ علی احمد اور زوجاجہ کو تارا سے ملانے لے آئی — اکثر شام علی احمد ہی اُسے گھر پہنچانے آتے تھے۔ کار میں زوجاجہ بھی موجود ہوتی۔

علی احمد سے وہ اکثر اپنی امی کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ اُن کی خواہش اُس کی امی سے ملنے کی تھی۔ لیکن زوجاجہ تو کار سے اتر نہ سکتی تھی۔ اس وجہ سے تارا اُن سے ملنے دروازے پر ہی آگئی — علی احمد نے تارا سے مل کر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ ساتھ ساتھ چاندنی کی تعریفیں کر ڈالیں۔

" آپ کی بیٹی نے ہم پر احسان کیا ہے۔ زوجاجہ ان کی وجہ سے اب بے حد

خوش رہنے لگی ہے۔ چاندنی بہت ہمدرد لڑکی ہے۔" اپنی تعریف پر چاندنی خوش ہو گئی۔ علی احمد کو دیکھ کر تارا کے چہرے پر بھی اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔ ساتھ اُسے زوجاجہ کی حالت پر ترس بھی آ گیا۔ اس عمر میں وہ کتنی لاچار اور بے کس تھی۔ اس کی بیٹی اس مجبور لڑکی کا سہارا بن کر نیکی ہی کما رہی تھی۔ اس کے دل کے خدشات دور ہو گئے۔ پھر علی احمد تو صورت سے شریف اور کافی عمر کے لگ رہے تھے۔ تارا کی خواہش تھی وہ لوگ اندر آتے۔ لیکن علی احمد نے زوجاجہ کی وجہ سے اس وقت معذرت طلب کر لی۔ وہ باہر کے باہر ہی رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی تارا اور چاندنی ان کی باتوں میں ہی الجھی رہیں۔

چاندنی کی وجہ سے علی احمد کا گھر کافی سنور گیا تھا — چاندنی کام میں دن بھر خالہ زیب کا ہاتھ بھی بٹاتی — خالہ زیب تو اس کی سادہ فطرت پر فدا تھیں۔

زوجاجہ کی مانند اُسے بھی چاہنے لگی تھیں۔ جب سے وہ آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح نہ تھکتی تھی ان کا آدھا کام چاندنی کر دیتی تھی۔ پھر اس نے خالہ زیب کے بہت سے کپڑے بھی سی دیے تھے۔ زوجاجہ کے کپڑے بھی وہ گھر سے بڑے شوق سے سی لاتی۔

اور ان کپڑوں کی سلائی کی عمدگی کی تعریف علی احمد بھی کر گئے تھے۔ زوجاجہ ہر بات پر خوش ہو کر اپنے بھائی کو ضرور بتاتی تھی — چاندنی کے چھوٹے چھوٹے کاموں کو اس گھر میں سراہا جاتا تھا — کہ چاندنی کا خوشیوں سے دور دل انمول سی خوشی سے بھر جاتا —

وہ اس گھر میں آ کر خود کتنا بہل گئی تھی — پہلے اس کے اعصاب پر صرف پریشانی چھائی رہتی۔ لیکن اب وہ اکثر خوش رہنے لگی تھی۔

خالہ زیب نہ جانے کیوں اُس کا مقابلہ بات بات پر بیگم علی احمد سے کیا کرتی تھیں "تجھ جیسا چاند اگر اس گھر میں چمکتا تو سب کے نصیب جاگ جاتے۔ قسمت والے ہوتے علی احمد اور یہ گھر۔"

لیکن جاہل بیوی کے ہاتھوں اللہ میاں نے تو علی احمد کی قسمت پھوڑ دی۔ بیگم علی احمد سے تو گھر کے ہر فرد کا جی بُرا تھا۔

خالہ زیب کو ایسی باتوں پر چاندنی ٹوک دیتی — "وہ اس گھر کی مالکن تھیں خالہ اور میں ملازمہ — میرا ان کا کیا مقابلہ — یہ سب کچھ میں اپنا فرض سمجھ کر کرتی ہوں"۔

"لیکن بیٹی فرض تو بیوی کا زیادہ ہوتا ہے" وہ چپ نہ ہوتیں۔

خالہ تم اس گھر میں بڑی ہو اُن کو لے آؤ نا جا کر — چاندنی ان کو مشورہ دیتی۔

"بیٹی عمر سے حیثیت کہاں بنتی ہے۔ ہوں تو درجے میں ملازم — وہ تو ہم کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتیں" خالہ زیب رنجیدہ سی ہو جاتیں۔ اور چاندنی ان کا دھیان ہٹانے کے لئے موضوع بدل دیتی۔

اُس کی محنت سے زوجاجہ پڑھنے میں کافی چل نکلی تھی۔ اور اُسے پڑھنے کا شوق بھی ہو گیا تھا۔ اپنے بھائی سے اب وہ اپنے لئے کہانی کی کتابیں منگوایا کرتی ویسے بھی اکثر علی احمد — زوجاجہ کے لئے کچھ نہ کچھ خرید لاتے — کبھی کپڑے یا سلی سلائی فراک۔ یا کوئی کھلونا۔ حالانکہ وہ کھلونوں سے بالکل نہ کھیلتی تھی۔

اور نہ ہی اس کی عمر کھلونوں سے کھیلنے کی رہی تھی۔ لیکن اپنے بھائی کی نظروں میں وہ اب بھی بچی ہی تو تھی — وہ یہ کھلونے احتیاط سے بھیا کے بچوں کے لئے ہی رکھ دیتی۔ اُسے امید تھی۔ ایک دن وہ ضرور اس گھر میں واپس آ جائیں گے۔

اس شام علی احمد کچھ جلدی ہی دفتر سے لوٹ آئے — آج وہ کافی خرید فروخت کر کے آئے تھے — ملازم کافی چیزوں کے بنڈل زوجاجہ کے کمرے میں رکھ گیا تھا۔ علی احمد بھی سیدھے زوجاجہ کے کمرے میں چلے آئے۔ چاندنی بھی وہاں

موجود تھی۔

علی احمد ڈبوں اور لفافوں سے چیزیں نکال نکال کر خوشی خوشی زوجاجہ کو دکھانے لگے — اس وقت کتنے عرصے بعد چاندنی کو اچانک شہید چچا کی یاد آگئی۔ وہ بھی اکثر اس طرح اس کے لئے دنیا جہاں کی چیزیں اٹھا لاتے۔ اور اس طرح اُسے خوش ہو کر دکھاتے — نہ جانے کہاں گئے تھے وہ — بے وفاؤں کی طرح لیکن چاندنی کا دل اب تک ان کے بے شمار احسانوں کو نہ فراموش کر سکا تھا۔ اور پھر اپنے بھولنے والی شے بھی تو نہیں ہوتے۔ اس وقت زوجاجہ کے کمرے میں علی احمد کی موجودگی میں بیٹھ کر — وہ شہید چچا کی یاد میں گم سی ہوگئی۔

اُسے اس بات کی خبر بھی نہ تھی کہ کب سے علی احمد اس کی محویت کو تاک رہے ہیں — اگر وہ اُسے نہ پکارتے تو وہ نہ جانے کب تک گم رہتی۔

"چاندنی۔ کیا آنکھیں کھول کر بھی سویا جاتا ہے۔" علی احمد کے لہجے میں شوخی تھی وہ چونک کر آنکھیں جھپکنے لگی۔ "میں سو تو نہیں رہی تھی"۔

"لیکن کسی حسین سے سپنے میں ضرور گم تھیں۔ علی احمد نے پھر خوش دلی سے کہا "نہیں تو۔" وہ انکار کرنے لگی۔

"اچھا — دل کی باتیں ہم سے بھی چھپائیں گی آپ —؟" — ان کا لہجہ کتنا بدلا تھا اونہہ — وہ بھلا کون ہوتے تھے اس کے — جو وہ دل کی بات بتاتی۔ پھر اس کے دل میں تو اس وقت اس کے شہید چچا تھے۔ لیکن وہ صرف علی احمد کی صورت معصومیت سے تک کر رہ گئی — شاید ان کی بات پر اُس کی رنگت بدل گئی تھی۔ جب ہی تو بس وہ مسلسل اُسے بڑی دلفریبی سے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی

اس ادا پر وہ گھبرانے لگی ۔

"چاندنی — یہ میں آپ کے لئے لایا تھا —" انہوں نے ایک بے حد خوبصورت رنگ کا ریشمی سوٹ کا کپڑا اچانک اُس کے آگے ڈال دیا ۔

"میرے لئے —" وہ حیرانی سے کبھی اس شوخ سرخ رنگ کے کپڑے کو اور کبھی علی احمد کو دیکھنے لگی ۔

"ہاں تمہارے لئے" ۔

"لیکن" ۔ چاندنی نے گھبرا کر تکلف برتنا چاہا ۔ وہ لینے سے انکار کرنا چاہتی تھی کہ اس کی زبان علی احمد نے خاموش کروا دی ۔

"انکار مت کرنا — آج نہ جانے میرا کیوں دل چاہنے لگا تھا — کہ تمہارے لئے بھی کچھ خریدوں اس سرخ رنگ پر نظر پڑی — اور میں نے تمہارے لئے منتخب کر لیا" ۔

"تمہیں پسند ہے نا —" وہ بڑے والہانہ انداز اور اپنائیت سے اس سے پوچھ رہے تھے — ان کے چہرے پر اس وقت کیا تھا ۔ آنکھیں کیا کہہ رہی تھیں ۔ علی احمد کے چہرے پر نظر ڈال کر ۔ چاندنی کی نظریں جھک گئیں ۔ اس وقت ان کا چہرہ اُسے کتنا اجنبی اجنبی لگنے لگا تھا — اس کا دل بری طرح ڈولنے لگا — آپ ہی آپ اُس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی — نظریں اٹھائے نا اٹھیں ۔

نہ جانے اُسے اس وقت کیا ہونے لگا تھا ۔ کہ جو کہنا چاہتی تھی ۔ وہ کہہ بھی نہ پا رہی تھی ۔ کم از کم اس تحفے کا اُسے شکریہ تو ضرور ادا کرنا تھا ۔ لیکن وہ یہ تحفہ قبول ہرگز کرنا نہ چاہتی تھی ۔ ہمت کر کے انکار کر ڈالا ۔

"چاندنی کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتی ہو" وہ نہ جانے کیوں اچانک اس پر اپنا حق جتانے لگے تھے ــــــ اور پھر بھلا ایک غیر انسان کو چاندنی اپنا کس طرح سمجھ سکتی تھی۔ ــ بے وقوف تھی۔ ان کی باتوں کے جواب دینے نہیں آ رہے تھے۔ اس وجہ شرمانے سے لگی تھی۔

اور علی احمد اُس سے یہ کہہ رہے تھے۔ جو چیز جس کا تصور لے کر خریدی جاتی ہے نا وہ اس کے پاس ہی اچھی لگتی ہے ــــــ اور چاندنی سر جھکا کر سب کچھ سنتی رہی "شام کی چائے۔ خالہ زیب نے کمرے میں ہی لگا دی ــــ روز چائے چاندنی بنایا کرتی تھی۔ لیکن آج اس پر کیسی مدہوشی سی طاری تھی۔ کہ بس ہاتھ پیر کانپتے جا رہے تھے۔ اس کی یہ کیفیت علی احمد کی عمیق اور تجربہ کار نظریں خوب محسوس کر رہی تھیں کیتلی چاندنی کے نازک ہاتھوں میں یوں کانپے جا رہی تھی۔ کہ چائے پیالیوں میں جانے کے بجائے۔ باہر چھلک رہی تھی۔

"کیا ہوا چاندنی" علی احمد سے چپ نہ رہا گیا۔

"جی" ــ اپنی حالت چھپانے کے لئے اس نے جھوٹ بولا ــــ "میرے سر میں شدید درد ہے" ــ اور وہ مسکرانے لگے ــــ "پھر ہم کو بتایا کیوں نہیں ــ اتنی دیر سے ہم یہی محسوس کر رہے ہیں۔

"چھپا چھپا کے خاموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشبیہہ بن گئی ہو تم"

انہوں نے اچانک یہ شعر پڑھ ڈالا ــــ وہ نہ جانے آج چاندنی کو اتنا سنانے کے موڈ میں کیوں تھے۔ ان کے اس شعر پر چاندنی کو رونا سا آ گیا ــــ علی احمد کی

یہ باتیں اب اس سے برداشت نہ ہو رہی تھیں۔ زبان نے ساتھ نہ دیا تو آنکھیں برسنے لگیں۔

اور علی احمد اس کے یہ آنسو دیکھ کر سخت گھبرا گئے۔ "کیا ہوا چاندنی۔۔؟

تمہاری طبیعت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔" وہ بے چینی سے اس سے مخاطب تھے۔ وہ پل بھر میں سنبھل گئی۔۔ دوپٹے سے اپنی بھیگی بھیگی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

"ارے ننھی منی سی بچیوں کی طرح تم نے رونا شروع کر دیا۔ چلو ڈاکٹر کے پاس۔۔" انہوں نے اس کا رونا طبیعت کی خرابی کی وجہ ہی سمجھا۔ لیکن وہ انکار کر گئی۔۔

اچھا تو سر درد کی دوا کھا لو۔۔"

وہ اندر جا کر خود اس کے لئے سر درد کی گولیاں لے آئے۔۔ پھر چائے بھی اپنے ہاتھوں سے انہوں نے اس کو بنا کر دی۔۔ چاندنی کے سر میں درد تو بالکل بھی نہ تھا۔ لیکن اداکاری نبھانے کے لئے اُسے دونوں گولیاں کھانی پڑیں۔

علی احمد تو سچ مچ پریشان سے ہو گئے تھے۔۔ اُسے کار میں بٹھا کر آج جلدی گھر چھوڑنے بھی چلے آئے۔۔ زوجاجہ کار میں موجود نہ تھی۔۔ چاندنی کو ان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنا اچھا بھی نہ لگ رہا تھا۔۔ لیکن اُسے بیٹھنا ہی پڑا۔۔ راستے بھر وہ دونوں خاموش رہے۔ روز چاندنی گھر آتی تھی۔ تو شام ہو چکی ہوتی تھی۔ گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوتی۔ لیکن آج تو اجالا تھا۔ گلی والوں نے اُسے بخوبی ایک مرد کے ساتھ کار میں اس کے برابر بیٹھے آتے دیکھ لیا تھا۔

کار چاندنی کے دروازے پر روک کر علی احمد نے خاموشی کو توڑا۔۔ چاندنی

تم مجھ سے ناراض تو نہیں ؟" انہوں نے شاید اس کے تاثرات کو پہچان لیا تھا۔

"جی نہیں تو۔" اُس نے معصومیت سے سر ہلایا۔ اور پھر اپنے دروازے پر ٹھہر کر وہ علی احمد سے زیادہ بات نہ کر سکتی تھی۔ انکو خدا حافظ کہہ کر ان کے کار اسٹارٹ کرنے سے قبل وہ اپنے گھر کا بند دروازہ کھٹکھٹانے لگی — اس کے ہاتھ میں سرخ رنگ کے کپڑے کا بنڈل موجود تھا۔ جس کو اس نے بے دلی سے ہی قبول کیا تھا۔

تارا نے بھی آج اس کے جلدی آنے کا سبب معلوم کر لیا۔ روز وہ رات کے قریب آتی تھی۔ اور ابھی تو دھوپ کے سائے باقی تھے۔

اس نے تارا سے بھی اپنے سر درد کا ہی بہانہ کیا۔ تارا تو اس کی ذرا سی تکلیف پر ہی گھبرا جاتی تھی۔" جاؤ جا کر لیٹ جاؤ — میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں —"

چائے پینے کا تو اس کا بالکل بھی موڈ نہ تھا۔ اس نے انکار کر ڈالا۔ اور ساتھ ساتھ ماں کے ہاتھ میں سرخ کپڑا بھی دے دیا —" امی یہ کپڑا زوجاجہ نے میرے لئے منگوایا تھا۔"

اس نے جھوٹ بولا — آج کل وہ بھی بڑی آسانی سے جھوٹ بولنے لگی تھی۔

زوجاجہ کے تحفے پر بھلا تارا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا — وہ اس کپڑے کی تعریف کرنے لگی — اور چاندنی سر درد کا بہانہ کر کے اپنے بستر میں گھس گئی۔

اس کے سر میں درد تو بالکل بھی نہ تھا۔ ہاں اس کے دل کو ضرور کچھ ہونے لگا تھا۔ الجھی سوچوں نے اس کے اوپر ایک جال سا بچھا دیا۔

وہ سکون سے آنکھیں بند کرنا چاہتی۔ تو ان بند آنکھوں کے پیچھے ایک اور تصویر ابھر آتی — اس کی سوچ کے زاویے علی احمد کی شخصیت سے بار بار ٹکرا رہے تھے۔

آنکھوں میں ان کی تصویر کھنچی چلی آ رہی تھی۔

"آج علی احمد کی باتیں — ان کی بولتی کہتی آنکھیں — ان کا تحفہ — ان کی مہربانیاں اُسے ایک خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا کرنے میں کافی تھیں۔ وہ ایک کچے ذہن کی اور نو عمر لڑکی تھی — جو دل میں جذبات رکھتی تھی۔ یہ جذبات کبھی بھڑک اٹھتے تھے۔ اور آج یہ جذبات اُسے بہکا بہکا کر ایک نئی ڈگر پر لے جانا چاہتے تھے — اُسے اپنی سوچوں سے گناہ کا احساس ضرور ہو رہا تھا۔ لیکن دل سے وہ علی احمد کا آیا ہوا خیال نہ نکال سکی۔

اس کی عمر کے یہ تقاضے تھے۔ کہ کوئی اُسے چاہے اس کی تمنا کرے۔ وہ بھی دل و دماغ میں کسی تصویر کو بسا کر تنہائیوں میں اُس سے دل بہلانا چاہتی تھی۔ وہ کسی کو چاہنے کی خواہش ضرور کرنے لگی تھی — لیکن ایسا کون تھا — ؟ — جسے وہ اپنی یہ انوکھی سی چاہت دیتی۔ جو اُسے چاہتا۔ اُسے پوچھتا۔ اُس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا۔

لیکن ایسے لمحات میں ایسا کوئی موڑ اب تک اس کی زندگی میں نہ آیا تھا — اس کی زندگی — چاہت کی خوشبو سے خالی تھی۔

لیکن آج آج یہ کیسی آرزو اس کے دل میں جگہ لے رہی تھی۔ یہ کس کی تصویر دل کی گہرائیوں میں جا چھپی تھی — یہ سب اس کا پاگل پن ہی تو تھا — کہ اس نے انتخاب بھی تو کیا تھا کس کا۔

اپنے سے دوگنی عمر رکھنے والے انسان کا — جو اس کے لئے پرخلوص تھا۔ اس سے اپنائیت برتنے لگا تھا۔

لیکن اس میں اور چاندنی میں کتنا واضح فرق تھا۔ وہ بال بچوں والا تھا۔ اُس

کی پہلی بیوی موجود تھی — پھر — پھر مجھے کیا حق پہنچتا ہے اس کے بارے میں سوچنے کا۔ وہ خیالات کی یلغار سے تنگ سی آگئی — ان سے چھٹکارا پانے کے لئے بستر سے نکل آئی — لیکن وہ تو رات بھر بھی — اپنی ان واہیات اور پاگل پن کی دل کو میٹھی میٹھی جلن بخشنے والی سوچوں سے فرار نہ حاصل کر سکی ۔

علی احمد کی مہربانیاں چاندنی کو خوابوں اور خیالوں میں ان کے بہت قریب کرتی جا رہی تھیں ۔ لیکن جب ان کا سامنا اس سے اصل میں ہوتا ۔ تو وہ گنگ ہو جاتی ۔ پہلے تو وہ ان سے بول بھی لیا کرتی تھی ۔ لیکن اب وہ بمشکل ان کے سامنے زبان کھولتی ۔

علی احمد اب بھی اُس سے ایسے جملے کہہ جاتے ۔ جن کو سن کر چاندنی ہواؤں کے دوش بدوش اڑنے لگتی —— وہ خوبصورت تھی ۔ معصوم تھی ۔ ہمدرد تھی —— رحم دل تھی ۔ یہ تمام تعریفیں علی احمد نے ہی کی تھیں ۔

علی احمد نے اپنے دوستوں کو کھانے پر بلایا ۔ سارا انتظام چاندنی نے کیا —— کھانے بھی خود پکائے —— اس دعوت کے انتظام اور چاندنی کے ہاتھ کے پکے کھانوں کی علی احمد ہفتوں تعریف کرتے رہے ۔ اب وہ اس سے اپنے چھوٹے موٹے کام کام کروانے لگے تھے ۔ چاندنی دیکھو اتنے نفیس سوٹ کا ملازم استری کر کے ستیاناس کر دیتے ہیں ۔ ذرا تم استری کر دو —— وہ اُسے اپنا کوٹ تھما جاتے ۔

اور ان کا سوٹ ہاتھ میں لے کر چاندنی گم سی ہو جاتی —— یہ مجھ پر اپنا اتنا حق کیوں جتانے لگے ہیں ۔ کیوں ۔ کیوں —— کیوں ۔

وہ نہ جانے علی احمد کی زبان سے کیا سننا چاہتی تھی ۔ کس اعتراف کی خواہش مند تھی ۔ اس کا دل بھی آج کل اس کے بس میں نہ رہا تھا ۔ علی احمد کے کام کرتے

وقت اس کا دل ایک راحت ایک عجیب سی خوشی محسوس کرنے لگا۔ نہ جانے اس کے دل نے اس سے کیسی آس باندھی تھی۔ کیسا رشتہ قائم کر لیا تھا۔ یا اندھا اور بے حس ہو گیا تھا۔ جو کچھ سوچا ہی نہ تھا — اب تو چاندنی اس گھر پر کافی اپنا حق جتانے لگی تھی۔

علی احمد کے کمرے میں وہ قدم نہ رکھتی تھی۔ لیکن اب وہ ان کی بکھری چیزوں کو سلیقے سے رکھ دیتی — ان کی بک شیلف سے کتابیں نکال لاتی — وہ فرمائش کرتے تو خوشی خوشی ان کی پسند کے کھانے بھی تیار کر کے رکھ دیتی۔

اس کا دل اب وہاں بہت لگنے لگا تھا۔ کبھی کبھار تارا کی بیماری کی وجہ سے وہ چھٹی بھی کر جاتی۔ تب پورا دن وہ بجھی بجھی رہتی۔ اس گھر کی یاد ستاتی رہتی۔

جس پر اس کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن اُس کا ضدی دل اب یہ نہ مانتا تھا۔ اب تو سردیوں کی رت شروع ہو گئی تھی۔ غضب کی سردی تھی۔ چاندنی کو اب تارا کی خدمت کا زیادہ موقع نہ ملتا تھا۔ دن بھر وہ گھر سے باہر جو رہتی تھی۔

تارا خود سے بھی اب بے حد لاپروا رہنے لگی تھی — اس نے نہ جانے کیا لاپروائی کی — کہ زبردست سردی لگ جانے سے نمونیہ کا شکار ہو گئی — اُسے زبردست بخار ہو گیا۔ ساتھ کھانسی بھی۔ سانس زور زور سے بجنے لگا۔ دن بھر میں اس کی حالت غیر ہو گئی — پھر ان دنوں تارا کو زبید کی یاد بے حد ستاتی تھی۔

چاندنی سے بھی وہ آجکل صرف زبید کی باتیں کیا کرتی — زبید کا خیال تو چاندنی کے دل سے بھی کبھی جدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ ماں کو ہمیشہ دلاسے دیتی تھی۔ دکھ کے یہ دن بیت ہی جائیں گے امی۔

جیل سے اکثر نوید کا خط آتا رہتا تھا۔ اس بار نوید نے اس کیفیت میں ڈوب کر خط لکھا تھا۔ کہ اس کا ایک ایک لفظ تارا کو تڑپا گیا تھا۔ اس کی بجھی بجھی آنکھیں نوید کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں۔ لیکن وہ بیٹے کو دیکھ نہ سکتی تھی۔ اس سے ملنے کوسوں پرے نہ جا سکتی تھی۔ کتنی مجبور اور لاچار تھی وہ۔

جب سے چاندنی نے باہر رہنا شروع کیا تھا۔ تارا دن بھر بھوکی پڑی رہتی اکیلے میں اس سے کچھ کھایا پیا بھی نہ جاتا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے اُسے ہر مرض جلد لاحق ہو جاتا تھا۔ اب سرد موسم نے بھی اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

رات چاندنی آئی۔ تو ماں کی بگڑتی حالت پر حواس باختہ ہو گئی —— اس اندھیرے میں ہی پیدل گلی عبور کر کے ڈاکٹر کو بلا لائی —— ڈاکٹر نے تارا کو نمونیہ ہی تجویز کیا۔ پھر چاندنی کو ضروری دواؤں کا نسخہ دے کر اور بہت سی ہدایت کرتا گیا۔ رات بھر چاندنی ماں کے سرہانے بیٹھی رہی۔ صبح جب علی احمد کی گاڑی وقت پر اُسے لینے آئی تو اس نے وہ واپس کر دی۔ ماں کی وجہ سے اس نے کافی دنوں وہاں نہ جانے کا سوچ لیا تھا —— اس دن بھی تارا بخار میں پھنکتی رہی۔ دوسری صبح چاندنی نے پھر گاڑی واپس کر دی —— شام علی احمد خلافِ توقع خود چلے آئے۔

تارا کو ڈاکٹر کی دوا سے نیند آ چکی تھی —— چاندنی نے اس کا جگانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن وہ علی احمد کو اپنے گھر دیکھ پریشان سی ضرور ہو گئی تھی۔

"چاندنی —— تم مجھے خبر کرتیں —— اپنی امی کی بیماری کی۔ میں ڈاکٹر بھیج دیتا" اس کی اداس پریشان سی صورت دیکھ کر ہمدردیاں جتلانے لگے۔

"چاندنی ماں کی وجہ سے سخت ہراساں تھی۔ پھر اکیلی تھی نا اس وجہ سے کوئی اس

کو تسلی تشفی دینے والا ابھی نہ تھا — ان کے منہ سے ایسے الفاظ سنے۔ تو پھر اُسے رونا آ گیا —

"ارے۔ پگلی لڑکی — تم رونے کیوں لگیں" علی احمد جیسے بیتاب سے ہو گئے — کرسی پر سے اٹھ کر اس کے بے حد قریب چلے آئے — چاندنی گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی تو علی احمد کو اپنی حالت کا اندازہ ہو گیا — چاندنی تم تو ہمت ور لڑکی ہو۔ اس طرح دل چھوٹا کر وگی تو پھر۔ کس طرح اپنی امی کی تیمارداری کر وگی" - انہوں نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

لیکن چاندنی مستقل سسک کر روتی رہی — وہ اُسے بڑی مشکل سے چپ کرانے میں کامیاب ہوئے — پھر وہ چاندنی کے پاس زیادہ نہ رکے۔ چلئے کبھی انکار کر ڈالا پھر آؤں گا تب جی بھر کے میری خاطریں کر لینا۔ لیکن اس وقت مجھے جلدی ہے۔ جاتے جاتے وہ یہ بھی کہنے لگے۔ کہ کل صبح وہ اپنے فیملی ڈاکٹر کو تارا کے علاج کے لئے بھیج دیں گے۔ تاکہ وہ جلد پھر اُن کے گھر کو رونق بخشنے آسکے۔

"چاندنی — آپ کے بغیر زوجاجہ بے حد اداس رہے گی" انہوں نے دروازے پر رک کر پھر اس کو مخاطب کیا "جی — مجھے بھی اس کا خیال ستاتا رہے گا۔ دعا کریں امی جلد صحت یاب ہو جائیں" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"ہاں چاندنی آپ کو جلد آنا ہے۔ زوجاجہ کی خاطر — میری خاطر" وہ یہ جملہ اس کے کانوں میں ڈال کر دروازے سے باہر نکل گئے۔

اور آنگن کھڑی چاندنی کھولا ہوا دروازہ بھی بند کرنا بھول گئی۔

میری خاطر — میری خاطر — علی احمد کا یہ جملہ اس کے کانوں میں گونج بن گیا

دروازہ بند کر کے — وہ کمرے میں آکر پھر بے ساختہ رونے لگی۔ لیکن اب اس کو چپ کرانے والا کوئی نہ تھا — چاندنی کس کی ہمدردیاں چاہتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اُسے کتنے پیار سے علی احمد دلاسہ دے رہے تھے۔ لیکن اب وہ جا چکے تھے۔ لیکن چاندنی کا دل پھر ویسی باتیں سننے کا چاہ رہا تھا۔ کاش وہ اب بھی اس کے قریب بیٹھتے یہ اُس کا دل بیتابی سے اس سے کہہ رہا تھا۔

صبح علی احمد کی کار میں ہی ڈرائیور کے ہمراہ ڈاکٹر بھی آگیا۔

فیس اور دوا کے پیسے علی احمد نے ڈاکٹر کو پیشگی بھجوا دیئے تھے۔ پھر وہ ڈاکٹر کافی بڑا اور شہرت یافتہ ڈاکٹر تھا — اچھی طرح تارا کا معائنہ کیا۔ دوسری دوائیں تجویز کیں۔ انجکشن بھی دیئے — اور تارا کو مکمل پرہیز اور آرام کا خیال کرتا گیا۔

علی احمد کی یہ مہربانی اب تارا کے دل پر بھی اثر انداز ہونے لگی تھی — کتنے نیک اور شریف لوگوں سے اس کی بیٹی کا واسطہ پڑا تھا — تارا تو علی احمد کی بے حد مشکور تھی —

ڈاکٹر پابندی سے روز تارا کو دیکھنے آتا — ایک ہفتے میں جاکر تارا کی طبیعت سنبھلی۔ چاندنی دس روز سے علی احمد کے یہاں نہیں جا رہی تھی۔ اور اس شام کے بعد علی احمد بھی نہیں آئے تھے — حالانکہ انجانے میں چاندنی کا دل روز شام ان کا انتظار کرتا — اور ایک دن اس کی یہ آس پوری ہو گئی۔ علی احمد آگئے۔ تارا اب کافی بہتر تھی — بڑی ممنون نظروں سے ان کا استقبال کیا — وہ بھی تارا کا احوال پوچھتے رہے۔ چاندنی نے کرسی ان کے قریب کھسکا دی۔ ویسے چاندنی کو اس وقت اپنے گھر کی ابتری اور کم مایگی کا احساس ہونے لگتا۔ جب علی احمد

اس کے گھر آئے تھے۔ ان کا گھر کتنا شاندار تھا۔ تارا کے گھر سے ان کا سرونٹ کوارٹر بھی اچھا تھا۔

کوئی ڈھنگ کی کرسی تک نہ تھی۔ لیکن علی احمد کی نظروں میں یہ سب کچھ نہ تھا۔ وہ بڑے خلوص سے ایک لگن لے کر وہاں آئے تھے۔ وہ آئے تو چاندنی ان کے لئے چائے بنانے چلی گئی۔ پہلے بھی وہ آئے تھے تو بغیر کچھ کھائے پیئے چلے گئے تھے ۔۔۔ علی احمد تارا سے ہی باتیں کرنے لگے۔

چاندنی چائے لے آئی ۔۔ وہ چائے پیتے ہوئے چاندنی سے بھی مخاطب تھے۔ زوجاجہ آپ کو بے حد یاد کرتی ہے۔

"جی میں جلد آنے کی کوشش کروں گی"۔۔ چاندنی نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

چاندنی اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کل چلی جانا ۔ تارا بیچ میں بول پڑی۔

"نہیں امی ۔ جب تک آپ بالکل صحت یاب نہیں ہو تیں میں آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی"۔۔ "چاندنی کو تو بس یوں ہی وہم ہو گیا ہے۔ مجھے بیمار سمجھ کر بستر سے ہلنے بھی نہیں دیتی۔

علی احمد کو بھی چاندنی کی تعریف کرنے کا موقع مل گیا۔

"چاندنی جیسی بیٹیاں خوش نصیبوں کو ہی ملتی ہیں" ۔۔ وہ بولے۔

اپنی تعریف پر چاندنی شرما گئی ۔۔ علی احمد چائے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔

چاندنی اخلاقی طور پر ان کو دروازے تک رخصت کرنے آئی۔

جاتے جاتے وہ اس پر اپنے دل کی بے چینی ظاہر کرتے گئے ۔۔ "چاندنی۔ تم نے جب سے آنا چھوڑا ہے۔ گھر کی ہر چیز جیسے تمہیں یاد کرتی ہے ۔۔ ایسا محسوس

ہوتا ہے ۔ تم نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔

چاندنی کا دل چاہا ۔ وہ ہمت کر کے علی احمد سے آج یہ کہہ ہی دے ۔ کہ اُس گھر پر بھلا اُس کا کیا حق ہے ۔ وہ کیوں اس کو خوش فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں ۔ وہ تو ایک تنخواہ پانے والی ملازمہ ہے ۔ اور کچھ بھی نہیں ۔ لیکن وہ — کچھ نہ کہہ سکی ۔ اور علی احمد اُسے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے ۔ چاندنی جب کمرے میں آئی تو ۔ تارا علی احمد کے خلوص کے اثر کو اب تک اپنے پر طاری کئے بیٹھی تھی چاندنی سے ان کی باتیں ہی کرنے لگی ۔

"کتنے اچھے انسان ہیں ۔ حالانکہ دولت مندوں میں اتنا خلوص نہیں پایا جاتا ۔ آج کل کے دور میں کون کسی کے کام آتا ہے ۔ تارا سچ ہی کہہ رہی تھی ۔ آجکل کوئی کسی کے کام آتا ہے اور اچانک تارا نے پھر چاندنی سے یہ سوال کر ڈالا ۔ "کیا ان کی بیوی بھی ایسی عادت کی مالک ہیں"۔

اس سوال پر چاندنی کچھ بوکھلا گئی — لیکن پھر خود پر قابو پا کر وہ ماں کو بتانے لگی ۔ کہ علی احمد اور ان کی بیوی جداگانہ طبیعت رکھتے ہیں ۔ لیکن اس کے یہ اب بھی نہ بتایا ۔ کہ اس نے آج تک بیگم علی احمد کو دیکھا ہی نہیں ۔ وہ تو اپنے اتنے اچھے میاں سے ان دنوں روٹھی بیٹھی ہیں ۔ لیکن اب وہ ماں سے علی احمد کا تذکرہ کرتے ہوئے کترانے لگی تھی ۔ ماں کا دھیان ٹپانے کے لئے اپنی بھوک کا اظہار کرنے لگی ۔ حالانکہ اُسے بالکل بھی بھوک نہ تھی ۔ تارا کے پاس سے اٹھ کر وہ کھانا گرم کرنے چولہے کے پاس آ بیٹھی — دل پھر آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا ۔ وہ علی احمد سے بے حد متاثر تھی ۔ ان کی باتوں پر اُس کا دل کیسا بے قابو ہو جاتا

تھا —

"وہ ان کی میٹھی باتوں کے بہکاوے میں بری طرح آتی جا رہی تھی۔ انجام سے بے خبر ہو کر — وہ صرف ان کے بارے میں ہی سوچتی رہتی۔ اب بھی صرف ذہن میں ان کی ہی سوچ تھی — نہ جانے وہ کب تک ان کے بارے میں سوچتی رہتی — کہ سالن جلنے کی خوشبو نے اُسے ان سوچوں سے جگا دیا۔ اپنے دل کی بے وقوفی پر وہ خود کو لعنت ملامت کر کے جلدی سے پلیٹوں میں کھانا نکالنے لگی۔

تقریباً پندرہ روز کی غیر حاضری کے بعد اس صبح چاندنی نے جیسے ہی علی ولا میں قدم رکھا اُسے وہاں کافی تبدیلی کا سا احساس ہوا - باہر ایک کے بجائے دو دو کاریں نظر آ رہی تھیں — ملازم بھی اِدھر اُدھر گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے - لیکن کسی سے کچھ پوچھنے کے بجائے چاندنی سیدھی زوجاجہ کے کمرے میں چلی آئی —— وہ چاندنی سے بگڑی ہوئی تھی - چاندنی نے اتنے روز اُسے انتظار کی کیفیت میں جو مبتلا کیا تھا - اب بھی اس نے چاندنی کو دیکھ کر اپنی برہمی کا اظہار کیا - "جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے" — اس نے چاندنی سے رُخ موڑ لیا -

"زوجی ہماری امی بہت بیمار تھیں - پھر ہم ان کو چھوڑ کر کیسے آتے" - چاندنی نے پیار سے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا — چاندنی کی اتنی پیاری ادا پر اُس کا غصہ جاتا رہا - "آپ اپنی امی کو بہت چاہتی ہیں" —— اچانک اس نے چاندنی سے یہ سوال کر ڈالا — "ہاں بہت پھر بیٹیاں تو ماؤں کو چاہا ہی کرتی ہیں زوجاجہ —"

چاندنی نے یہ کہہ کر زوجاجہ کو اداس کر دیا — زوجاجہ سے تو ماں کو چاہنے کا حق موت ہی چھین چکی تھی — زوجاجہ کی یہ اداسی چاندنی نے محسوس کر لی - اس کا دھیان بٹانے کو وہ اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی - کہ خالہ زیب بھی اس طرف آگئیں چاندنی کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہو گئیں - تمہاری غیر موجودگی میں میرا دل بھی اداس

ہو گیا تھا وہ بولیں - خالہ زیب بھی چاندنی کو بہت چاہنے لگی تھی -

"اس گھر کی بیگم بھی تو تشریف لے آئی ہیں" خالہ زیب نے یہ خبر سنا کر چاندنی کو حیران سا کر دیا — "ہاں جب علی احمد نے ہار نہ مانی تو خود ہی چلی آئیں - اور جب سے آئی ہیں - ہم غریبوں کی شامت آئی ہوئی ہے" - خالہ زیب کا لہجہ تلخ تھا -

"دس بج گئے - محترمہ اب تک سو کر نہیں اٹھی ہیں - بارہ بجے ناشتہ کریں گی ناشتہ ان کے لئے تیار کرنے جا رہی ہوں -" وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں -

زوجاجہ بھابی کی واپسی سے بالکل خوش نہ تھی - انہوں نے اس کے کمرے میں آ کر اس کی خیریت تک دریافت نہ کی تھی - اور نہ بچوں کو زوجاجہ سے کوئی لگاؤ تھا ان کے آنے سے زوجاجہ کے لئے کوئی فرق نہ پڑا تھا — وہ چاندنی کو بتانے لگی - بھیا نے اس بار لفٹ نہ دی بلانے نہیں گئے تو خود آ گئیں - ورنہ ہر بار بھائی جان کی ہوتی ہے -

چلو اچھا ہوا نہ جو آ گئیں — تمہارے بھائی جان تو خوش ہوں گے - کیسے اکیلے رہتے تھے" - چاندنی نے دل میں عجیب سی کیفیت محسوس کرتے ہوئے - زبان سے دوسرے الفاظ نکالے - بیگم علی احمد سے جا کر ملنا اس کا اخلاقی فرض تھا — زوجاجہ کے پاس سے اٹھ کر وہ دوسری طرف آ گئی - کریم کلر کے سوٹ میں وہ بڑی دلکش رہی تھی موسم کے اثر نے ان دنوں اس کی رنگت اور نکھار دی تھی — زوجاجہ کے کمرے سے نکلتے ہی اس کی مڈبھیڑ علی احمد سے ہو گئی - وہ اب تک آفس نہ گئے تھے - حالانکہ پہلے بہت سویرے چلے جاتے تھے بیوی کے آنے سے شاید انہوں نے اپنے ٹائم ٹیبل میں تبدیلی کر لی تھی -

"چاندنی - خوش آمدید - آپ آگئیں - اور بہت صبر آزما انتظار کے بعد" انہوں نے بے تابی سے کہا - لیکن اب چاندنی کو ان کی یہ بات اچھی نہ لگی - لیکن اپنے تاثرات چھپا کر خوش دلی سے مسکرا دی -

"آپ کو مبارک ہو - آپ کی بیگم بھی تو تشریف لے آئی ہیں" -

"اس میں مبارک باد کی کیا ضرورت ہے" علی احمد کے چہرے کی مسکراہٹ یک لخت ختم ہو گئی "اگر وہ نہ آتیں تب بھی میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا — میں نے اپنی سوچ کے زاویے کب کے اس کی طرف سے موڑ لئے ہیں" - وہ کافی ناخوش لگ رہے تھے -

چاندنی آگے کچھ نہ بول سکی — "میں ان سے ملنا چاہتی تھی" - اس کے منہ سے یہ ہی نکلا "تو اب دیر کس بات کی آپ بھی ان کے درشن کر لیں - وہ بھی آپ کی تعریفیں سن سن کر آپ سے ملنے کو بے چین نظر آتی ہیں" - علی احمد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا —

چاندنی ان کے پیچھے چلتی ہوئی - ان کے بیڈ روم کے دروازے پر رک گئی -

بیگم علی احمد ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی چہرے پر میک اپ کرنے میں مصروف تھیں - آئینے میں ہی انہوں نے چاندنی کے عکس کو گھور کر دیکھا — اور چاندنی بھی ان کو دیکھ کر حیران رہ گئی - سرخ بھڑکیلے لباس میں ان کی پکی سانولی رنگت لاکھ پوڈر تھوپنے سے بھی نہ چھپی تھی - ان کے بال ترشے ہوئے تھے — بے حد بھدے نقش کے ساتھ وہ حد درجے فربہ تھیں — دیکھنے میں اچھی خاصی بدشکل نظر آتی تھیں - چاندنی کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت کا طوفان امنڈ آیا - اسے علی احمد جیسے وجیہہ انسان کی پسند پر حیرت ہو رہی تھی — کیسی بے تکی جوڑی تھی دونوں کی -

"چاندنی آپ سے ملنے آئی ہیں" علی احمد نے بیوی کو بڑے ادب سے مخاطب کیا۔ وہ رخ موڑ کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کچھ اور سکیڑ کر چاندنی کو سر سے پیر تک بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ان کے اس انداز پر چاندنی عادت کے مطابق گھبرا سی گئی۔ بیگم علی احمد نے تو اس کے سلام کا جواب تک نہ دیا تھا۔

"تو یہ ہیں۔ مجسم چاندنی۔ جن کا ذکر سن سن کر میرے کان تھک چکے ہیں۔ جن کی کمی جب سے میں آئی ہوں۔ سب کو بڑی طرح اس گھر میں محسوس ہو رہی ہے"۔ ان کے لہجے میں چبھن تھی۔

یہ چبھن چاندنی کے دل نے محسوس کی۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ پردے کے پاس یوں ہی کھڑی رہی۔

"خوب میری غیر موجودگی میں تم نے اس گھر پر خوب سکہ جما لیا۔ ایسی ہوشیار کم ہی لڑکیاں ہوتی ہیں"۔ انہوں نے پھر دل کی بھڑاس نکالی۔ اور چاندنی ان کی زبان کے حملوں سے عاجز آ کر کمرے سے نکل گئی۔ لیکن جاتے جاتے اس نے بیگم علی احمد کے یہ الفاظ بخوبی سن لئے۔ جو وہ علی احمد سے کہہ رہی تھیں۔

"نوکرانی تو تم نے خوب چھانٹ کر رکھی ہے۔ فیشن سے تو گھر کی مالکہ لگ رہی ہے مجھے تو یہ لڑکی ایسی ویسی لگ رہی ہے"۔

علی احمد نے کیا جواب دیا۔ چاندنی نے یہ سننے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بیگم علی احمد نے پہلے ہی روز اس کا دل خراب کر دیا تھا۔ دل کی تلخی اس کی آنکھوں میں ابھر آئی۔ اس نے اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ گھر کا دھلا ہوا لباس۔ میک اپ سے عاری چہرہ نہ جانے بیگم علی احمد کو اس کا کون سا فیشن نظر آ گیا تھا۔ چاندنی اس

دن پورے دن زوجاجہ کے کمرے میں ہی رہی۔ حالانکہ پہلے وہ آزادی سے گھر میں اِدھر اُدھر پھر لیا کرتی تھی۔ دن بھر بیگم علی احمد نے زوجاجہ کے کمرے میں آکر جھانکا تک نہیں — بیگم علی احمد کے آنے کے بعد چاندنی پورے گھر سے کٹ گئی۔ اب وہ صرف زوجاجہ کے پاس ہی رہتی۔ علی احمد بھی چاندنی کی موجودگی میں زوجاجہ کے کمرے میں آنے سے کترانے لگے تھے۔ چاندنی زوجاجہ کی ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ پھر زوجاجہ کو بھی بھابی اور بچوں کی پروا نہ تھی۔ اس کے لئے چاندنی کی چاہت سب کچھ تھی۔

بیگم علی احمد زیادہ تر دن کا حصہ اپنی ماں کے گھر گذارا کرتی تھیں۔ یا پھر ہر شام کو بھڑکیلے لباسوں میں بن سنور کر سیر تفریح کو نکل جاتیں۔

نہ ان کو بچوں کی پروا تھی نہ میاں کی — چاندنی کو حیرت سی ہوتی کہ علی احمد کس طرح اس پھوہڑ جاہل عورت سے گذارہ کرتے آئے ہیں — ان کی کسی بات میں ڈھنگ اور سلیقہ نہ تھا۔ بچے الگ بدسلیقہ تھے۔ جب سے بچے آئے تھے، گھر کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ ہمیشہ غل غپاڑہ رہتا۔ بچے آپس میں لڑتے جھگڑتے اور رشتے داروں کے بچے بھی آجاتے۔ پلنگوں پر کودتے۔ کاغذ پھاڑ پھاڑ کر کمرہ بھر دیتے۔ باغ کے سارے پھول توڑ دیتے — خود الگ گندے رہتے۔ لیکن کسی بات پر کبھی ان کی ماں نے ان کو نہ ٹوکا تھا۔

علی احمد کبھی بچوں کو ایسی حرکتوں پر جھڑک دیتے تو بیگم علی احمد آڑے آجاتیں۔ ان کا منہ پھول جاتا — آپ تو بچوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنے بچوں سے آپ کو ایک دم محبت نہیں ہے۔ وہ سراسر ان پر الزام تراشی کرتیں۔ حالانکہ

علی احمد کو اپنے بچوں سے ویسی ہی محبت تھی۔ جیسی کہ باپ کو اپنی اولاد سے ہونی چاہیئے۔ بچوں کی ہر فرمائش وہ ضرور پوری کرتے۔ روز شام باہر سیر کو بھی لے جاتے۔ لیکن زوجاجہ کا وجود اس کی بھابی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس وجہ سے علی احمد مصلحت اس میں سمجھتے کہ زوجاجہ کو ہمراہ نہ لیتے اور زوجاجہ تو بے حد سمجھدار تھی۔ وہ خود بھائی اور بھابی کے درمیان حائل نہ ہونا چاہتی تھی۔

چاندنی اور علی احمد کا سامنا اب کم ہوتا۔ ویسے بھی ان دنوں چاندنی بے حد پریشان رہا کرتی تھی۔ تارا مستقل بیمار تھی۔ اس وجہ سے چاندنی کا دل زوجاجہ کے پاس نہ لگتا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ یہ ذمہ داری نبھا رہی تھی۔

"بیوی کے آنے کے بعد علی احمد بظاہر خود چاندنی سے اب تکلف برتنے لگے تھے۔ اب تو چاندنی کو ان کی صورت دیکھے ہوئے بھی دو تین دن گذر جاتے تھے — وہ اس بات کو اپنے لئے بہتر ہی سمجھتی تھی — علی احمد کی بے تکلفی اُسے اُسے غلط راہ پر گامزن کر رہی تھی — وہ بری طرح ان کی باتوں کے بہکاوے میں آگئی تھی۔ اب آپ ہی آپ اس نے اپنی سوچوں پر پہرے لگا دیئے۔

"علی احمد کسی اور کے تھے۔ اور اب ان کی بیوی ان کے پاس آچکی تھیں تو پھر — پھر اُسے ان پر حق جتانے کا ان کے بارے میں سوچنے کا کیا حق تھا۔ وہ تو اس کے لئے غیر تھے۔

پھر ان دنوں چاندنی صرف ماں کی فکر کو دل میں بسا کر گھلی جا رہی تھی — تارا اب مستقل بیمار رہنے لگی — نوید کی یاد میں دن رات تڑپتی — نیند میں اُسے ہی پکارتی — نوید کی جدائی اس کی سب سے بڑی بیماری تھی۔ اس بیماری کا حل نہ چاندنی کے پاس تھا اور نہ ڈاکٹروں کے پاس۔ نوید جیل میں تھا۔ ابھی تو صرف تین سال گذرے تھے۔ اور ابھی نو سال باقی تھے۔

تارا کی حالت دیکھ کر چاندنی بھی یہی سوچتی — کہ اس کی ناتواں ماں اتنے عرصے بیٹے کا انتظار نہیں کر پائے گی۔

چاندنی کا واحد سہارا ماں تو تھی ۔ لیکن تارا تو دن بہ دن زندگی کا حوصلہ کھو رہی تھی۔ چاندنی ان دنوں شدید پریشان تھی — تارا کی وجہ سے اب اکثر وہ زوجاجہ کے پاس نہ جا سکتی تھی ۔ ماں کو تنہا چھوڑنے پر اس کا دل راضی نہ ہوتا تھا ویسے بھی زوجاجہ کی تنہائی کا اُسے خیال نہ تھا۔ گھر میں اس کی بھابی اور بچوں کی آمد پر کافی رونق ہو گئی تھی ۔ لیکن زوجاجہ کو جو لگاؤ چاندنی سے تھا۔ وہ بھابی سے کہاں تھا ۔ وہ چاندنی کو ہی یاد کرتی رہتی ۔ اس دن چاندنی چار روز بعد علی احمد کے یہاں گئی تھی ۔ وہ آج بھی وہاں جانے کے موڈ میں نہ تھی ۔ لیکن تارا نے ہی اُسے وہاں اصرار کر کے بھیجا تھا ۔ کیونکہ چاندنی گھر سے نکل کر کچھ بہل جاتی تھی ۔

تارا کے ساتھ رہ کر وہ خود بھی بیمار ہو گئی تھی — کالی ساڑھی میں آج وہ بے حد پژمردہ سی دکھائی دیتی تھی ۔ رنگت نے پیلاہٹ اختیار کر لی تھی ۔ دن رات پریشان رہ کر اس کی خوبصورت آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمایاں ہو گئے تھے — آج تو کالی ساڑھی میں وہ بے حد کمزور لگ رہی تھی — چاندنی نے جب زوجاجہ کے کمرے میں قدم رکھا ۔ تو علی احمد زوجاجہ کے پاس ہی تھے ۔ زوجاجہ کی طبیعت بھی دو دن سے خراب تھی ۔ وہ برابر چاندنی کی رٹ لگائی ہوئے تھی ۔

علی احمد نے سوچا تھا وہ چاندنی کے گھر اس کی خیریت معلوم کرنے جائیں گے لیکن وہ خود ہی چلی آئی تھی ۔ لیکن صورت سے وہ بھی بیمار لگ رہی تھی ۔ علی احمد نے اس کی حالت محسوس کر لی — "چاندنی تم اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہو ۔ کیا بیمار تھیں"۔ علی احمد کے لہجے میں تڑپ تھی ۔ اپنائیت تھی ۔

ان کے اس طرح مخاطب کرنے پر چاندنی کو پھر رونا آ گیا — وہ اچانک اپنے

دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

"چاندنی - چاندنی - آخر کچھ تو بتاؤ — تمہاری امی تو خیریت سے ہیں نا"۔ ان کو چاندنی کے اس بری طرح رونے پر طرح طرح کے خیالات ستانے لگے تھے۔

نہیں وہ انکار میں گردن ہلانے لگی — "پھر تم نے مجھے خبر کیوں نہ کی۔ میں ڈاکٹر انعام کو بھیج دیتا"۔

"نہیں ان کا مرض لاعلاج ہے"۔ آج چاندنی حد درجے جذباتی ہو رہی تھی۔ روتے ہوئے بولی "نہیں - نہیں چاندنی - ایسی باتیں نہیں کرتے"۔ علی احمد نے اُسے بچوں کی طرح چمکارا تم اتنی مایوس نہ ہو - چاندنی کو روتا دیکھ کر زوجاجہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔

"ان کے مرض کا علاج کوئی نہیں کر سکتا"۔ چاندنی نے پھر وہی بات دہرائی ویسے اس نے علی احمد کو پہلے اپنے دکھوں کی داستان سنا ڈالی تھی — لیکن نوید کی گرفتاری اور قید کے بارے میں چھپا گئی تھی - لیکن آج اُس نے ان کے پوچھے بنا، اُن سے سچ بول ڈالا - نوید کے بارے میں اپنی بتا ڈالا — "بھیا کا غم امی کو اندر اندر کھوکھلا کر گیا ہے"۔ اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

چاندنی کے لبوں سے نوید کی داستان سن کر علی احمد بھی رنجیدہ ہو گئے کافی دیر تک گم سم رہے - پھر چاندنی سے شکایت آمیز لہجے میں مخاطب ہوئے۔

"اتنے عرصے تم یہ سب مجھ سے کیوں چھپاتی رہیں چاندنی"؟

وہ گردن جھکائے بیٹھی رہی۔

چاندنی نوید کے لئے کوئی کچھ نہ کر سکا — لیکن شاید میں تمہاری مدد کر سکتا۔

نوید آپ مجرم نہ بنا ہوگا - اُسے کسی نے آلہ کار بنایا ہوگا - وہ تو کسی کی پشت پناہی میں کام کرتا ہوگا - سزا اس کو ہوگئی - لیکن اب بھی کچھ ہو سکتا ہے -

چاندنی کی مدد کرنے پر اُن کا دل فوراً آمادہ ہوگیا -

"کس طرح ——؟" - چاندنی نے ان سے بے ساختہ سوال کر ڈالا - بھیا کو سزا بھگتے ہوئے تین سال تو ہو چکے"

چاندنی رسوخ اور پیسے کے زور سے کیا نہیں ہو سکتا - چاندنی تم بے فکر رہو - میں اب بھی نوید کے لئے کچھ کر سکتا ہوں - بڑے بڑے لوگوں سے میرا ملنا جلنا ہے - کسی ایڈووکیٹ سے میں مشورہ کر کے پھر کوئی کارروائی شروع کروں گا

وہ چاندنی کو دلاسہ دینے لگے -

اور چاندنی ان کی باتیں سن کر بے حد پُرسکون ہوگئی - وہ کتنے اچھے تھے - بالکل فرشتوں کے مانند - کتنے ہمدرد تھے —— چاندنی تو ان کی بے حد ممنون تھی - ان کی باتوں نے اُسے کتنا حوصلہ بخش دیا تھا اس کا دل بے اختیار علی احمد کے قدموں پر جھکنے کو چاہنے لگا - لیکن وہ یہ احمقانہ حرکت نہ کر سکی - ہاں زبان سے ان کے خلوص کا ضرور احسان ماننے لگی —— "آپ نے میری بہت مدد کی ہے - میں آپ کا احسان کبھی فراموش نہ کروں گی - آپ بہت اچھے ہیں - بے حد اچھے" ——

اُس کی آواز پھر کانپنے لگی —— وہ اپنی بھیگی آنکھوں کو دوپٹے سے خشک کرنے لگی ——

"چاندنی یہ تمام باتیں بعد کے لئے اٹھا رکھو - ابھی تو میں نے تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کیا" علی احمد نے آگے بڑھ کر چاندنی کو نہ جانے کون سے جذبے کے

تحت کاندھوں سے تھام لیا - وہ ان کی اس حرکت پر کچھ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی - اور اُس ہی پل جیسے قیامت آگئی - ہوا یوں — کہ بیگم علی احمد کب سے ناشتے کی میز پر بیٹھی علی احمد کی منتظر تھیں - اس بار وہ کچھ اپنی عادات اور خصلتیں تبدیل کر کے آئی تھیں - ورنہ پہلے وہ علی احمد کے ہمراہ ناشتہ ہی نہ کرتی تھیں - لیکن علی احمد کی طویل خاموشی اور بے رخی نے ان کو تھوڑا سا جھکنے پر مجبور کر دیا تھا - علی احمد کب سے زوجاجہ کے کمرے میں تھے - صبح زوجاجہ کو ڈاکٹر دیکھنے آیا تھا — اُسے دو دن سے بخار تھا اس وجہ سے علی احمد نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلا لیا تھا - اور اب ڈاکٹر تو کب کا جا چکا تھا اور بیگم علی احمد نے چاندنی کو کافی قبل زوجاجہ کے کمرے میں جاتے دیکھا تھا -

علی احمد اور چاندنی دونوں یکجا زوجاجہ کے کمرے میں تھے - بیگم علی احمد بے بات چاندنی سے مشکوک تھیں -

چاندنی ان کو زہر لگتی تھی - اس کی بے پناہ خوبصورتی سے وہ جلتی تھیں - انہوں نے پہلی نظر میں دیکھ کر اپنے دل میں حسد کی آگ سی محسوس کی تھی - یہ غیر لڑکی — جو بے حد خوب صورت اور جوان تھی - ایک طویل عرصے سے ان کی غیر موجودگی میں دن بھر ان کے شوہر کے گھر میں رہا کرتی تھی -

طرح طرح کے وہم ان کے دل میں سر ابھارنے لگے تھے - پھر اپنی ماں کے اس اصرار پر ہی وہ علی احمد کے بغیر واپس آگئی تھیں - کہ ان کے سلوک کی وجہ سے علی احمد بدل نہ جائیں اور کسی غیر لڑکی میں دلچسپی نہ لینے لگیں - علی احمد ان کے شوہر تھے - بھلا وہ کس طرح یہ برداشت کر سکتی تھیں - کہ ان کا شوہر کسی کی طرف آنکھ اٹھا

کر بھی دیکھے۔ واپس آئیں ——— تو گھر میں ہر طرف چاندنی کے قصے تھے ملازم تک اُن کے گرویدہ تھے۔ سب پر اس کا سکہ تھا۔ علی احمد نے بھی چاندنی کی اُن سے تعریف کی۔ اونہہ چاندنی۔ چاندنی۔ نہ جانے وہ ہے کون۔ ۔ اسے بنا دیکھے ان کو چاندنی سے بیر سا ہو گیا۔ چاندنی ان کے آنے کے تقریباً ایک ہفتے بعد وہاں آئی تو ــ اس کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئیں۔

کتنا حسن تھا اس میں کتنی پاکیزگی تھی۔ متاثر کن حسن تھا اس کا ــ اور پھر انہوں نے اس ہی دن علی احمد کو مشورہ دیا۔ کہ چاندنی کو ملازمت سے علیحدہ کر دیں۔ جوان اور خوبصورت لڑکی کو وہ گھر میں رکھ کر کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھیں۔

لیکن علی احمد نے ان کی بات کا نوٹس نہ لیا۔ وہ کسی صورت میں چاندنی کو علیحدہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ "زوجاجہ اُس سے بے حد مانوس ہے۔ میں زوجاجہ پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔" انہوں نے اس بات کے لئے زوجاجہ کی آڑ لی ــ علی احمد کے انکار پہ بیگم علی احمد کا جی جل کر خاک ہو گیا ــ اب وہ ہمیشہ علی احمد پر کڑی نظر رکھنے لگی تھی۔ لیکن چاندنی کی موجودگی میں وہ زوجاجہ کے کمرے میں نہ جاتے تھے۔ اور پھر وہ تو دن بھر باہر رہتے۔ شام آتے تب چاندنی واپس جانے کو تیار کھڑی ہوتی ــ علی احمد چاہتے ہوئے بھی اس سے بات نہ کر سکتے تھے۔ وہ اپنی بیوی کی فطرت سے واقف تھے۔ اُن کو یہ بھی علم تھا۔ کہ چاندنی ان کو بے حد بُری لگتی ہے۔ وہ اس کو ملازموں کی حیثیت دیتی تھی۔

چاندنی غریب تھی وہ دولت مند ــ اور بیگم علی احمد کی نظروں میں غربت نہایت ذلیل شے تھی غریبوں کو وہ عزت دار نہ سمجھتی تھیں۔ جب ہی تو وہ اپنے ملازموں

کو بات بات پر ذلیل کر کے نکال دیا کرتی تھیں۔ اگر چاندنی کو نکالنا ان کے بس میں ہوتا تو وہ کب کا نکال چکی ہوتیں — لیکن چاندنی پر ان کا بس نہ چلتا تھا۔ پھر چاندنی سے اُن کا واسطہ بھی کیا تھا۔

چاندنی اگر سامنے ہوتی جب بھی وہ اُسے منہ نہ لگاتی تھیں۔ اپنے ملازموں سے بلے وجہ بات کرنا وہ اپنی توہین سمجھتی تھیں۔

اور اب کتنی دیر سے علی احمد اور چاندنی زوجاجہ کے کمرے میں تھے۔ دل میں طرح طرح کے شکوک کو جنم دیتی ہوئی وہ دبے پاؤں زوجاجہ کے کمرے کی طرف چل پڑیں۔

چاندنی کی کانپتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی — وہ علی احمد کی تعریف کر رہی تھی — آپ کتنے اچھے ہیں۔ یہ الفاظ ان کو بُری طرح بھڑکا گئے وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ ایک جھٹکے سے انہوں نے دروازے کا پردہ نوچ ڈالا۔

پھر اُن کی نظروں نے یہ بھی دیکھا۔

کہ علی احمد چاندنی کو دونوں شانوں سے تھامے اس کے کتنے قریب کھڑے تھے۔ بیگم علی احمد کے شکوک و شبہات یقین میں بدل گئے۔ ایک بے بنیاد کہانی نے ان کے دل میں جنم لے لیا۔ یہ سب کچھ ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح آگے بڑھیں۔ ان کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ آنکھیں قہر برسا رہی تھیں لہٰذا انہوں نے قہر آلود نظروں سے چاندنی کو گھورا۔ تو وہ سہم گئی۔ ان نظروں سے بچنے کے لئے دیوار سے لگ کر خوفزدہ نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ بیگم کے اس انداز پر علی احمد بھی ہراساں ہو گئے۔ وہ اچانک ہی

حملہ آور ہو گئی تھیں۔

"کمینی۔ نیچ تو اس گھر میں اس لئے آئی تھی"۔ انہوں نے غصے میں گرج کر چاندنی کو مخاطب کیا۔

وہ مجرموں کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ اس انداز میں کبھی کسی نے اس کو مخاطب نہ کیا تھا۔ اور بیگم علی احمد اسے جی بھر کے گالیاں دے رہی تھیں۔

تجھ جیسی لڑکیاں دوسروں کے مردوں کو پھانسنے کے گر جانتی ہیں۔ یہاں آکر تو اپنی اوقات بھول گئی — اس گھر پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگی۔

یہ سارے الزامات بے بنیاد تھے۔ لیکن چاندنی تو اس وقت سچ مچ مجرم بنی کھڑی تھی — علی احمد بھی گنگ تھے۔

بیگم علی احمد بن بادل برسات کی طرح اچانک اس پر گرج اور برس پڑی تھیں۔ چاندنی مظلوموں کی طرح رونے لگی — ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ علی احمد اپنے تمام حواس جمع کر کے آخر چاندنی کے بچاؤ کی خاطر بیوی سے الجھ گئے۔ "ہوش میں آؤ بیگم — ایک شریف لڑکی پر یہ بہتان لگاتے ہوئے تم ذرا سا سوچ تو لیتیں —" چاندنی کی حمایت پر بیگم علی احمد اور بھڑک گئیں۔

"ہوش میں تو اب آئی ہوں — تم کیوں اس کے اتنے ہمدرد ہو۔ کون لگتی ہے یہ تمہاری — جو برا لگ گیا۔ ایسے نیچ خاندان کی لڑکیوں سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ جو مظلومیت کی کہانی سنا کر دوسروں کے گھر اجاڑ دیتی ہیں۔ دوسروں کے گھر پر قبضہ کر لیتی ہیں"۔ ان کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ ایک رفتار سے مسلسل بول رہی تھیں۔

"علی احمد چاندنی پر یہ الزام تراشی بالکل برداشت نہ کر سکے۔
بیوی سے الجھ پڑے۔ لڑائی عروج پر پہنچ گئی۔ بیگم علی احمد متواتر چاندنی کو گالیاں دے رہی تھیں۔ طرح طرح کے بہتان لگا رہی تھیں اس پر۔

"ہاں ہاں۔ تم نے اس سے گھر آباد کر ہی لیا تھا۔ تمہیں میری کیا پڑی تھی۔ اس کمینی نے تم کو اپنے جال میں بری طرح پھانس لیا ہے۔" چیخ چیخ کر انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سارے ملازم بھی کام بھول کر تماشائی بنے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

ایسی شرمناک باتوں پر علی احمد آپے سے باہر ہو رہے تھے۔

اس وقت بیگم احمد کا شوہر پر تو بس نہ چلا۔ چاندنی پر برس پڑیں۔

بیچ آوارہ — نکل جا اس گھر سے۔ اگر اس دہلیز پر پھر قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ دوں گی"۔

زوجاجہ تو پہلے ہی رو رہی تھی۔ بھابی کا یہ حکم سن کر وہ زور زور سے رونے لگی۔ "نہیں میں چاندنی باجی کو نہیں جانے دوں گی۔

چپ کر۔ بیگم علی احمد نے جنون کی حالت میں ایک زوردار تھپڑ زوجاجہ کے منہ پر لگا دیا۔ لیکن زوجاجہ خاموش نہ ہوئی"۔

چاندنی کو بیگم علی احمد نکل جانے کا حکم دے چکی تھیں۔ کتنی ذلیل ہو کر وہ اس گھر سے نکل رہی تھی۔ لیکن مجبور تھی بے بس تھی — آنسوؤں سے تر تر چہرہ لئے۔ وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔ لیکن اس کی ساڑھی کا پلو زوجاجہ کے ہاتھ میں آ گیا "مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ چاندنی باجی" — زوجاجہ کے لہجے میں تڑپ تھی۔ وہ بُری طرح

رو رہی تھی۔ لیکن چاندنی کو اس وقت صرف اپنی بے عزتی کا خیال تھا۔ اُسے کسی بات کی ہوش نہ تھی۔ زوجاجہ پر رحم نہ آیا۔

"مجھے چھوڑ دو زوجاجہ — اس گھر میں اب میں ایک منٹ میں رہنا نہیں چاہتی۔" اس نے ایک جھٹکے سے زوجاجہ کے کمزور ہاتھوں سے پلو چھوڑا لیا۔ "میں مر جاؤں گی۔"

چاندنی باجی — "جاتے جاتے زوجاجہ کی یہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ لیکن اس نے مڑ کر زوجاجہ کی طرف دیکھا بھی نہیں — اور پھر دیکھتی بھی کیسے۔ آنسوؤں کی ایک دھند نے اس کی نظروں کے آگے ایک چادر سی تان رکھی تھی۔ اس کا وجود بری طرح تھرتھرا رہا تھا۔ اس سے چلا بھی نہ جا رہا تھا۔

اُسے جاتا دیکھ کر علی احمد — اس کے پیچھے لپکے۔

"چاندنی یوں اس طرح مت جاؤ۔" لیکن اس نے کسی کی نہ سُنی۔ تیزی سے گیٹ کے باہر نکل گئی — ساڑھی کے پلو سے اُس نے چہرہ صاف کیا۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا لیا۔ ورنہ ہر جاتا راہ گذر اس کے یہ آنسو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اُسے ایک رکشہ مل گیا۔ رکشہ میں بیٹھ کر اُس نے اپنی غیر ہوتی حالت پر قابو پا ہی لیا آنکھیں خشک کیں۔ لیکن اس کا دل اب بھی چپکے چپکے رو رہا تھا — اگر امی کو یہ سب معلوم ہو گیا تو پھر —؟ — وہ مجھے بھی ضرور الزام دیں گی۔ وہ تو پہلے ہی اس بات کے خلاف تھیں۔ لیکن میرے دل پر جو قیامت بیت رہی ہے۔ اس کی خبر میں کبھی امی کو نہ ہونے دوں گی — اس نے اس ہی میں بھلا سمجھا۔

وہ گھر پہنچی تو تارا اُسے دیکھ کر حیران ہو گئی — چاندنی تھوڑی دیر پہلے

گئی تھی۔ "اتنے جلدی واپس کیسے آگئیں۔"؟ ۔ اس نے اس کی صورت دیکھ کر سوال کیا۔ چاندنی کی صورت بے حد اتری ہوئی تھی۔

"امی میرا دل آپ کی طرف سے بے حد پریشان تھا۔ اور پھر میری طبیعت بھی اچانک بگڑ سی گئی۔ تو بیگم علی احمد نے مجھے چند دنوں کی اور چھٹی دے دی"۔ اس نے تارا کو مطمئن کر دیا۔

لیکن اس کا دل اب بھی بری طرح ڈول رہا تھا ڈوب رہا تھا۔ دل پر کیا بیت رہی تھی۔ یہ تو وہ خود ہی جانتی تھی۔

دو دن بیت گئے۔ لیکن چاندنی کو علی احمد کے یہاں سے کوئی بلانے نہیں آیا۔ اسے توقع تھی شاید علی احمد اس سے معافی مانگنے آجائیں۔ پھر وہ ان کو ہی ذلیل کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتی تھی۔ ان کی ہی حرکت کی وجہ سے وہ اتنی ذلیل ہوئی تھی۔ بیگم علی احمد کی باتوں کے زخم اس کے دل میں گھاؤ ڈال گئے تھے۔ وہ ماں سے چھپ چھپ کر رویا کرتی تھی۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں اب اکثر گلابی گلابی رہنے لگی تھیں۔ وہ چہرے سے لاغر اور کمزور دکھائی دیتی تھی۔ لیکن کبھی کبھار وہ خود کو بھی قصور وار اور مجرم گردانتی۔ اس کے دل میں علی احمد کا خیال ضرور تھا۔ اور وہ یہ ـــــ محسوس کر رہی تھی۔ شاید بیگم علی احمد نے اس کے دل پر لکھی وہ تحریر پڑھ لی ہے۔ یہ دل کتنا بُرا تھا۔ جس نے انجانے میں ایک انہونی سی خواہش کی تھی۔ کسی کی امانت میں خیانت کی تھی۔ لیکن دل کی باتیں تو پوشیدہ ہوتی ہیں۔

لیکن اس کی زبان تو کبھی غیر اخلاقی یا کوئی ناجائز بات منہ سے نہیں نکالتی تھی۔ پھر کیوں وہ اتنا ذلیل ہوئی ـــــ اس دن تو اس نے نوید کا تذکرہ کیا تھا۔ ایسے میں

وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔ اور علی احمد بے چین ہو کر کیوں اس کے قریب چلے آئے تھے۔ قصوروار وہ تھے۔ بیکار اس نے سزا پائی — کتنی ہتک کی تھی بیگم علی احمد نے اس کی بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا۔ غم اور غصے سے اس کا دل پھر جلنے لگتا۔

بیگم علی احمد کے خلاف نفرت کا ایک دریا اس کے سینے میں موجزن تھا۔ وہ انجانے میں ان سے انتقام لینے کی شدید تمنا رکھتی تھی۔ لیکن وہ کمزور ناتواں سی لڑکی کس کس سے انتقام لیتی۔ دکھ تو اُسے قدرت نے عطا کئے تھے۔

اب اُسے محسوس ہونے لگا تھا۔ علی احمد کے گھر سے اس کا ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس کی غیرت اب اس دہلیز پر قدم رکھنے کی اُسے اجازت نہ دیتی تھی۔ ہاں اُسے زوجاجہ کی یاد ضرور آئی — وہ صحیح معنوں میں اس سے ایسا پیار کرنے لگی تھی۔ جیسے وہ اس کی اپنی ہو — لیکن اس نے یہ بھی تو سوچ لیا تھا۔ کہ گذرتے دنوں کی رفتار اُسے زوجاجہ کو بھلانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اس ملازمت کا تجربہ بھی اتنا تلخ تھا۔ کہ کسی اور جگہ ملازمت کرنے پر اس کا دل آمادہ نہ تھا۔ اس نے مایوسی سے یہ ہی سوچا تھا۔ وہ ماں کی طرح اب مشین کے سہارے ہی عمر بتا دے گی — اس کی سوچیں ان دنوں بے حد مایوسانہ سی تھیں۔

لیکن دوسرے تیسرے دن اچانک اس کے دروازے پر علی احمد کی کار کا مخصوص ہارن بج اٹھا۔ تو چاندنی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب اس کے دروازے پر دستک بھی ہو رہی تھی۔ چاندنی دل میں پختہ یقین سے یہ سوچتی ہوئی اٹھی — کہ آنے والے علی احمد ہی ہوں گے۔ جن کو آج وہ گھر کی دہلیز پر

قدم دھرنے تک نہ دے گی بلکہ ان کو باہر لوٹا دے گی — یہ احساس دلا کر کہ وہ اب اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ لیکن دروازے پر علی احمد کے بجائے خالہ زیب نے آگے بڑھ کر اُسے پیار سے گلے لگایا۔

"چلو بیٹی میں تم کو لینے آئی ہوں۔" ان کے لہجے میں اصرار تھا۔

"نہیں خالہ اب میرا وہاں جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔" چاندنی کی آواز بھرا گئی۔

"تم کو چلنا پڑے گا چاندنی زوجاجہ کی خاطر — اس کی طبیعت بے حد خراب ہے۔ پلنگ سے گرنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔ لیکن برابر تم کو یاد کرتی ہے۔" خالہ زیب نے جیسے اس کی منت کی۔

زوجاجہ کی حالت کا سن کر چاندنی کا دل ڈوب گیا۔ وہ سخت پریشان ہو گئی۔ لیکن پھر اس دن والی بے عزتی کا خیال سارے احساسات پر غالب آگیا۔ "لیکن خالہ اس گھر سے مجھے بے عزت کر کے نکالا گیا ہے۔ واپس کس طرح جا سکتی ہوں میں۔" اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"لیکن اس میں زوجاجہ کا کیا قصور — قصور جس کا تھا۔ وہ تو ہمیشہ کی طرح پھر اپنے باپ کے گھر جا بیٹھی ہیں — تمہارے جانے کے بعد بیٹی بہت کچھ ہوا — انہوں نے قیامت سی برپا کر دی۔ سچ پوچھو تو مجھے علی احمد پر ترس آتا ہے — بے حد دکھی ہیں وہ۔" خالہ زیب تو کھڑے کھڑے شروع ہو گئی تھیں۔ چاندنی کو صرف وہاں جاتے ہوئے بیگم علی احمد کا ہی خوف تھا۔

اب اُس کا دل زوجاجہ کی حالت سن کر وہاں جانے پر فوراً آمادہ ہو گیا

خالہ زیب کو اس نے دبے الفاظ میں تارا کو کچھ نہ بتانے کی ہدایت کی۔ اور خود تیار ہونے چل دی۔ خالہ زیب تارا سے محو گفتگو ہو گئی۔ مارے گھبراہٹ کے چاندنی سے ٹھیک سے تیار بھی نہ ہوا گیا۔

جب وہ خالہ زیب کے ہمراہ "علی ولا" پہنچی تو — کار سے اترتے ہی خوف سا لاحق ہو گیا۔ جیسے ابھی کسی کمرے سے نکل کر بیگم علی احمد اس پر برس پڑیں گی — انہوں نے چاندنی کو یہ دھمکی دی تھی۔ اگر اس نے پھر اس گھر میں قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ اور چاندنی کو ان کی ساری باتیں یاد تھیں۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ ٹانگیں کانپنے لگی۔ بمشکل وہ گیلری عبور کر کے زوجاجہ کے کمرے میں پہنچی۔ زوجاجہ ساکت سی بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر پلاسٹر بندھا تھا۔ چہرے سے وہ بے حد نحیف لگ رہی تھی — "آپ آگئیں باجی" — زوجاجہ کے زرد چہرے پر ایک لہر آگئی۔ معصوم سی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے تھے۔

"ہاں میں آگئی زوجاجہ" — چاندنی بے اختیار اس کے تکیئے پر سر رکھ کر اس کے الجھے الجھے بالوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

آنسوؤں کے ذریعے دل کی بھڑاس نکال کر اس نے سر اٹھایا۔ تو دیکھا علی احمد اس کی پشت پر کھڑے تھے۔ کچھ بدحال سے۔ اجڑے اجڑے — چاندنی بس آنکھوں میں آنسو بھر کے ان کو دیکھنے لگی۔

"تم آگئیں چاندنی — مجھے اپنے دل پر اعتماد تھا کہ تم ضرور آؤ گی" — انہوں نے پھر الٹی بات کہہ دی۔

"میں یہاں آنا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ لیکن زوجاجہ کی مجبوریاں مجھے کھینچ لائیں۔"

اس نے لہجے میں تلخی سموتے ہوئے کہا "اور میری - میری حالت پر تم کو ترس نہیں آیا۔" وہ بولے۔

"نہیں - نہیں - نہیں" چاندنی بے ساختہ چیخ پڑی - میں ان زخموں کو عمر بھر نہ بھولوں گی - جو اس دن کی بے عزتی نے میرے دل کو بخشے ہیں - میرا آپ سے کیا واسطہ۔ میں صرف زوجاجہ کے پاس آئی ہوں - صرف اس کے پاس!"

اُس کی اس بات پر علی احمد بنا کچھ بولے کمرے سے نکل گئے — اور چاندنی سنبھل کر زوجاجہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی اُس سے دل بہلاوے کی باتیں کرنے لگی۔ "زوجی شاید اب میں یہاں نہ آسکوں۔ تم مجھے بھول جانا - کوئی اور ہمدرد سی لڑکی تم کو مل ہی جائے گی۔" وہ اُسے اپنی جدائی پر آمادہ کرنے لگی۔

"نہیں - نہیں میں آپ سے جدا ہو کر مر جاؤں گی" - زوجاجہ بے حد ضدی تھی۔ اس کی یہ بات سن کر تکیے پر اپنا سر پٹخنے لگی - اور اس وقت چاندنی اسے پھر جھوٹا دلاسا دینے لگی — لیکن یہ کیسی انہونی سی بات تھی صرف زوجاجہ کی خاطر وہ یہاں کس طرح رہ سکتی تھی - کس طرح قربانی دے سکتی تھی۔

خالہ زیب بھی چاندنی کے آنے سے خوش تھیں — اس کو اتنے دنوں کی باتیں سنانے لگیں علی احمد ذہنی طور پر اتنے پریشان ہیں۔ کہ آج کل انہوں نے دفتر سے بھی چھٹی لی ہوئی ہے۔

وہ دن بھر گھر ہی رہیں گے - یہ خیال چاندنی کو ستانے لگا - وہ علی احمد کا سامنا کسی صورت میں بھی کرنا نہیں چاہتی تھی - شام تک اس کا ان سے سامنا بھی

نہ ہوا۔ اپنے کمرے میں لیٹے وہ مستقل ساحر کی اس غزل میں کھوئے تھے — جس کی بازگشت چاندنی کے کانوں سے بھی ٹکرا رہی تھی۔

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں
چار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لئے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے
پیار پر بس تو نہیں ہے میرا لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنہیں
ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں؟
کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے
قربتیں بڑھ کر پشیمان بھی ہو جاتی ہیں۔
دل کے دامن میں لپٹی ہوئی رنگین نظریں
دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں۔

صبح سے ان گنت بار وہ یہ غزل سن چکے تھے۔ جس کی سر کا ایک ایک تار الفاظ کا ایک ایک نشتر چاندنی کے دل میں چبھن سی پیدا کر رہا تھا۔ اُف خداوند مجھے حوصلہ دے۔ کس آزمائش کی گھڑی میں تو نے مجھے ڈال دیا — علی احمد کی ان کہی باتیں۔ وہ آپ ہی جیسے سن چکی تھی۔

اس کا دل اس وقت وہاں سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک ان دیکھی زنجیر آپ ہی اس کے قدموں سے آلپٹی تھی۔ دوپہر زدجاجر سو گئی۔ تو اس نے واپسی کا سوچا۔ لیکن وہ اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ علی احمد نے ملازم کے ذریعے اُسے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ وہ ان کے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔

لیکن کس طرح حکم ٹالتی - آخر کو وہ مالک تھے - اور وہ تنخواہ پانے والی ملازمہ - سر جھکا کر بھاری بھاری قدموں سے ان کے کمرے میں پہنچ گئی — لیکن اس کے خوبصورت چہرے پر ایک غبار سا چھایا ہوا تھا -

علی احمد نڈھال نڈھال سے اپنے پلنگ پر نیم دراز تھے - چلئے ہیں بھی وہ پریشان حال لگ رہے تھے - شاید صبح سے مستقل سگریٹ پھونک رہے تھے - جب ہی ان کے کمرے کی فضا سگریٹ کے دھویں اور بو سے گھٹن آمیز تھی - ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے پر تھا - چاندنی سر جھکائے اُن سے کافی فاصلے پر کھڑی ان کے حکم کی منتظر تھی - "بیٹھ جاؤ چاندنی" - انہوں نے آہستگی سے کہا - چاندنی نے حکم کی تعمیل کی - بہت دور ایک صوفے پر بیٹھ گئی -

"میرے قریب آکر بیٹھو چاندنی" - انہوں نے پھر تمنا ظاہر کی -

لیکن چاندنی نے ان کا یہ حکم نہ مانا "آپ جو کہنا چاہتے ہیں - میں یہاں سے بخوبی سن سکتی ہوں" -

"چاندنی" — وہ اُسے پکار کر رک گئے — لیکن پھر بولے — "آج میں تم پر ایک حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں - یہ حقیقت ہے تم - میرے دل کے بہت قریب آگئی ہو - کیوں - کس طرح — کیسے — مجھے نہیں معلوم - لیکن — یہ دل تمہاری ضرورت محسوس کرتا ہے - چاندنی - اس گھر کو تمہاری ضرورت ہے - زوجاجہ کو تمہاری ضرورت ہے" -

وہ چاندنی کو اس کی اہمیت بتا رہے تھے - اس کا بے ضرورت سا وجود کتنے دلوں کی ضرورت تھا - چاندنی سب کچھ سن رہی تھی - سمجھ رہی تھی - لیکن وہ

اس عالم میں تھی - کہ بول نہ سکتی تھی - اس کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی ۔

"آج کسی اس سے اظہار محبت کر دیا تھا - کوئی اُسے چاہنے لگا تھا. علی احمد کے اظہار کی اس کے دل کو تمنا تھی - وہ حیران نہ ہوئی — ہاں پریشان ضرور ہو گئی ۔

"مجھے سکون چاہیئے چاندنی - یہ زندگی بے بجلا — اب لے سکون ہے چاندنی اس نے صرف تم سے آس باندھی ہے حالانکہ ہم میں تم میں بہت فرق ہے - عمروں کا - رتبوں کا - لیکن میں ہر فرق کو مٹانا چاہتا ہوں ۔

جواب دو چاندنی — میرا ساتھ دو گی - زوجاجہ کا عمر بھر کا سہارا بنو گی"۔

وہ اتنے بڑے فیصلے کا اس سے فوراً جواب بھی چاہتے تھے — لیکن چاندنی اب بھی گم سم بیٹھی تھی ۔

چاندنی بھی تو محبت کی متلاشی تھی - وہ بے سہارا تھی - ماں کا سہارا بھی کبھی کبھی اُسے عارضی سا لگتا - اُسے دولت کی تمنا اور خواہش تھی - اور پھر علی احمد سے اس کے دل نے بھی تو زندگی میں پہلی بار محبت کی تھی - اگر پہل علی احمد نہ کرتے ۔ تو چاندنی اس محبت کا کبھی اظہار نہیں کرتی - لیکن دل کو دل سے آس ہوتی ہے نا علی احمد کے دل نے بھی اس سے آس باندھی ۔

ایک خوشی کی سی لہر چاندنی کے وجود میں پل بھر کو دوڑ گئی - لیکن پھر بیگم علی احمد کی صورت دو معصوم بچوں کی صورت اُس سے سب کچھ چھین کر لے گئی ۔

"نہیں میں کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتی - کسی کا گھر نہیں اجاڑ سکتی —" وہ نفی میں سر ہلانے لگی — "یہ گھر آباد کب تھا چاندنی —" ؟ — علی احمد نے اس سے سوال کیا

"یہ گھر بھی ویران ہے چاندنی — اور دل بھی — چاندنی میں تمہارے دکھوں کو بھی اپنے پر لینا چاہتا ہوں۔ تم دنیا کے حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکتی — میری پناہ میں آجاؤ چاندنی —" وہ التجائیں کر رہے تھے۔

ہم ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں گے — "میں تمہاری ماں کے دکھوں کا مداوا کر دوں گا۔ تمہارے بھائی کو آزاد کرا لوں گا۔" وہ اُس سے اتنے بڑے بڑے وعدے کرنے لگے تھے۔

چاندنی اچانک خوشیوں کی جھلک دیکھنے لگی۔ لیکن اُس کے خاموش لب نہ ہلے دل نے یہ سب قبول نہ کیا۔ علی احمد کی التجاؤں کو ٹھکرا کر وہ عزم سے کھڑی ہو گئی۔ "میں اس گھر سے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لئے۔" علی احمد کی التجاؤں اور وعدوں کا یہ جواب تھا اس کے پاس۔

"چاندنی تم دو زندگیوں سے کھیل رہی ہو — میں زوجاجہ کو بھی ختم کر دوں گا اور خود بھی مر جاؤں گا۔" جاتے جاتے علی احمد کے یہ الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے۔ لیکن باغی دل پھر بھی ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوا۔

وہ تیزی سے وہاں سے نکل گئی — گھر پہنچ کر بھی وہ علی احمد کی باتوں میں کھوئی رہی۔ وہ باتیں بھلائی جانے والی تو نہ تھیں اور وہ بھی اتنے جلد۔

کاش کاش۔ میں وہ سب مان جاتی۔ قبول کر لیتی ان کو — اب وہ کچھ پریشان تھی۔ خود مر جانے اور زوجاجہ کو ختم کر دینے کی دھمکی کا اس کے دل پر بے حد اثر تھا۔

اونہہ کون کسی کے لئے مرتا ہے — اس کو یہ دھمکی بے اثر سی لگی۔ لیکن وہ

دل کو سمجھانے پر بھی سکون نہ پا سکی۔

الجھی الجھی رہی۔ تارا نے اُس کی کیفیت کو سمجھ لیا۔ لاکھ پوچھنے پر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا۔ ویسے بھی ان دنوں موسم بے حد بوجھل بوجھل ہو رہا تھا — تارا اُسے ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہنے لگی۔

لیکن اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں بھی نہ تھی — اپنے بستر میں جا گھسی — اس کا دل بے حد ہلچل مچائے ہوئے تھا۔ اس سے یہ ہی کہہ رہا تھا۔ آج اس نے کتنی نادانی کی ہے — کیوں نا وہ انمول محبت قبول کر لی — جس کی اُس کی زندگی میں کمی تھی۔

اس کا دل بھی تو چور تھا۔ چپکے چپکے علی احمد کو چاہتا تھا۔ لیکن آج قسمت سنورنے کا وقت آیا۔ تو وہ اس کو ٹھکرا آئی تھی۔

اپنی جلدی بازی اور نادانی پر صرف آنسو ہی تھے اس کے پاس وہ ہی بہہ نکلے۔ رو رو کر اُس نے اپنا تکیہ بھگو ڈالا۔

اپنے حساب میں اس نے عمر بھر علی احمد کے گھر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن خالہ زیب شام اُسے پھر بلانے آگئیں۔ بے حد گھبرائی گھبرائی — پریشان حال سی۔ "چاندنی غضب ہوگیا — علی احمد کی کار کا صبح ایکسیڈنٹ ہوگیا — اور وہ اسپتال میں ہیں" اس خبر سے جیسے چاندنی کا ذہن گردش کھا گیا انہوں نے جو کہا تھا۔ سچ کر دکھایا۔ کیا یہ حادثہ اتفاقی تھا۔ نہیں نہیں — پل بھر میں اس کا دل اس سے یہ سب کچھ کہنے لگا۔ نہیں یہ سب میری وجہ سے ہوا — وہ پریشان حلیئے میں بکھرے بکھرے بال لئے اس ہی وقت خالہ زیب کے ساتھ جانے پہ آمادہ ہوگئی۔ "زوجاجہ نے تو اپنا حال برا کیا ہوا ہے۔ کل سے رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ تم اُسے بتائے بغیر ہی کیوں چلی آئی تھیں"۔ راستے بھر خالہ زیب چاندنی سے شکائتیں کرتی رہی۔ ان کو بھلا اُس بات کی کیا خبر تھی۔ کہ ان کا مالک اس کو مالکن بنانا چاہتا تھا۔ وہ ملازمہ کی حیثیت سے آئی تھی مالکہ بننا نہ چاہتی تھی — لیکن اب علی احمد کے اس اقدام پر اس کا دل ڈول گیا تھا۔ وہ سارے حوصلے ہار گئی تھی۔

دل وجان سے وہ صرف علی احمد کی فکر میں مبتلا تھی۔

زوجاجہ چاندنی سے سخت روٹھی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے چاندنی نے اپنی خطائیں اس سے بخشوائیں — علی احمد کو زیادہ شدید چوٹیں نہ آئی تھیں۔ ان کی

کار ایک بڑے درخت سے ٹکرا گئی تھی ۔ اس دھچکے سے ان کے سر پر چوٹ آئی تھی ۔ ایک پاؤں بھی ونڈ اسکرین کا شیشہ لگ جانے سے بری طرح زخمی ہوا تھا ۔ شام تک وہ گھر آ گئے ۔ ان کے سر پر بنڈیج تھا ۔ ایک ہاتھ بھی پٹیوں میں جکڑا تھا وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہے تھے ۔ کتنے ہاتھوں کے سہارے اپنے پلنگ پر آکر لیٹے تھے ۔ نقاہت ان کے چہرے پر بے حد تھی ۔ چاندنی بال بکھرائے میلے میلے لباس میں ان کے کمرے میں موجود تھی ۔

لیکن وہ اُسے دیکھ نہیں رہے تھے ۔ اس سے ناراض تھے ۔ اور چاندنی ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی ۔ پھر سب کمرے سے چلے گئے لیکن چاندنی نہ گئی ۔

"سب کے جانے کے بعد وہ ان کے قریب آ گئی ۔" آپ نے اپنے پر یہ ظلم کیوں کیا ۔ اتنی تکلیف کیوں دی اپنے کو ۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے ان سے پوچھ رہی تھی ۔

"سب جان کر بھی کیوں پوچھتی ہو چاندنی ۔ میں نے آپ جان کر اس کار کو استعمال کیا ۔ جس کے بریک مدت کے خراب تھے وہ بند پڑی تھی ۔ لیکن میں جو چاہتا تھا وہ نہ ہو سکا ۔ موت نے بھی ٹھکرا دیا ۔

نہیں نہیں ۔ آپ مر نہیں سکتے ۔ صرف مجھ بے حیثیت لڑکی کی وجہ سے آپ اپنی قیمتی زندگی ضائع نہیں کر سکتے ۔" وہ بے اختیار ان کے پیروں کو اپنے کانپتے ہاتھوں سے چھونے لگی ۔ علی احمد اس کی اس حرکت پر تڑپ گئے ۔ بے اختیار اٹھ کر اپنے ایک ہاتھ سے اس کو اپنی طرف کھینچا ۔ وہ تو حد درجے جذباتی ہو رہی تھی کانپ رہی تھی آسانی سے اس ہاتھ کے سہارے ان کے سینے سے جا ٹکرائی ۔

سب کچھ فراموش کر کے وہ ان کی پناہ گاہ میں آ گئی ۔ بڑی طرح سسک کر رونے لگی۔

" اور علی احمد اس کو دلاسہ دے رہے تھے ۔ چاندنی ان کی بن گئی تھی ۔ وہ ہار گئی تھی ۔ وہ جیت گئے ۔ جب ہی تو ان کے کتنے قریب ان کے سینے پر سر رکھے بچوں کی طرح روئے جا رہی تھی ۔ اس کے گھنے گھنے بال علی احمد کے چہرے کو چھو رہے تھے ۔ چاندنی ہوش میں آ کر جس جلد بازی سے ان کے قریب ہوئی تھی ۔ اس ہی تڑپ سے ان سے دور بھی ہو گئی ۔

" میں زندہ نہیں رہوں گی ۔ میں خود مر جاؤں گی " وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی ۔ " نہیں چاندنی ہم ایک دوسرے کے لئے جئیں گے ۔ زندگی اللہ میاں کی ایک حسین امانت ہے ۔ ہم کیوں اُسے وقت سے پہلے ختم کریں " اچانک ان کے دل میں جینے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ۔

لیکن چاندنی ڈر رہی تھی ۔ اُسے علی احمد کی بیوی کا خیال آ رہا تھا بچوں کا آ رہا تھا ۔ دنیا والوں کا آ رہا تھا ۔ پھر اپنی ماں کا آ رہا تھا ۔ اس کی راہ میں بہت مشکلات تھیں وہ آسانی سے علی احمد کی نہیں بن سکتی تھی ۔ بمشکل علی احمد کو پھر ان کے بچوں اور بیوی کا احساس دلایا ۔

" ہاں چاندنی میں دو بچوں کے حصار میں بندھا ہوں ۔ لیکن وہ ایک دولتمند ماں کے بچے ہیں ۔ ان کا مستقبل محفوظ ہے ۔ اُن کو شاید میری ضرورت کبھی محسوس نہ ہو ۔ میں تمہاری خاطر ہر زنجیر کاٹ ڈالوں گا ۔ صرف تمہاری خاطر ۔ تم ہمیشہ میرے دل کی رانی بن کر میرے قریب رہو گی " وہ اُسے آنے والے خوشیوں کے دن کی جھلک دکھانے لگے ۔ چاندنی پھر بھلا کیوں نہ راضی ہوتی ۔ کیوں ملتی خوشیوں کو

اجاڑتی۔ کس طرح جذبات کی قربانی دیتی۔ اس جنت کو دل کس طرح ٹھکراتا۔ دل من گیا تو ۔

وہ خود کو اچانک ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ وہ تو ایک محروم لڑکی تھی۔ ہر چیز کو ترسی ہوئی۔ اب محبت دولت۔ خوشی سب کچھ اچانک اس کو مل رہا تھا۔ پھر بھی اس کو طرح طرح کے خوف اور وسوسے ستا رہے تھے ۔۔ اپنی ماں کا خیال بھی آگیا ۔۔ اس کا اظہار بھی اس نے علی احمد پر کر ڈالا ۔

"میں خود ان سے بات کروں گا چاندنی ان کو منا لوں گا۔" علی احمد نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی ۔

اور چاندنی پرسکون ہوگئی۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھیں آپ خشک ہوگئیں۔ معصوم سے چہرے پر شرمیلے سائے لہرانے لگے۔ لیکن اب اُسے گھر جانے کی بھی فکر تھی ۔ کیونکہ رات کے نو بج رہے تھے ۔ وقت کا اندازہ کر کے علی احمد نے اُسے رخصت دے دی۔ کل آنے کے وعدے پر آج دل میں نئے احساسات لئے وہ ان سے رخصت ہوگئی ۔

رات کتنے سہانے سپنے دیکھنے میں گذری تھی - جن کا خمار چاندنی کی آنکھوں میں اب بھی باقی تھا - وہ ناشتے کے بعد جلدی جلدی بڑی لگن سے تیار ہونے لگی۔ تارا کو بھی آج بیگم ریاض نے بلوایا تھا - تارا اب کافی بہتر تھی — اس وجہ سے اب وہ باہر بھی آنے جانے لگی تھی - چاندنی سے اُس نے بیگم ریاض کے پاس جانے کا ذکر کیا - "اچھا امی - لیکن آپ اُن سے اب سلائی کا کام نہ لیجئے گا"۔ چاندنی تو آنے والے حسین دنوں کے تصور میں ڈوبی ہوئی تھی - جہاں دولت ہی دولت تھی پھر بھلا اس کو اور اُس کی ماں کو اجرت پر دوسرے کا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی -

"لیکن چاندنی آج انہوں نے مجھے کسی اہم کام کے لئے بلوایا ہے"۔ تارا کے لب دھیرے سے مسکرائے - وہ اہم کام کیا تھا - جانے کی جلدی میں چاندنی نے تارا سے یہ بھی نہ پوچھا - کیونکہ علی احمد کی کار اُسے لینے آچکی تھی - چاندنی چلی گئی تو تارا بھی لباس تبدیل کر کے - گھر میں تالا ڈال کر بیگم ریاض کے یہاں چلی دی - پچھلی دفعہ بیگم ریاض نے چاندنی کے لئے ایک رشتہ بتایا تھا - آج بھی شاید اس سلسلے میں انہوں نے اس کو بلایا تھا -

تارا تو اب ہر حال میں چاندنی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی — اُسے چاندنی کا دوسرے گھر میں ملازمت کرنا بالکل پسند نہ تھا - ہمیشہ اُس کا دل ڈرتا

رہتا تھا۔ ان دنوں وہ اسی کوشش میں لگی تھیں کہ کسی طرح چاندنی پرائی ہو جائے۔ غریب گھر کی لڑکیوں کے رشتے آسانی سے نہیں مل جاتے۔ تارا بھی بے حد غریب تھی۔ کچھ محلے کی عورتوں نے اس سے بیر باندھ کر اُسے بے بات بدنام کر رکھا تھا۔ ساجد کے بعد کسی امیدوار نے ان کے دروازے پر دستک نہ دی تھی۔ حالانکہ اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی۔ پڑھی لکھی چاند سی صورت والی — ایک شگفتہ گلاب کی مانند — لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ پھول بھی مرجھا جاتے ہیں۔ بس تارا اب جلد از جلد چاندنی کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ اس ہی سوچ میں وہ بیگم ریاض کے گھر پہنچ گئی۔ اس کا اندیشہ درست تھا۔ بیگم ریاض نے اُسے خوشی بخشنے کے لئے بلایا تھا۔ چاندنی کے لئے انہوں نے اپنے جاننے والوں کا رشتہ دیا تھا۔ لڑکا بی اے پاس تھا اور ایک پرائمری اسکول میں ماسٹر تھا۔ تارا کو وہ ہی مناسب لگا۔

"پھر بیگم ریاض لڑکے کی صورت سیرت سب کے گن گا رہی تھیں۔

تارا پر سکون ہو کر وہاں سے لوٹ آئی۔ بات آگے بڑھانے سے قبل وہ چاندنی سے بھی ذکر کرنا چاہتی تھی۔ اُسے امید تھی اس کی فرمابردار بیٹی کبھی انکار نہ کرے گی۔ اُسے اسکول ماسٹر سے بہتر رشتے کی اُمید بھی نہ تھی۔ یہ رشتہ بھی کتنی مشکلوں اور شب و روز کی دعاؤں کے بعد اس کے ہاتھ آیا تھا۔

"ادھر تارا خوش تھی۔ اور اُدھر چاندنی کا دن بھی علی احمد کی تیمار داری کرتے ان کی پیار بھری باتیں سنتے۔ ہنستے مسکراتے اور شرماتے گذرا۔

شام واپس جانے لگی۔ تو علی احمد نے یہ کہہ کر اُسے کچھ اور شرمانے پر مجبور کر دیا۔ چاندنی کل صبح میں تمہاری امی کے پاس آ رہا ہوں۔ اب دل کڑا کر صبر

کرنے کی طاقت نہیں - وہ اُن سے چہرہ چھپاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ کل آنے والی صبح کا تصور بے پناہ حسین تھا۔ لیکن اُسے ماں کے دل کا پتہ تھوڑی تھا۔ گھر پہنچی تو تارا اس کی منتظر تھی۔ وہ بیٹی سے آج ہی اس کے مستقبل پر بات کرنا چاہتی تھی —

کھانے کے وقت دونوں آمنے سامنے بیٹھیں تو تارا نے مناسب لفظوں میں چاندنی کو سب بتا ڈالا — جس کو سن کر چاندنی فق ہو گئی — نوالہ حلق میں پھنس گیا۔ وہ جبکہ دولت کی چمک دمک بری طرح آنکھوں میں بسا چکی تھی۔ سچ مچ کسی کے دل کی ملکہ اور محل میں جانے کی سوچ رہی تھی۔ تو اس کی ماں اس کا مستقبل ایک اسکول ماسٹر سے جوڑنا چاہتی تھی — چاندنی سے صبر نہ ہو سکا۔ ہونٹوں پر دل کی بات آ ہی گئی "نہیں امی — میں ایسے آدمی سے شادی نہیں کروں گی" - اس نے انکار کر کے تارا کا دل توڑ دیا "لیکن چاندنی - اپنی حالت پر بھی تو نظر ڈالو - ہمارے پاس کیا ہے۔ تم بھی دوسرے گھر کی ملازمت کرتی ہو — اس سے بہتر رشتے کی امید کی نہیں جا سکتی۔ کوئی محلوں کا راجہ نہیں آئے گا تم کو بیاہنے" - تارا کا لہجہ ترش تھا۔

اور چاندنی کا دل چاہا - وہ ماں کو بتا دے - سچ مچ اُسے محلوں کا راجہ ہی اپنانے آ رہا ہے۔ لیکن وہ بات آگے بڑھانا نہ چاہتی تھی - ہاں ماں کی اس بات پر اس کا منہ ضرور پھول گیا۔ کھانا بھی نہ کھایا گیا - کل صبح علی احمد آ ہی رہے تھے۔ پھر امی کو آپ ہی سب معلوم ہو جائے گا۔ وہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں چلی گئی — دوسری صبح علی احمد آ گئے — ان کی آمد کو محسوس کر کے - چاندنی اندر کمرے میں جا چھپی - اور تارا نے حیران نظروں سے اُن کا استقبال کیا -

ان کی چوٹیں اب بھی نہ بھری تھیں۔ سر پر اب بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور وہ چلتے ہوئے لنگڑا بھی رہے تھے۔ اور ایسی حالت میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ تارا کے پاس آ گئے تھے۔ تارا نے ان کو کمرے میں لا بٹھایا۔ وہ اس سے ان کی خیریت دریافت کرنے لگی۔ علی احمد بھی ان کی باتوں کے جواب دینے لگے۔ چاندنی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

تارا کے پکارنے پر بھی وہ کمرے میں نہ گئی۔ تو تارا نے وہیں سے اُسے علی احمد کے لئے چائے تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ بے دلی سے کمرے سے نکل کر چائے بنانے لگی۔ اتنے وقفے میں کیا ہوا اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ جب وہ چائے لے کر کمرے کی دہلیز پر پہنچی تو۔ تارا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"غریب کی بیٹی کو آپ اپنی دولت سے نہیں خرید سکتے۔ میں چاندنی کا رشتہ کسی اور جگہ پکا کر چکی ہوں"۔ تارا کا لہجہ کتنا سخت تھا۔

چاندنی کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ پیالی اُس کے دل کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئی۔ ایک چائے کی پیالی تک تھامنے کی اس میں سکت نہ تھی۔

پھر اُس نے دیکھا علی احمد کمرے سے باہر آ رہے تھے۔ وہ گھبرا کر ان کے سامنے آ گئی۔

"چاندنی میں اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ اگر تم نہ ملیں تو موت کو گلے لگا لوں گا۔ اور پھر موت بار بار تو دھوکہ نہیں دیتی نا"۔ وہ جاتے جاتے اُسے اور لرزا گئے۔ تارا نے اُن کو مایوس لوٹا دیا۔

چاندنی کو اپنی اس حق تلفی پر پہلی بار ماں پر شدید غصہ آ گیا۔ وہ بلک کر

رونے لگی۔ تارا الگ بھری ہوئی تھی — چاندنی کے ان آنسوؤں نے اس کا غصہ اور بھڑکا دیا۔

"چاندنی تو نے بھی میرے اعتماد کو توڑ دیا۔ تو بھی دولت کی چمک دیکھ کر بہک گئی۔ کم از کم تیرے لئے تو میں ایسی سوچ نہ رکھتی تھی تجھ پر تو مجھے بے حد مان تھا۔ لیکن تو نے اُسے توڑ کر مجھے آخری صدمہ پہنچایا ہے۔ تو میری موت کی ذمہ دار ہو گی چاندنی۔" تارا مسلسل بول رہی تھی۔

"چاندنی — وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے — چاندنی تو ایک بیوی سے اس کا سہاگ چھین لے گی۔ بچوں سے باپ کا پیار چھین لے گی — ایک گھر اجاڑے گی۔ عورت ہو کر عورت کی حق تلفی کرے گی لیکن میں یہ سب کچھ نہ ہونے دونگی۔

شادی کے بعد عورت کا سب کچھ اس کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ شوہر سے بچھڑ کر وہ ادھوری رہ جاتی ہے۔ تیری ماں نے تو سہاگ موت کے حوالے کیا تھا آج میری بیٹی اپنے ہاتھوں سے کسی کا سہاگ چھیننا چاہتی ہے۔ میں یہ کبھی نہ ہونے دونگی چاندنی۔ کبھی نہیں۔

تارا بول کر تھک گئی۔

لیکن ماں کے ان جملوں کا چاندنی پر کچھ اثر نہ ہوا ——— اس پر تو مکمل علی احمد کی شخصیت نے اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ وہ صرف روتی رہی۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔

چاندنی آج کے بعد میں تجھے دہلیز کے باہر قدم بھی نہ رکھنے دوں گی۔ یہ ہے تیرے بہکنے کی سزا — اور کل ہی جا کر تیرا رشتہ پکا کر آؤں گی — تارا اُسے سزا

دینے کے موڈ میں تھی۔

لیکن چاندنی اپنی زندگی داؤ پر لگانا نہیں چاہتی تھی۔ آج ماں سے بدزبانی پر آمادہ ہو گئی۔ "نہیں۔ نہیں۔ میں اُس اسکول ماسٹر سے شادی ہرگز نہیں کروں گی میں مر جاؤنگی — پر یہ نہ ہونے دوں گی"۔ اس نے ماں کی بات بری طرح ٹھکرا دی۔

لیکن تارا پر اس کے رونے دھونے کا بالکل اثر نہ ہوا — وہ اُسے روتا چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔ چاندنی نے تو ماں کے انکار پر رو رو کر حال برا کر لیا۔ اُس کا دل اس وقت اپنی ماں سے بھی باغی ہو رہا تھا۔ تارا نے آج اس پر ظلم کیا تھا۔ دل میں ابھری خوشیوں کو آگ سی لگا دی تھی — وہ اُسے ایک غریب سے اسکول ماسٹر سے بیاہنا چاہتی تھی۔ جس پر چاندنی کا دل ہرگز آمادہ نہ تھا۔

چاندنی کو غربت سے نفرت تھی۔ غربت کے اندھیرے سے نکل کر پھر وہ ایسے ہی تاریک گھر میں زندگی بھر نہ جانا چاہتی تھی۔ اس وقت اس کے بھڑکتے جذبات اُسے اور باغی کر رہے تھے۔ تیری ماں تجھے پھر مفلسی میں ڈبونا چاہتی ہے۔ ایک اندھیری کوٹھری کا چراغ بنانا چاہتی ہے۔ نہیں میں کبھی ایسا نہ ہونے دوں گی — وہ ماں سے بغاوت پر آمادہ تھی۔ جاتے جاتے علی احمد یہ بھی تو کہہ گئے تھے۔ موت بار بار دھوکہ نہیں دیتی ایک بار صرف اس کی وجہ سے وہ موت کو گلے لگانا چاہتے تھے — اگر ابھی میری وجہ سے کچھ ہو گیا۔ تو — پھر میں بھی مر جاؤں گی — وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔ دل میں بہت سے منصوبے بنانے لگی۔ اُسے اتنی چاہت، محبت اور کہاں مل سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا۔ وہ صبح علی احمد کے پاس ضرور جائے گی — ان کو یہ بتانے — کہ ان کی خاطر وہ دنیا سے ٹکرانے

کو تیار ہے ۔ وہ ماں کو منا لے گی - اُس کی خوشی کی خاطر اُس کو راضی ہونا ہی پڑے گا ۔

پھر اُسے یقین تھا - کہ بعد میں تو اُس کی زندگی میں صرف خوشیاں ہی ہیں۔ اور مائیں بیٹیوں کی خوشیوں سے خوش ہوتی ہیں۔ تارا بھی خوش ہو جائے گی لیکن یہ سب اُس کے ناسمجھ دل کی باتیں تھیں — دن بھر گھر پر ایک خاموشی طاری رہی۔ نہ تارا چاندنی سے مخاطب ہوئی - اور نہ چاندنی نے بولنے میں پہل کی ۔ دن گذر گیا - رات بھی گذر گئی - دوسری صبح ہو گئی ۔

رات چاندنی کے دل نے جو منصوبہ بنایا تھا - وہ اس پر عمل کرنا چاہتی تھی۔ ایک بار پھر علی احمد کو ماں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی تھی - اس کو معلوم تھا اس کی ماں جو اسے بے حد چاہتی ہے - اس کی خواہش کا خون نہ کرے گی - وہ علی احمد کے یہاں جاتے کے لئے لباس تبدیل کرنے لگی - اس کی باہر جانے کی تیاری کو دیکھ کر تارا اس کی راہ میں حائل ہو گئی "تم گھر سے باہر نہیں جا سکتیں چاندنی"

"امی" چاندنی کی آنکھوں میں بیچارگی اتر آئی - کسی کی زندگی کا سوال ہے - آپ صرف ایک بار مجھے جانے دیں "

" پاگل مت بنو چاندنی — کوئی کسی کے لئے نہیں مرتا" - تارا نے برہمی سے کہا - امی ایک بار صرف میری خاطر وہ مرنا چاہتے تھے - دوسری بار بھی ایسا کر سکتے ہیں ۔"

بہت بڑے راز کا پردہ جیسے چاندنی نے ماں کے سامنے سے ہٹا دیا - تارا گنگ ہو گئی ۔

"آج صرف آخری بار آپ مجھے وہاں جانے دیں۔ تارا کا دل توڑ کر اس کی نافرمانی کر کے۔ وہ علی احمد سے ملنے کی خاطر گھر سے نکل گئی۔ آج ان کی گاڑی بھی اُسے لینے نہ آئی تھی۔

چاندنی نے کبھی اس طرح تارا کی نافرمانی نہ کی تھی۔ اس کا دل نہ توڑا تھا۔ چاندنی کی ذات نے تارا کو کبھی کوئی دکھ نہ دیا تھا۔ وہ تو ماں کے دکھوں میں شریک تھی۔ لیکن آج وہ اس کی بات ٹھکرا کر چلی گئی تھی۔ صبح کی گئی اب تک واپس نہ آئی تھی۔ اب تو رات ہونے لگی تھی۔ طرح طرح کے خدشات نے چاروں طرف سے تارا کو گھیر لیا تھا وہ خود کو بھی قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ کیوں آٹھ سو روپے کی خاطر میں نے چاندنی کو ایک غیر کے گھر چھوڑا۔

وہ ناسمجھ لڑکی تھی۔ بہکانے میں آگئی۔ قصوروار اُسے علی احمد لگ رہے تھے۔ جو شادی شدہ تھے بال بچوں والے تھے۔ اور اُس طرح چاندنی کو اپنا کر وہ کسی اور طرف بھی مائل ہو سکتے تھے بہر صورت میں تارا چاندنی کو اس گرداب سے نکالنا چاہتی تھی۔ اس کا حل اس نے چاندنی کی اپنی من پسند جگہ شادی کا سوچا تھا لیکن اب بڑھتی ہوئی تاریکی کے ساتھ تارا کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اُسے علی احمد کا گھر بھی نہ معلوم تھا۔ ورنہ وہاں جا کر چاندنی کو کھینچ لاتی۔ پریشانی کے عالم میں آنگن میں ٹہل ٹہل کر اس نے نہ جانے کتنے میلوں کا سفر طے کر لیا تھا۔ الٹی پلٹی سوچوں کی یلغار نے ذہن پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ لڑکی کی آب تو موتی کے مانند ہوتی ہے۔ اگر چاندنی علی احمد کے دام میں الجھ گئی۔ ان کے فریب میں آ کر نہ آب

لٹا بیٹھی تو — تو — اس کا کمزور دل بند ہونے لگا - ہاتھ پیر سنسانے لگے۔ اس نے اولاد کی خاطر کتنی قربانیاں دی تھیں۔ زلیست کا سفر انگاروں پر چلتے گذارا تھا۔ کسی کا سہارا قبول نہ کیا تھا۔ اگر چاہتی تو اپنی زندگی میں دوبارہ رنگ بھر سکتی تھی۔ دوبارہ سہاگن بن سکتی تھی۔ پہلے سے زیادہ شان سے رہ سکتی تھی۔ لیکن دل نے فرید سے بے وفائی گوارہ نہ کی۔ ہر دکھ جھیل گئی - کہ فرید کی دو نشانیاں یہ دکھ راحت میں تبدیل کر دیں گی۔ لیکن قسمت نے وہ سکھ بھی توڑ دیا۔ کاش کاش میں شہید کی بات مان جاتی۔ پھر شاید نہ نوید جیل جاتا اور نہ ہی چاندنی ملازمت کے لئے گھر سے نکلتی — اب اُسے گذرنے وقت پر افسوس آ رہا تھا۔ نہ جانے ان دنوں بات بات پر اُسے شہید کی یاد کیوں آنے لگی تھی۔ حالانکہ اس کی صورت دیکھے ہوئے اُسے زمانہ ہو گیا تھا۔

ہو سکتا ہے اس نے شادی کر لی ہو — یہ احساس نہ جانے اس کے دل کو کیوں اذیت بخش گیا — وہ ایسی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی — کہ گھر کے دروازے پر علی احمد کی کار رکنے کی آواز آئی — چاندنی آ چکی تھی۔ تارا کے دل کو قرار آ گیا۔ لیکن وہ چاندنی سے سخت ناراض تھی۔ اُس کی آمد کو محسوس کر کے منہ پھیر کے اندر چلی آئی — باہر کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ اس نے قدموں کی آہٹ محسوس کی۔ لیکن رخ نہ پھیرا۔

"امی" چاندنی نے اس کی پشت کی طرف سے پکارا — لیکن تارا نے رُخ نہ موڑا — "امی جی آپ مجھ سے ناراض ہیں نا" چاندنی نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

تارا کب تک صبر کرتی۔ آخر رُخ موڑ کر چاندنی کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن اس کی آنکھیں خطرناک حد تک پھٹ گئیں — وہ ایک ٹک م   نظروں سے

چاندنی کو تکنے لگی ۔ چاندنی صبح گھر کا معمولی لباس پہن کر گئی تھی ۔ لیکن اب اس کے جسم پر زرتار سنہری جوڑا تھا — مدھم سی روشنی میں بھی یہ خوبصورت کپڑے چمک رہے تھے ۔ یہ سرخ جوڑا ۔ تارا سے کیا کہہ رہا تھا ۔ وہ سب کچھ جو وہ چاندنی سے پوچھنے کی تاب نہ رکھتی تھی لیکن چاندنی کے چہرے پر دلہن کا کوئی روپ نہ تھا ۔ اُس کا چہرا اجھکا تھا ۔ وہ ماں کے سامنے مجرم بنی کھڑی تھی ۔" امی " ۔ چاندنی اچانک تارا کے قدموں سے لپٹ گئی ۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی ۔ اس کے کانپتے وجود کو اٹھا کر سینے سے لگانے کے بجائے ۔ تارا خواب کی سی کیفیت میں اُس سے مخاطب تھی

" چاندنی ۔ یہ تو ہے — میری بیٹی — لیکن نہیں چاندنی اتنا بڑا دکھ اپنی ماں کو نہیں دے سکتی "!

امی امی کی رٹ لگاتے ہوئے چاندنی مستقل رونے لگی ۔ پھر تارا کی نظریں دروازے پر جم گئیں ۔ جہاں علی احمد کھڑے تھے ۔ ان کے سر پر اب بھی پٹی بندھی ہوئی ۔ وہ لنگڑا کر چلتے ہوئے ۔ تارا کے قریب آ گئے ۔

ندامت کا رنگ ان کی صورت سے بھی ہویدا تھا ۔ تارا سمجھ کر بھی انجان بن کر کبھی چاندنی کو تک رہی تھی ۔ جو فرش پر بیٹھی اس کے گھٹنوں پر سر رکھے رو رہی تھی ۔ کبھی وہ علی احمد کو دیکھ رہی تھی ۔ جو مجرم سے بنے کھڑے تھے ۔

بولنے میں علی احمد نے پہل کی ۔ " ہم اپنی خطائیں بخشوانے آئے ہیں ۔ ہم نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں " ۔ لیکن وہ آگے کچھ اور کہنے کی ہمت نہ کر سکے ۔

" کیسی خطائیں ۔ کیسے دکھ ۔ یہ سب کچھ کیا ہے " ۔ تارا پاگلوں کے انداز میں پوچھنے لگی ۔

"میں نے آپ کی مرضی کے خلاف آج چاندنی سے نکاح کر لیا —" یہ خبر تھی کہ دھماکہ تھا کہ زمین ہل گئی۔ آسمان چکرا گیا۔ جیسے قیامت آگئی — صرف تارا کے وجود پر یہ سب بیتا۔ دوسرے لمحے وہ بے ہوش ہو کر — علی احمد کے قدموں میں جا گری۔

"امی — امی" چاندنی رونے کے علاوہ اور کیا کر سکتی پہلے ہی رو رہی تھی۔ ہچکیاں اور سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔ اُسے اب اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی خوشیوں کی خاطر ماں کے وجود کو مٹا کر رکھ دیا تھا — وہ کیوں بہکاوے میں آگئی اب پچھتا کر وہ اپنا سر ماں کے پلنگ کی پٹی پہ پٹخنے لگی۔ علی احمد سخت بدحواس تھے۔ چاندنی کو سمجھانے لگے "تم خود کو سنبھالو چاندنی — میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں"۔

لیکن ڈاکٹر کو بلانے کی نوبت نہ آئی — ذرا سی دیر کی غفلت کے بعد تارا کو ہوش آگیا۔ "امی مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو بہت بڑا دکھ دیا ہے"۔ چاندنی تارا کے لٹے وجود سے لپٹ گئی۔ لیکن ممتا کا احساس اس وقت تارا کے دل سے نکل چکا تھا۔ اپنی بیٹی اُس کو آج پرائی لگی۔ پھر یہ حقیقت ہی تھی۔ وہ پرائی بن کر ہی آئی تھی۔

تارا نے ذرا سی بھی جنبش نہ کی — چاندنی کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

علی احمد بھی معافیاں مانگنے لگے۔ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا — آپ کے انکار کے بعد صرف یہ ہی راستہ مجھے نظر آیا۔ چاندنی کو میں نے ہی اس بات پر راضی کیا۔ میں آپ کا گناہ گار ہوں۔ اگر ایسا نہ کرتا تو نہ زوجاجہ زندہ رہتی اور نہ میں جینے کی خواہش کرتا۔ وہ اپنے دل کی کیفیت بتانے لگے۔ چاندنی

نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

اور تارا زبان کے بجائے پھر دل سے باتیں کرنے لگی۔ چاندنی تجھے ایک پرائی بچی کا خیال کا تو رہا — ایک اجنبی مرد کی خواہش کا تو نے احترام کیا۔ لیکن اپنی ماں کا تجھے خیال نہ آیا — اس پر تجھے رحم نہ آیا — جس نے تیری خاطر اپنی زندگی ختم کر ڈالی دن رات محنت کی چکی میں پس کر تجھے جوان کیا۔ لکھایا پڑھایا۔ تو نے ماں کے احسانوں کا یہ صلہ دیا۔ کہ اس سے یہ حق بھی چھین لیا۔ کہ وہ اپنے ہاتھوں سے تیرا گھر آباد کر سکے۔ وہ بس مسلسل چاندنی کو گھورنے لگی۔ ماں کے اس انداز پر چاندنی کو خوف آنے لگا۔ سرخ جوڑے میں چاندنی بلاشبہ حسین لگ رہی تھی۔ لیکن تارا نے اس کو دلہن بنے اس روپ میں نہ دیکھا تھا۔

چاندنی تو انجانے میں یہ روپ دھار گئی تھی۔ چاندنی کو دلہن بنانے کی تمنا اس کے دل کی آخری تمنا تھی۔ وہ یہ آس لگائے بیٹھی تھی۔

اس کی بیٹی دلہن بنے گی۔ پھر بارات آئے گی۔ دولہا آئے گا۔ نکاح ہوگا ایک ہنگامے کے بعد وہ رخصت ہو جائے گی۔ گھر کا آنگن اور من کا آنگن دونوں کو سونا کر کے۔ وہ ماں سے معافی مانگ رہی تھی۔ لیکن چاندنی کا یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔ تارا کس طرح اُسے معاف کرتی۔ اچانک اُس کا جمع شدہ غصہ ابل پڑا۔

"چاندنی تو یہ گناہ کر کے میرے سامنے کیوں آئی۔ کہیں منہ چھپا لیتی۔ میں سب کی طرح تیرا غم جھیل جاتی۔

لیکن تو مجھے نئے زخم دے کر ان پر نمک پاشی کرنے آئی ہے۔ بتا ایسا کیوں کیا تو نے — کیوں کیا۔ تارا نے عمر بھر چاندنی کو ایک تھپڑ بھی نہ مارا تھا۔ لیکن

آج اس کے کمزور ہاتھوں میں بلا کی طاقت آ گئی تھی۔ اس نے چاندنی کو دونوں ہاتھوں سے دھن کر رکھ دیا۔ اُس کے بال نوچ ڈالے۔ سہاگ کا سرخ دوپٹہ پھاڑ ڈالا۔ "چاندنی جا چلی جا اس گھر سے — میری چاندنی مرگئی — اور تیری ماں بھی تیرے لئے مرگئی — تو نے اُسے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا —" چاندنی چپ چاپ مار بھی سہتی رہی — اور ماں کی باتیں بھی سنتی رہی۔ لیکن پھر ماں سے جا لپٹی۔ اس کا دل اپنے کئے پر بری طرح پچھتا رہا تھا۔ تارا نے چاندنی کو اپنے قریب سے پرے دھکیل دیا۔ میرے قریب مت آ چاندنی — مجھے تجھ سے نفرت محسوس ہو رہی ہے — چاندنی بے لبسی سے زمین پر بیٹھ کر رونے لگی — علی احمد کا دل خود تارا کی حالت پر الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ چاندنی کو وہاں سے اٹھانے کے لئے جھکے تو چاندنی نے ان کے ہاتھوں کو جھٹک دیا "یہ راہ آپ نے مجھے دکھائی۔ یہ بہکاوا آپ کا تھا۔ ظالم تو آپ ہیں۔ جس کی خاطر چاندنی ہر مرحلہ طے کر گئی — ماں جو دنیا والوں کو فراموش کر کے صرف اس کی بن گئی — اتنے جلد اُس سے بددل ہو رہی تھی۔

میں نے اپنی ماں کو مار ڈالا — میں قاتل ہوں۔" حالانکہ تارا ابھی زندہ تھی۔ مری نہیں تھی۔ پھر بھی چاندنی خود کو قاتل تصور کر رہی تھی — وہ تو علی احمد کے قابو میں بھی نہیں آ رہی تھی۔

علی احمد اُسے سمجھانے لگے: "چاندنی تمہاری امی کے لئے یقیناً یہ صدمہ بہت بڑا ہے۔ یہ صدمہ بہت بڑا ہے۔ یہ سب ان کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ ان کو ایسی جذباتی حرکت کرنی ہی تھی۔ لیکن جلد ان کا غصہ بھی اتر جائے گا — میں اپنے سارے وعدے پورے کر دوں گا — نوید کو رہا کرا دونگا۔ چاہے اس کے لئے مجھے لاکھوں

پیسہ کیوں نہ خرچ کرنا پڑے۔ وہ اُسے بہلانے لگے اور ان بہلاؤں میں تو وہ اتنا بڑا اقدام کر بیٹھی تھی۔

نوید بھیا آجائے گا۔ پھر ماں کے سارے دکھ ختم ہو جائیں گے۔ وہ ماں کو نوید کی شکل میں بہت بڑا انعام دینا چاہتی تھی۔ پھر تارا کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"امی یہ نوید بھیا کو رہا کروائینگے۔ امی ہمارا کوئی مددگار نہ تھا۔ کوئی سہارا نہ تھا۔ جب ہی تو جب ہی تو امی —" وہ رک گئی۔

لیکن تارا کو اب کسی کی پروا نہ تھی۔ نہ چاندنی کی اور نہ ہی نوید کی اب وہ کسی اور امید کو دل میں ہرگز جگہ نہ دینا چاہتی۔ اُسے اس وقت چاندنی سے بھی شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی — چاندنی کی والہانہ تڑپ اور آنسو بھی اس کے دل میں کوئی حس پیدا نہ کر رہے تھے — چاندنی اور علی احمد کی موجودگی اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ جا چاندنی اب یہ جھونپڑا تیرے قابل نہ رہا۔ تو محلوں کی رانی بن بیٹھی — جا نکل جا اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے —— میری نظروں سے دور ہو جا چاندنی —

لیکن چاندنی نے ذرا سی بھی جنبش نہ کی۔ ماں کی ٹانگوں پر سر رکھے رہی۔

"چاندنی اگر تو میری نظروں کے سامنے رہی تو — پھر میں اپنا سر دیواروں سے ٹکرا کر جان دے دونگی — تاکہ میری آنکھیں تجھے نہ دیکھنے کے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں" — اس نے پلنگ کی پٹی سے اپنا سر بری طرح ٹکرانا شروع کر دیا — چاندنی اُسے روکنے کو آگے بڑھی تو پھر اس کے ہاتھ جھٹک ڈالے

"اس گھر میں تیرا وجود میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے چاندنی۔ جا دفعہ

ہو جا ئے" تارا بری طرح چیخ رہی تھی۔ کسی طرح اس کی حالت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔

اور علی احمد نے مصلحت اس میں جانی کہ چاندنی کو اس وقت وہاں سے لے ہی جائیں شاید چاندنی کی جدائی محسوس کر کے ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ ہی سوچ کر وہ آگے بڑے۔ "چلو چاندنی اس وقت ماں کو اکیلا ہی رہنے دو"۔

"نہیں ــ" چاندنی بھی ماں کی طرح ضدی تھی ــ تڑپ کر علی احمد سے دور ہو ہو گئی ـــ "اپنی امی کو اس حالت میں چھوڑ کر میں ہرگز نہیں جاؤں گی"

"چاندنی ــ تمہاری جدائی کے احساس سے ہی یہ خود پر قابو پا سکتی ہیں۔ اس وقت تم ان کو تنہا ہی چھوڑ دو ـــ صبح تک ان کا غصہ اتر جائے گا۔ پھر ہم آکر انہیں منا لیں گے۔ لیکن چاندنی کسی طرح ماں کو چھوڑ کر علی احمد کے ہمراہ جانے پر آمادہ نہیں تھی مستقل نہیں نہیں کی گردان کرتی رہی۔

لیکن علی احمد بھی اُسے بمشکل کھینچ کر اپنی کار میں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے! اندھیرے نے اس وقت چاندنی کی حالت محلے والوں سے پوشیدہ رکھی تھی۔ ورنہ پل بھر میں ایک نئی داستان جنم لے لیتی۔

چاندنی ــ علی احمد کے ساتھ کسی طرح جانے پر آمادہ نہیں تھی۔

کار میں سے واپس نکلنے کی کوشش کرنے لگی ــ لیکن علی احمد نے دروازہ لاک کر دیا۔ وہ کار میں مقید ہو گئی۔ علی احمد اس وقت چاندنی کو بے حد ظالم اور ہوس پرست لگے۔ لیکن علی احمد کو اب یہ حق حاصل تھا۔ کہ اس پر جبر کر کے جہاں جی چاہے اُسے لے جا سکیں۔ وہ ان کی مذہبی اور قانونی بیوی بن چکی ـــ چند لوگوں کی موجودگی میں ان دونوں کا باقاعدہ نکاح ہوا تھا ـــ

علی احمد نے کار چلا دی — کار اندھیری گلی سے نکل کر روشن سڑک پر آ گئی۔ اور چاندنی کو محسوس ہونے لگا — کہ وہ اپنی ماں کو اس اندھیرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئی۔ وہ اپنے سرخ دوپٹے میں منہ چھپا کر کچھ اور زور شور سے رونے لگی۔

چاندنی اُسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ ایک اجنبی انسان اچانک اس کا سب کچھ بن کر اس سے اس کی بیٹی کو چھین کر لے گیا تھا۔ چاندنی کے جانے کے کافی دیر بعد تارا اپنے ہوشوں میں آئی۔ دماغ کچھ ٹھکانے آیا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کانوں سے سن کر بھی اُسے یہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ بھولی بھالی چاندنی اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ محبت اور دولت کی خاطر۔ اپنی ناتواں کمزور اور بالکل تنہا ماں کے دل کو بری طرح گھائل کر کے جا سکتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت تھی اس کی بیٹی نے یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیا تھا۔ آج وہ بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

تارا کو عمر بھر کسی کا ساتھ راس نہیں آیا تھا۔ شادی کے بعد۔ شوہر بس دو قدم ساتھ چلا اور منہ موڑ گیا۔ ماں باپ کو بھی اللہ میاں نے لے لیا۔ لیکن اولاد جس سے اس نے ساری امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس کے ساتھ کس طرح بے وفائی کر گئی تھی۔ نوید نے ساتھ چھوڑا۔ پھر جیل چلا گیا۔ وہ صرف چاندنی کے لئے جینے لگی۔ جوان بیٹی کو دنیا کے منجدھار میں کس طرح اکیلی چھوڑ جاتی۔ ورنہ وہ جس گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ہی ختم کر لیتی۔ لیکن۔

اب تو وہ صرف چاندنی کے لئے زندہ تھی۔ لیکن چاندنی نے سب میں بڑا دکھ دیا تھا اُسے کہ تارا اب کسی کو صورت دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔ جو لڑکیاں گھروں سے بھاگ کر شادیاں کرتی ہیں۔ وہ کبھی دلی سکون نہیں پا سکتیں۔ وہ شوہر کے دل میں گھر نہیں کر سکتی اس کی چاندنی نے بھی یہ کیا تھا۔ کیا علی احمد اُسے اس طرح دل میں بٹھا کر رکھے گا۔ جیسا اب ظاہر کر رہا ہے۔ اور پھر مردوں کا کیا بھروسہ۔ دل تو ہر اچھی چیز پر آ ہی جاتا ہے۔ وہ تو پہلے سے ایک اور بیوی رکھتا تھا۔
تارا کو عجیب خیالات پریشان کرنے لگے۔

لیکن دل اب کوئی اور غم اٹھانے کے قابل نہ تھا۔

اُسے طرح طرح کے خوف اپنی گرفت میں لینے لگے۔ وہ غموں کے گرداب میں تو ہمیشہ الجھی ہوئی تھی۔ لیکن ان کا حصار اب تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دم آپ ہی آپ گھٹنے لگا۔ دنیا والے تم سے پوچھیں گے تمہاری چاندنی کہاں گئی۔ تمہارے پاس کیا جواب ہوگا۔

تم کیا ان کو بتا سکو گی۔ چاندنی ڈوب گئی۔ رات کی تاریکی نے اُسے اپنے پروں میں چھپا لیا۔ تم کس طرح بتاؤ گی اس کا بیاہ ہو گیا۔

کیا لڑکیوں کی شادیاں۔ اس خاموشی سے ہو جاتی ہیں۔

جیسے چاندنی کی ہوئی تھی۔ نہیں لوگوں کے پوچھنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں اس دنیا والوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ جاؤں گی۔ اس زبان کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہی ہونا چاہیئے تاکہ دنیا والوں کے سوال کا جواب نہ دے سکے۔ ان آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے بند ہونا چاہیئے۔ تاکہ چاندنی کی بربادی کا تماشہ

نہ دیکھ سکیں۔

لیکن کس طرح — ؟ — کس طرح — ؟ — یہ سوال ذہن میں ابھرنے لگا۔ اُسے تو مرنا بھی نہیں آتا تھا۔ ورنہ اس وقت کیوں نہ مرجاتی۔ جب فرید مرا تھا۔ نوید جیل گیا تھا۔ دنیا نے قدم قدم پہ زخم دیئے تھے۔ اُسے زندگی سے چاہت تھی شاید جب ہی تو جئے جا رہی تھی۔ لیکن اب وہ سنجیدگی سے مرنے —— کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ اور پھر بہت کچھ سوچ کر مطمئن ضرور ہوگئی۔ لیکن آنکھوں سے آنسو نہ تھمے۔

زندگی کی وہ آخری رات دبے پاؤں گذرنے لگی — یہ رات تارا جاگ کر گذار دینا چاہتی تھی — پھر اس کے بعد اُسے سو جانا تھا۔ گہری اور ابدی نیند آج کتنے چہرے اُس کی نظروں میں ابھر رہے تھے — فرید کا چہرہ — ابھرا تو وہ اس سے ہم کلام ہوگئی — فرید چاندنی تو تمہارا ارمان تھی۔ لیکن وہ کیا اس لئے اس دنیا میں آئی تھی۔ کہ ماں کی موت کی ذمہ دار بن سکے۔ پھر ابا یاد آئے اماں یاد آئیں وہ خود اب ان کی دنیا میں جانے والی تھی — پھر اس دنیا کا ایک باسی پوری طرح اس پہ چھا گیا۔ وہ شہید کا چہرہ تھا۔ اس کی یادیں تھیں اس کی باتیں تھیں۔

کاش یہ دل اُس کی بات مان جاتا — مان جاتا — پھر زندگی یوں طرح تو برباد نہ ہوتی — اس کے دل کو شہید کے ٹھکرانے پر ہزار
چکا تھا۔ اور اب بھی ہو رہا تھا — لیکن گیا وقت واپس نہیں آتا — و —
گذر گیا تھا۔

اس طرح صبح ہوگئی — تارا کی جاگی آنکھیں بند ہونے لگی۔ وہ بستر سے

اٹھ بیٹھی — رات کے سوئے احساسات بیدار ہو گئے — آج گھر میں چاندنی نہ تھی۔ وہ تو کسی اور کی آغوش آباد کر چکی تھی — پھر اس ویران گھر میں کس طرح نظر آتی — چاندنی — چاندنی — اب اُس کا دل بری طرح اُسے پکارنے لگا۔ لیکن دل کی اس ہلچل کو دباتی ہوئی اٹھی۔ اس نے اپنے سراپے پر ایک نظر ڈالی میلا کچیلا لباس بکھرے بال جھریوں بھرا چہرہ آدھے سفید بال۔ یہ تھا اب اس کا حلیہ۔ کب سے اس نے اچھا پہننا چھوڑ رکھا ہے۔

لیکن آج اس کا دل بننے سنورنے کو چاہ رہا تھا۔ اب وہ صحیح دماغ نہ رہی تھی۔ چاندنی کے صدمے نے اُس کا دماغ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے کپڑے کا صندوق کھولا — سارے کپڑے بیکار سے لگے۔ لیکن نیچے تہہ میں چھپا ڈبہ اپنے اندر اب بھی گلابی ساڑھی چھپائے ہوئے تھا۔ وہ ہی ساڑھی جو شہید برسوں پہلے عید پر اس کے لئے لایا تھا — وہ ساڑھی اب بھی پہلے سی آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھی — حالانکہ اتنے عرصے میں تارا بالکل بوڑھی ہو گئی تھی۔ اب شوخ رنگ پہننے کی اس کی عمر نہ رہی تھی۔

لیکن آج سب کچھ وہ ہی کرنا چاہتی تھی جو اُس کا دل کہہ رہا تھا اس نے وہ گلابی ساڑھی پہن لی۔ جو اس کے سوکھے جسم اور مرجھائی رنگت پر بالکل بھی نہ جچ رہی تھی — اور پھر اُس کا دل یہ ساڑھی پہن کر خوش تھا۔

ایک خواب کی سی کیفیت میں ڈوبی وہ گھر کو تالا ڈال کر باہر نکلی تو محلے کے گھر کی ہر آنکھ نے حیرت سے تارا کو جھانکا۔ جو جھل مل کرتی ساڑھی پہنے لرزتے قدموں سے نہ جانے کہاں جا رہی تھی — وہ کہاں جا رہی تھی اس کی خبر تو اس کے

دل کو بھی نہ تھی — پھر اُسے ایک خالی رکشہ مل گیا۔ اس کی مٹھی میں اس وقت پچاس کا نوٹ دبا ہوا تھا۔ وہ گھر سے نکلتے وقت مٹھی میں دبا لائی تھی۔ رکشہ میں بیٹھ کر اس نے اس اسپتال کا پتہ بتایا۔ جہاں پہلے شہید کام کرتا تھا — وہ اُس امید کو لے کر کہ شاید شہید آچکا ہو۔ آج نہ جانے کیوں آخری بار اس سے ملنے جا رہی تھی کیوں جا رہی تھی — یہ خود اُسے ہوش نہ تھا۔

اسپتال کے گیٹ پر رکشہ والے نے اُسے اتار دیا۔ اس نے ہاتھ میں دبا پچاس کا نوٹ اُسے تھما دیا۔ صبح کا وقت تھا رکشے والے کے پاس اتنے بڑے نوٹ کا کھلا نہ تھا۔ جھنجھلانے لگا۔ تم پورا ہی رکھ لو — تارا نے اُسے پورا نوٹ بخش ڈالا۔ وہ اس عورت کی شاہ دلی پر حیران رہ گیا۔ اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھنے لگی — شہید غیر ممالک کے دورے سے واپس آچکا تھا۔ اور اس سے ملنے کی آخری خواہش تارا کو پوری ہوتی نظر آئی — حسبِ معمول اسپتال میں بے حد رش تھا۔ تارا اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ پھر اُس کی باری بھی آگئی — وہ ہارے ہوئے حوصلے کے ساتھ کانپتے قدم اٹھاتی اندر کمرے میں پہنچ گئی۔ شہید نظریں جھکائے کاغذ پر کچھ لکھ رہا۔ مریض کی آہٹ محسوس کر کے اُس نے سر جھکائے جھکائے اُسے اپنے برابر کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ لیکن تارا بیٹھی نہیں۔ ساکت و جامد کھڑی شہید کو تکتی رہی — شہید نظریں اٹھا کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور پھر اس کی اٹھی ہوئی نظریں اس جانے پہچانے چہرے پر جم گئیں۔ جس کو سالوں کی گردش نے بے حد بگاڑ دیا تھا۔ اور شہید وہ تو اب بھی پہلے جیسا لگ رہا تھا۔ بلکہ اس سے زیادہ اچھا۔

م — شہید تارا کو دیکھ کر سخت حیران ہوا۔
عجیب سی حالت میں نظر آ رہی تھی — چہرے سے برسوں کی بیمار لگ
ن۔ اس کے سراپے پر نظر ڈال کر شہید چونکا۔ اس نے کتنے تیز رنگ کی ریشمی
ساڑھی رکھی تھی یہ ساڑھی کبھی اس نے خریدی تھی۔ شہید کو یہ یاد بھی نہ رہا تھا۔

"آؤ تارا — یہاں بیٹھ جاؤ — تم بہت بیمار لگ رہی ہو" شہید نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنے قریب کی کرسی پہ بٹھا لیا۔ وہ ساکت مجسمے کے مانند اس کرسی پر جم گئی۔

"تم کب سے بیمار ہو" — شہید ڈاکٹر تھا۔ اس لیئے اس کی بیماری کا پوچھ رہا تھا — "میں تو برسوں سے بیمار ہوں شہید" اس کی زبان بول اٹھی۔

"وہ تو تمہاری حالت سے ظاہر ہے" شہید نے اس کی نبض چھوتے ہوئے کہا۔ رات بھر ایک آگ میں جلی تھی۔ اس کے اثر سے اب اُس کا جسم جل اٹھا تھا۔ تارا کو اس وقت شدید بخار تھا — شہید کو اس کی گرتی حالت پر بے حد دکھ ہونے لگا

"تم نے عمر بھر خود پہ ظلم کر کے تارا اپنی کیا حالت بنالی" — شکوہ اس کے لبوں پر آگیا۔

"مجھ پر ظلم قدرت نے کیا شہید — اس دنیا والوں نے کیا۔ میری اولاد نے کیا" تارا کے لب ہلنے لگے۔ شہید کے سامنے وہ دل کا درد انڈیلنے لگی — اُسے بتانے لگی۔ بعد کی کہانی۔ جس سے شہید لاعلم تھا۔ میرا نوید تین سال سے جیل میں ہے اس کی سزا کے ابھی بہت سے اذیت ناک سال باقی ہیں — اور چاندنی وہ بھی ڈوب گئی —

اس نے میری مرضی کے خلاف چھپ کر ایک بوڑھے دولت مند سے شادی کر لی۔ جو پہلے سے بیوی بچوں والا تھا — اور اب سب کچھ کھو کر میں خالی ہاتھ صرف چند سانسوں کے سہارے جی رہی ہوں"۔

تارا کی کہانی بے حد دردناک تھی۔ شہید کا دل خوراً ان منٹ غم کے احساس سے بھر گیا تھا۔ یہ وہ ہی تارا تھی۔ جس کی اُس کے دل نے شدید تمنا کی تھی۔ لیکن تارا نے اُسے جنون اور ضد میں آکر ٹھکرا دیا تھا۔ کتنے دنوں وہ بھی کتنا ویران رہا تھا — دل کو سنبھالتا رہا تھا۔ دوسری محبت کو ہار کر وہ پہلی محبت کے بعد کی طرح ملک چھوڑ گیا تھا۔ اور پھر اس نے مغرب کی نیلی کانچ والی آنکھوں جگمگ کرتے سنہرے بالوں والی لڑکی سے دنیا بسالی تھی۔ اس نے شادی کر لی۔ مشرق کی عورت کی بے وفائی کے بعد مغرب کی بے وفا عورت کو جیون ساتھی بنا لیا تھا۔ لیکن اب وہ خوش تھا۔ اس کی بیوی گھریلو بیوی تھی اس نے مغرب کا لبادہ اتار کر مشرق کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنی اس بیوی کے ساتھ ہر محفل میں شریک ہوتا — اب وہ دو بچوں کا باپ تھا۔

پہلے کی باتیں اُسے اب عجیب سی لگتی تھیں۔ نوعمری میں صرف عشق کی خاطر اس نے زندگی کے کتنے سال بے سکون کئے تھے۔ اور پھر کتنے عرصے تارا سے سر ٹکرا کر اپنے دل میں دکھوں کے بسیرے پھیلا رکھے تھے — لیکن اب وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

لیکن آج تارا اُسے سب کچھ یاد دلانے آگئی تھی۔ تارا سے دل کا اب بھی رشتہ بندھا تھا — وہ مرحوم بھائی کی بیوی تھی۔ اس کے بچوں سے اُس،

کا خونی رشتہ تھا — آج اس گھر کی بربادی کا حال سن کر وہ حد درجے دلگیر ہو گیا۔

"تارا قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ میرے پاس تمہاری تسلی کے لئے الفاظ نہیں۔ لیکن تارا — تم کو اب بھی سنبھلنا پڑے گا۔ اس دنیا میں جینے کی خاطر —"

اوہ — تارا کے لبوں پر ہلکی سی طنزیہ مسکان ابھری — میں جینا نہیں چاہتی — شہید بھیا — مجھے زندگی کے اس عذاب سے نجات دلا دو — کوئی زہر دے دو۔ تاکہ مجھے سکون آجائے — میں صرف موت کی تمنا لے کر تمہارے پاس آئی تھی"۔

"تارا کے ان جملوں پر شہید کا دل رو پڑا — "نہیں تارا — میں تم کو مرنے نہیں دوں گا۔ تم جیو گی تارا — تمہارے نوید کو میں رہا کرواؤں گا۔ چاندنی کو بھی میں تمہارے پاس لے آؤں گا —" وہ اُسے پھر جینے کی طرف راغب کرنے لگا۔ لیکن اب تو تارا کسی کی باتوں کے پھیر میں نہ آنا چاہتی تھی۔ بے بسی سے شہید کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

شہید نے اس کو اپنی خوش حال زندگی کی جھلک نہ دکھائی — پھر تارا اس پوزیشن میں نظر نہ آتی تھی — کہ اُس کو وہ کچھ بتاتا — باہر ابھی اور مریض موجود تھے۔ سب کو دیکھنا اس کی ذمہ داری تھی — تارا کب سے اس کے پاس تھی

تارا تم گھر جاؤ — میں یہاں سے نمٹ کر تمہارے پاس آؤں گا۔

دوائیں وغیرہ لے کر تمہارا علاج مجھے ہی کرنا ہے۔ کیا حالت بنائی ہے

تم نے "۔ وہ اس سے بڑے پیار سے مخاطب تھا " مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں " تارا نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات ٹھکرا دی " تم اب بھی ویسی ضدی ہو تارا! " شہید نے اٹھتے ہوئے کہا ۔

" آؤ چلو میرا ڈرائیور تم کو تمہارے گھر چھوڑ آئے گا " ۔ وہ شہید کے کہنے پر کرسی سے اٹھ گئی ۔ پھر اپنے لباس پر نظر ڈال کر وہ شہید سے کہنے لگی ۔

" شہید یہ ساڑھی تم ہی کبھی میرے لئے لائے تھے۔ اور آج کتنے برسوں بعد میں نے اُسے پہلی دفعہ پہنا ہے " ۔

" آہاں " ۔ شہید چونک کر اُسے دیکھنے لگا ۔ وہ ساڑھی اس پر بالکل نہیں سج رہی تھی ۔ وہ یہ آج کیوں پہن کر آئی تھی ۔ شہید کے مصروف ذہن نے اس وقت اتنا نہ سوچا ۔ وہ اس کے ساتھ تک باہر آیا ۔ باہر اس کی کار اور ڈرائیور دونوں موجود تھے۔ شہید نے ڈرائیور کو اُسے گھر پہنچانے کی ہدایت کی " جاؤ تارا تم گھر چلی جاؤ ۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر تمہارے پاس آؤں گا ۔

وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی ۔ آنسوؤں سے ڈوبی آنکھوں سے اُس نے شہید کو دیکھا ۔ وہ واپس مڑ چکا تھا ۔

ڈرائیور کار گیٹ سے باہر نکال کر لے گیا " سنو " ۔ وہ اچانک ڈرائیور سے مخاطب ہوئی " مجھے ساحل سمندر پر لے چلو " ۔ ڈرائیور اس کی اس فرمائش پر حیران ضرور ہوا ۔ اس بھری دھوپ میں تنہا عورت وہاں کیوں جانا چاہتی تھی ۔ بلکہ وہ اس کے مالک کی جان پہچان کی تھی ۔ اس کا حکم کس طرح ٹالتا ۔ کار اس نے سمندر کی طرف دوڑا دی ۔ ساحل سمندر آگیا ۔

اس وقت وہاں مکمل سکوت اور سناٹا تھا۔ ایسی جگہوں پر تو شام یا پھر چھٹی کے دن رونق ہوتی ہے۔ اور آج چھٹی کا دن نہ تھا۔ ریسٹورنٹ بھی بند پڑا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا نشان نہ تھا۔ ہوا بے حد گرم تھی۔ دور تک تپتی ریت تھی۔ تارا کار سے اتر گئی۔ فرفر کرتی ہوا ۔ نے اس کا پلو لہرانا شروع کر دیا۔ بکھرے بال اور بکھرنے لگے۔ اُسے اس دن کی یاد آنے لگی جب وہ فرید کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس دن اُس نے گلابی سوٹ پہن رکھا تھا۔ آج بھی وہ گلابی ساڑھی پہن کر آئی تھی۔ یہ بھی محض ایک اتفاق ہی تھا۔ کار سے اتر کر اس نے ڈرائیور کو واپس جانے کا حکم دے دیا۔ لیکن وہ حیران پریشان تھا۔" آپ کو تنہا چھوڑ کر۔ ؟"

"ہاں ہاں ۔ بس تم جاؤ۔" تارا نے اُسے ڈانٹ کر کہا ۔

"لیکن آپ ۔ آپ کس طرح جائیں گی۔" اُسے اس بات کی فکر ہوئی ۔

"تم کو میں نے جانے کے لئے کہا ہے۔ تم جاؤ۔" تارا نے سخت غصے میں کہا۔ وہ ڈر سا گیا۔ پھر وہ ملازم تھا۔ کس طرح حکم ٹالتا۔ لیکن اُسے تارا پاگل لگ رہی تھی۔ اس پر تعجب کرتا ہوا ۔ وہ بے دلی سے کار میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

اور تارا سمندر کی طرف چل پڑی۔ ایک ہلچل سی دل و دماغ میں لئے۔ ایک عجیب سی پیاس لئے وہ ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساحل عبور کر کے وہ سمندر میں پہنچ گئی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی اس کے قدموں تلے بہنے لگا۔ آج اُس پر صرف مرنے کی دھن سوار تھی۔ اور موت اب اس کے قریب تھی۔ آج غموں کے بوجھ اور الجھی الجھی سانسوں کو وہ سمندر کی نذر کرنے آئی تھی۔ وہ آگے

بڑھتی گئی۔ پانی اس کی کمر تک آگیا۔ بڑی بڑی طوفانی لہریں اُس سے گلے ملنے کو بیقرار دوڑی چلی آ رہی تھی۔

اور پھر اس کا کمزور سا وجود ان لہروں میں سما گیا۔ وہ اس وسیع سمندر میں ڈوب گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ دنیا کے غموں سے اُسے نجات مل گئی۔

شہید کا ڈرائیور تارا کے حکم پر ــــ کار بیک کر لے آگے تو لے گیا لیکن اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ وہ سڑک سے کار پھر واپس لے آیا ــ اس نے دیکھا وہ گلابی ساڑھی والی عورت پانی کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور اس کے خطرناک ارادے کو محسوس کر کے اس کے پیچھے دوڑا "بیگم صاحب۔ بی بی جی" ۔ وہ تارا کو مستقل پکار بھی رہا تھا۔ لیکن اُس کو مدد کو پہنچتے پہنچتے۔ تارا سمندر کی نذر ہو چکی تھی۔ اُس کو اپنے میں سمو کر لہریں پھر اُس طرح بھاگتی دوڑتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ شور مچانے لگا۔ لیکن اس وقت اس کی دہاں آواز سننے والا بھی کوئی نہ تھا۔ پھر وہ کار کی طرف دوڑا ــ کار فل اسپیڈ پر سڑک پر دوڑاتے ہوئے ــ وہ شہید کو خبر سنانے چل دیا۔ ڈرائیور تین برس سے شہید کی ملازمت کر رہا تھا۔ لیکن آج اُس نے پہلی دفعہ تارا کو دیکھا تھا۔ وہ کون تھی۔ شہید سے اس کا کیا رشتہ تھا اُسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ جب وہ اسپتال پہنچا تو شہید باہر اس کا منتظر تھا۔ مریضوں کو دیکھنے کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اُسے تارا سے کیا وعدہ یاد تھا۔ وہ گھر جانے کی بجائے پہلے تارا کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اُسے ڈرائیور پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ جس نے نہ جانے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ ڈرائیور آیا تو وہ سخت بدحواس تھا۔ "ڈاکٹر صاحب وہ عورت سمندر میں ڈوب گئی۔ اس نے

خودکشی کرلی ۔"

بدحواسی کے عالم میں اس کے منہ سے پوری بات بھی نہیں نکل رہی تھی ۔

شہید یہ خبر سن کر صدمے سے پاگل ہونے لگا ۔ "تم اسے وہاں لے کر کیوں گئے تھے؟" وہ ڈرائیور پر برس پڑا ۔ "میں ان کا حکم کس طرح ٹالتا۔" ڈرائیور بے قصور تھا ۔

"وہ مرگئی ۔ تارا مرگئی" شہید کا دل اُس سے چیخ چیخ کر کہنے لگا ۔ وہ ایک انہونی سی امید لے کر ڈرائیور کے ہمراہ پھر ساحل سمندر پر آگیا ۔ اتنے بڑے سمندر کے آگے بھلا تارا کا نازک وجود کیا حیثیت رکھتا ۔ دکھوں کے گرداب سے نکل کر وہ سمندر کے کسی بھنور میں جا چھپی تھی ۔ تارا کی تلاش میں شہید نے سمندر کا کونا کونا چھنوا ڈالا ۔ دوپہر سے رات اور رات سے سحر ہوگئی ۔ اس کا بے جان وجود نہ ملا ۔ وہ دنیا کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپ چکی تھی ۔

شہید کی ترسی آنکھیں اُس کا آخری دیدار بھی نہ کرسکیں ۔ اتنا بڑا سمندر ہی تارا کی آخری نشانی بن چکا تھا ۔ وہ ہی خونی سمندر جس نے فرید کی زندگی کو چھین کر کتنی زندگیوں کا شیرازہ بکھیر دیا تھا ۔ وہی سمندر ....

آج تارا کی آخری پناہ گاہ بن کر دکھوں کی داستان کا خاتمہ بھی کر گیا تھا ۔